هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا فَالتّٰلِیٰتِ ذِكْرًا اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ

الحمد للہ کہ کتاب

احمدیت

یعنی حقیقی اسلام

از افادات قلم

سیدنا حضرت امیر المومنین میرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز

جو

حضور انور نے تقریب کانفرنس مذاہب عالم لنڈن منعقدہ ماہ ستمبر ۱۹۲۴ء تحریر فرمائی

جسے

بکڈپو تالیف و اشاعت قادیان ضلع گورداسپور (پنجاب) نے شائع کیا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

خدا کے

فضل اور رحم

کے ساتھ

ھُوَ النَّاصِرُ

احمدیت

اصل اسلام

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ وَاِیَّاہُ نَدْعُوْٓا اَنْ یَّھْدِیَنَآ اِلَی الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِیْمِ۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔ اَللّٰھُمَّ یَارَبِّ اَلْھِمْنَا مَا یَکُوْنُ فِیْہِ رِضَاکَ وَارْزُقْنَا تَقْوٰکَ وَصَفِّ خَوَاطِرَنَا وَنَقِّ اَفْکَارَنَا وَجَرِّءْنَا عَلٰی مُقَابَلَۃِ الشَّرِّ وَدَوَاعِیْہِ وَشَجِّعْنَا عَلٰی مُخَالَفَۃِ الْخَنَّاسِ وَمَسَاعِیْہِ

اَمَّا بعد ہم اللہ تعالیٰ کا بے حد و انتہا شکر کرتے ہیں جس نے ہمیں ان

طاقتوں کے ساتھ پیدا کیا۔ جو ہمیں اعلیٰ سے اعلیٰ مقاماتِ ترقی تک پہونچا سکتی ہیں۔ پھر ہمیں علم و عرفان کے پَر دیئے۔ جن کی مدد سے ہم آسمانِ رُوحانی تک اُڑ کر پہونچ سکتے ہیں۔ جس نے ہماری کمزوریوں اور کوتاہیوں کو دیکھکر روحانی علاج کے اسرار ہمارے لئے کھولے۔ اور اپنے پاس سے علم روحانی کے طبیب ہمارے علاج کے لئے بھیجے جنھوں نے بیماریوں کا علاج کیا۔ اور ہماری طاقت اور قوت کے بڑھانے کی تدابیر اختیار کیں۔ اور ہم خدا تعالےٰ کا شکر کرتے ہیں جس نے ہمارے دلوں میں اپنی محبت رکھی۔ اور اپنی ملاقات کی تڑپ پیدا کی۔ پھر اُس محبت سے ہماری طرف کھینچا گیا۔ اور اپنی ملاقات سے اس نے ہمیں مسرور کیا جس نے اپنے عشق کا جام ہمیں پلایا۔ اور اپنے وصل کے پیالے سے ہمیں سیراب کیا جس نے اس تاریکی کے زمانہ میں جبکہ رُوحانیت کے متلاشی اندھوں کی طرح مارے مارے پھرتے تھے۔ اپنے علم کا سورج چڑھایا۔ اور اپنے مامور اور مُرسل حضرت **احمد** علیہ السلام کو مشرقی زمین سے برپا کیا۔ اور اس کی نورانی کرنوں کے ذریعہ سے وساوس اور شکوک کی تاریکی کو پھاڑ دیا۔ پھر اس نے اپنی رحمت کے بادل برسائے۔ اور اپنے فضل کی ہوائیں چلائیں۔ اور ہر ایک خشک زمین کو سیراب کیا۔ اور روحانیت اور تقویٰ کی روئیدگی کو نکالا۔ تا دنیا ایک شاداب کھیت کی طرح ہو جائے۔ بعد اس کے کہ وُہ ایک خشک جنگل کی طرح تھی۔ اور لوگ زندگی اور خوشی کا سانس لیں۔ بعد اسکے کہ وہ مر چکے تھے اور مرجھا گئے تھے۔ ہم اس کے نبی **محمد** صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی درود بھیجتے ہیں۔ جس کے ذریعے سے وہ چشمہ پھوٹا جو کبھی خشک نہ ہوگا۔ اور وُہ علم کا دروازہ کھولا گیا جو تلاش کرنے والوں کے لئے کبھی بند نہ ہوگا۔ اور ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں۔ کہ وہ اپنے وعدوں کے مطابق دنیا کو راستی اور ہدایت کی طرف لائے۔ اور حق کے قبول کرنے کی اسکو توفیق دے۔ تا تمام دنیا میں امن اور صلح کا دَور دَورہ ہو۔ اور روزمرہ کے جھگڑے اور فساد دور ہوں۔ اور تا لوگ اس حقیقی راحت کو پالیں۔ جو بغیر خدا تعالیٰ سے ملنے کے کبھی نہیں مل سکتی۔ اللّٰھم آمین۔

اس کے بعد میں خوشی کا اظہار کرتا ہوں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس کلام کی

تائید میں جو اس نے تیرہ سو (۱۳۰۰) سال پہلے قرآن کریم میں نازل فرمایا تھا۔ بانیانِ ریلیجس کانفرنس کو اس جلسہ کے انعقاد کی توفیق عطا فرمائی۔ وہ کلام یہ ہے:۔

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا۔ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا۔ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ۔ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ﹰالْكَوَاكِبِ۔ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ؕ (سورہ صافات۔ ع ۱) یعنی میں اس امر کی شہادت کے طور پر کہ خدا کا دین ہی آخر غالب رہیگا۔ ان مجالس کو پیش کرتا ہوں۔ جہاں لوگ قطاروں میں بیٹھیں گے۔ اور اس جماعت کو پیش کرتا ہوں۔ جو انتظام کرے گی۔ اور کسی کو اپنے دائرہ عمل سے باہر نہیں جانے دیگی۔ اور ان لوگوں کو پیش کرتا ہوں جو اس وقت مذاہب کی خوبیوں پر مضمون پڑھینگے۔ ان سب کی کوششوں کا آخر یہی نتیجہ نکلے گا۔ کہ خدا ایک ہے۔ آسمانوں اور زمینوں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ سب کا ربّ۔ وہ مشرقوں کا بھی ویسا ہی ربّ ہے جس طرح مغربوں کا۔ اور یہ کہ ہم نے اس روحانی بلندی کو جو سب سے قریب کی ہے۔ ستاروں سے منور کیا ہے۔ اور ان کا یہ کام بھی مقرر کیا ہے۔ کہ وہ ہر ایک اُس شخص کے حملہ سے سچے دین کو بچائیں۔ جو لوگوں کو حق سے دور کرتا ہے۔ اور خدا کی اطاعت سے باہر نکل گیا ہے۔

اس کے بعد میں اس مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ جس پر بولنے کی مجھ سے خواہش کی گئی ہے۔ یعنی **احمدیت** لیکن پیشتر اس کے کہ میں اس کے مذہبی پہلو پر روشنی ڈالوں۔ میں احمدیت کی مختصر تاریخ اور اس کی موجودہ وسعت اور قوت کو بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ احمدیہ سلسلہ کی بنا حضرت مرزا غلام **احمد** علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ۱۸۹۰ء میں قریباً چھپن (۵۶) سال کی عمر میں رکھی۔ اور قادیان میں جو آپ کا وطن ہے۔ اور جو این۔ ڈبلیو۔ ریلوے کے سٹیشن بٹالہ سے گیارہ میل شمال مشرق پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس کا مرکز تجویز کیا۔ باوجود اس سخت مخالفت کے جو آپ کی تمام مذاہب ہندنے کی۔ اور اس غیر ہمدردانہ بلکہ بعض اوقات مخالفانہ رویّہ کے

جو گورنمنٹ نے آپ سے برتا۔ آپ کا سلسلہ تمام اکناف ہند میں بڑھنا شروع ہوا حتیٰ کہ آپ کی وفات کے وقت جو ۱۹۰۸ء میں ہوئی۔ احمدیہ جماعت کی تعداد کئی لاکھ تک پہونچ گئی تھی۔ اور یہ سلسلہ ہندوستان سے نکل کر عرب اور افغانستان میں بھی پھیل چکا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد سلسلہ کے امام حضرت استاذی المکرم مولوی نورالدین صاحب رضؓ منتخب ہوئے۔ اور آپ کی وفات پر جو ۱۹۱۴ء میں ہوئی۔ یہ عاجز جماعت کا امام منتخب ہوا۔ (ابتدائے اسلام کی طرح احمدیہ جماعت کا بھی ایک امام مقرر ہوتا ہے۔ جسے جماعت منتخب کرتی ہے۔ اور یہ ضروری نہیں۔ کہ وہ حضرت مسیح موعودؑ کی اولاد یا خاندان میں سے ہو۔ جیسے کہ حضرت خلیفۂ اولؓ کوئی حسبی یا نسبی تعلق حضرت مسیح موعود سے نہیں رکھتے تھے۔ اور نہ یہ ضروری ہے۔ کہ وہ آپ کے خاندان میں سے نہ ہو جیسا کہ یہ عاجز حضرت مسیح موعود کی فرزندی کی عزت رکھتا ہے) اس وقت یہ سلسلہ تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اور اس کے ممبروں کی تعداد پانچ لاکھ سے زیادہ ہے۔ جن میں سے بڑا حصہ ہندوستان اور اس کے قریب کے علاقوں میں ہے۔ اس مخالفت شدید کے سبب سے جو اس سلسلہ کے افراد سے کی جاتی ہے۔ بہت سے لوگ مخفی طور پر احمدی ہیں۔ لیکن ظاہر طور پر شامل نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ایسے لوگ ہندوؤں۔ سکھوں اور دوسرے مسلمان فرقوں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ہر قوم اور طبقہ کے لوگ شامل ہیں۔ اعلیٰ اقوام کے بھی اور نام نہاد ادنیٰ اقوام میں سے بھی۔ چنانچہ پچھلے دو سال کے عرصہ میں ان قوموں میں سے جن کو لوگ ادنیٰ سمجھتے ہیں۔ پنجاب اور یو۔ پی میں تین ہزار کے قریب آدمی اس سلسلہ میں داخل ہوئے ہیں۔ اور ہر مہینے میں یہ جماعت بڑھ رہی ہے۔ اسی طرح حیدر آباد کی ادنیٰ اقوام میں سے بھی پچھلے سال کے اندر کئی سو آدمی اس سلسلہ کی تربیت کے نیچے آیا ہے ملکی لحاظ سے جماعت احمدیہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں ہے۔ کوئی صوبہ ایسا نہیں ہے۔ کہ جہاں اس جماعت کے افراد نہ پائے جاتے ہوں۔ افغانستان کے

دونوں حصوں یعنی پشتو بولنے والے اور فارسی بولنے والے دونوں علاقوں میں جماعت موجود ہے۔ ہندوستان کے جنوب کی طرف سیلون۔ برما۔ ملایا۔ سٹریٹس سیٹلمنٹ میں بھی جماعت موجود ہے۔ سیلون سے دو اخبار بھی جماعت کے نکلتے ہیں۔ ایک ملایا میں اور ایک انگریزی میں چین میں تبلیغ کا سلسلہ باقاعدہ نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ ایک ترکی پارلیمنٹ کے ممبر کی ایک کتاب سے جو انہوں نے اپنی سیاحت کے متعلق لکھی ہے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہاں بھی جماعت ہے۔ گو اندرون ملک کی جماعت کا مرکز سے ابھی تک تعلق قائم نہیں ہوا۔ جزائر فلپائن اور سماٹرا کے کچھ لوگ بھی سلسلہ میں داخل ہو چکے ہیں۔ شمالی اور مغربی ایشیائی علاقوں میں سے ایران۔ بخارا۔ عراق ولایت۔ موصل۔ عرب اور شام میں جماعت احمدیہ پائی جاتی ہے۔ افریقہ کے علاقوں میں سے مصر۔ یوگنڈا۔ مشرقی افریقہ۔ زنجبار۔ جرمن مشرقی افریقہ۔ جزیرہ مارشس نٹال مراکش۔ الجزائر۔ سیرالیون۔ گولڈ کوسٹ۔ اور نائیجیریا میں جماعتیں قائم ہو چکی ہیں۔ اور جزیرہ مارشس۔ نائیجیریا اور گولڈ کوسٹ اور مصر میں باقاعدہ مشن بھی قائم ہیں۔ اور مارشس سے ایک اخبار سلسلہ کی تائید میں فرانسیسی زبان میں نکلتا ہے۔ یورپ کے علاقوں میں سے ابتک صرف انگلستان اور فرانس میں جماعت ہے۔ اور انگلستان میں مشن بھی دس سال سے قائم ہے۔ امریکہ میں صرف تین سال سے مشن قائم ہوا ہے۔ اور اس وقت یونائیٹڈ سٹیٹس میں ایک ہزار کے قریب آدمی سلسلہ میں داخل ہو چکا ہے۔ اسجگہ سے ایک سہ ماہی رسالہ بھی مشن کی طرف سے نکلتا ہے۔ یونائیٹڈ سٹیٹس کے علاوہ جزیرہ ٹرینیڈاڈ اور جنوبی امریکہ کی ریاستہائے برازیل اور کوسٹوریکا میں بھی جماعت ہے۔ جزائر میں سے آسٹریلیا اس نعمت عظمیٰ میں حصہ دار ہے۔ اور ہم اللہ تعالیٰ کے کلام کی بنا پر یقین رکھتے ہیں۔ کہ ابھی زیادہ دن نہیں گزرینگے۔ کہ سب دنیا اس نعمت سے حصہ لیگی۔

سلسلہ احمدیہ کے امتیازی مسائل

ہر ایک شخص کے دل میں طبعاً یہ سوال پیدا ہوگا۔ کہ اسقدر مذاہب اور

سلسلوں کی موجودگی میں سلسلہ احمدیہ کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟ لہٰذا میں مذہبی امور میں سے سب سے پہلے اس مسئلہ کو لیتا ہوں۔

ہر ایک شخص جو کسی الہامی مذہب سے تعلق رکھتا ہے اس امر پر بھی یقین رکھتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے وقتاً فوقتاً انبیاء آتے رہے ہیں۔ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والے لوگ نہ پائے جاتے ہوں۔ دنیا کی ترقی انہی لوگوں سے وابستہ ہے۔ اور ان لوگوں کو علیحدہ کر کے دنیا میں تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (سورہ فاطر رکوع ۳) کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں کوئی نبی نہ گذرا ہو۔ قدیم تاریخ کی ورق گردانی اور آثار قدیمہ کا تجسس ہمیں زیادہ سے زیادہ اس حقیقت کا معتقد بناتا جاتا ہے۔ اور یہ تحقیق بنی نوع انسان میں یگانگت پیدا کرنے کا بہت بڑا موجب ہو رہی ہے جس کا سہرا قرآن کریم کے سر ہے۔ جس نے اس حقیقت کو سب سے پہلے بیان کیا ہے۔ جب ہم ان انبیاء کی آمد کی غرض کو دیکھتے ہیں۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کی بعثت کا داعی ہمیشہ دنیا میں سے روحانیت کا مٹ جانا اور خدا تعالےٰ سے تعلق کا قطع ہو جانا رہا ہے یہ لوگ ہمیشہ اس بادل کی طرح آتے رہے ہیں۔ جو بارش کے ایک لمبے عرصہ تک بند رہنے کے بعد آتا ہے۔ اور دنیا کو سرسبز و شاداب کر دیتا ہے۔ یہ لوگ خدا تعالےٰ کا وہ جواب ہوتے ہیں جو متلاشی دنیا کی پکار کے نتیجہ میں آسمان سے بھیجا جاتا ہے۔ یا وہ نرسنگا ہوتے ہیں۔ جو شکار کا پیچھا کرنیوالے شکاریوں کو جب وہ جنگل میں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ اکٹھا کرنے کے لئے وہ شکاری بجاتا ہے جس کے سامنے شکار ہوتا ہے۔ دنیا ان کے ذریعہ سے پھر صداقت پر جمع ہوتی ہے اور منزل مقصود کی طرف قدم بڑھاتی ہے

یہ سلسلۂ نبوت جس طرح ہمیشہ سے چلا آیا ہے۔ ہمارے نزدیک اسی طرح آئندہ چلا جائیگا۔ اور کسی وقت بند نہ ہوگا۔ کیونکہ عقل انسانی اس سلسلہ کے بند ہونے کے خیال کو ردّ کرتی ہے۔ اگر دنیا میں تاریکی اور خدا تعالیٰ سے دُوری کے زمانے آتے رہیں گے۔ اور یہ سلسلہ بند نہ ہوگا۔ اگر وقتاً فوقتاً لوگ اصل راستہ کو چھوڑ کر گمراہی کے گھنے جنگلوں میں راستہ

کھوتے رہیں گے۔ اور سچے راستہ کی طرف پہنچنے کی خواہش ان کے دل میں پیدا ہوتی رہے گی۔ اور وہ ہدایت کی جستجو کرتے رہینگے۔ تو ایسے لوگوں کی آمد کا انقطاع بھی ناممکن ہے۔ کیونکہ یہ خدا تعالیٰ کی رحیمیت کی شان کے خلاف ہے۔ کہ وہ درد کو تو پیدا کرے۔ مگر علاج پیدا نہ کرے۔ تڑپ تو دے۔ مگر ملافات کے سامانوں کو مٹا دے۔ ایسا خیال اس سرچشمۂ رحم پر بدظنی ہے اور روحانی نابینائی کی علامت۔ اسی عام قاعدہ کے ماتحت ہم لوگ یقین رکھتے ہیں کہ اس وقت ایک ہادی اور رہنما کی ضرورت تھی۔ جو دنیا کو خدا تعالیٰ کا راستہ دکھائے اور شک اور شبہ کی زندگی سے نکال کر یقین اور وثوق کے مرتبہ تک پہونچائے۔ اے بھائیو! اگر دنیا کبھی کسی نبی کی محتاج تھی۔ تو وہ آج اس سے بڑھکر محتاج ہے۔ مذاہب کی جڑھ آج کھوکھلی ہو رہی ہے۔ اور دنیا میں تین ہی قسم کے لوگ نظر آتے ہیں۔ یا تو وہ جو مذہب کی ضرورت کو ہی خیر باد کہہ چکے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ کو یا کو تکلی جواب دیچکے ہیں۔ یا اُس پر ان کو ویسا ہی ایمان ہے۔ جیسا کہ پہاڑوں اور دریاؤں پر۔ کیونکہ اس کا وجود انکی روزمرہ کی زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ اگر وہ یہ فیصلہ کرلیں۔ کہ خدا تعالیٰ نہیں ہے۔ تو بھی ان کے اعمال میں کوئی تغیر واقع نہ ہو۔ اور اب جو وہ کہتے ہیں کہ خدا ہے۔ تو اب بھی اس کا اثر ان کے اعمال پر کچھ نہیں ہے۔ یہ لوگ یہانتک کہہ اٹھتے ہیں۔ کہ ہم اپنی حرّیت کو خدا تعالےٰ کے لئے بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ اور اپنے وقار کو خدا تعالیٰ کے سامنے دعا اور عاجزی کر کے صدمہ نہیں پہنچانا چاہتے۔ دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں۔ جو خدا تعالیٰ کے تو قائل ہیں۔ اور اس کی طاقتوں پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ لیکن وہ اس پیاسے کی طرح ہیں۔ جو ریگستان کے ٹیلوں کے درمیان راستہ بھول جاتا ہے۔ اور میلوں میل تک اُسے پانی کا ایک قطرہ نہیں ملتا جوں جوں وہ پانی کی تلاش کرتا ہے۔ اس کی پیاس اور بڑھتی جاتی ہے۔ اور اسکی گھبراہٹ ترقی کرتی جاتی ہے مگر اسکا پھرنا اور چکر لگانا اس کو نفع نہیں دیتا۔ وہ ایک سراب سے دوسرے سراب تک جاتا ہے۔ مگر ہر دفعہ اس کی مایوسی اسکی تکلیف کو اور بھی بڑھا دیتی ہے۔ وہ پانی کی جستجو میں پانی سے اور بھی دُور ہوتا جاتا ہے۔ اور آخر موت کے قریب پہونچ جاتا ہے۔

تیسرا گروہ وہ ہے۔ جو اپنی قسمت پر خوش ہے۔ اور اپنی حالت پر قانع ہے مگر

اس لئے نہیں کہ وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کی فطرت کے تقاضے پورے ہو چکے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ وہ ہمت ہار چکا ہے۔ اور خدا کے فضل سے مایوس ہو چکا ہے۔ اور یہ سمجھتا ہے۔ کہ خدا کے فضل پہلوں پر ختم ہو چکے ہیں۔ میں اس کے سوتیلے بیٹے کی طرح ہوں جسے وہ اپنے مال کا وارث نہیں قرار دیتا۔ اس لئے میرے لئے وہی کافی ہے۔ جو پہلوں کے دسترخوان سے اٹھا اور جو انکی مہربانی نے مجھ تک پہونچا دیا۔

مگر یہ تینوں حالتیں غیر طبعی ہیں۔ نہ پہلے گروہ کی بے اعتنائی اسکو فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ نہ دوسرے گروہ کی بیفائدہ جدوجہد اور نہ تیسرے گروہ کی قناعت۔ جو چیز فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ وُہ خدا کا عِرفان ہے۔ جو تمام تاریکیوں کو مٹا کر انسان اور خدا تعالیٰ کے درمیان سے سب پردے ہٹا دیتا ہے۔ اور بندے اور خدا کو ایک جگہ جمع کر دیتا ہے۔ اور مذہب کو ایسی صورتمیں انسان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ کہ اس کا دل اسے قبول کر لیتا ہے۔ اور اسکی عقل تسلی پا جاتی ہے۔ اور یہ بات نہ آجتک نبیوں کے بغیر دنیا کو حاصل ہوئی ہے۔ نہ آئندہ ہو سکتی ہے۔

اے بھائیو! ذرا غور تو کرو۔ کہ اس وقت کونسا مذہب ہے۔ جسکے متبع اس امر کے دعویدار ہوں۔ کہ انہوں نے وہ کچھ پا لیا جو پہلے نبیوں کے ذریعے سے دنیا کو ملا تھا؟ کیا یہ امر درست نہیں۔ کہ لوگ اس امر پر قانع ہیں۔ کہ انعامات پہلوں پر ہی ختم ہو چکے۔ یا مذہب کو ہی جواب دے چکے ہیں۔ یا یہ سمجھتے تو ہیں۔ کہ ان کو سب کچھ مل گیا؟ مگر ان کی مثال اس معمول کی طرح ہے۔ جو مسمریزم کے اثر کے نیچے بیسیوں غیر معقول امور کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن دوسرے دیکھنے والونکو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اگر یہ سچ ہے۔ اور ضرور سچ ہے۔ تو آج بھی دنیا کو اسی طرح ایک نبی کی ضرورت ہے۔ جس طرح کہ پہلے زمانوں میں تھی۔ اور اسی وجہ سے احمدی جماعت اس امر کی معتقد ہے۔ کہ نبوت کا دروازہ ہمیشہ سے کھلا ہے۔ اور کھلا رہیگا۔ اور یہ کہ موجودہ زمانہ نہایت زور سے ایک نبی کی ضرورت کی شہادت دے رہا ہے۔

مگر ہم لوگ اپنے عقیدہ کی بنا صرف زمانہ کی شہادت پر ہی نہیں رکھتے۔ بلکہ پہلے نبیوں کی شہادت پر بھی ہمارے عقیدہ کی بنیاد ہے۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ہر ایک مذہب کے

پیشواؤں نے ایک آنیوالے نبی کی بشارت دی ہے۔ جیسے ہندوؤں میں نہہ کلنک اوتار کی پیشگوئی ہے۔ جس کے وہ ابتک منتظر ہیں۔ مسیحیوں میں مسیح کی آمد ثانی کی۔ مسلمانوں میں مہدی اور مسیح موعود کی۔ زردشتیوں میں موسیودر بہمی کے آنیکی پیشگوئیاں ہیں۔ اگر آئندہ سلسلۂ نبوت دنیا سے بند ہو چکا ہوتا۔ تو یہ سب قومیں ایک آنیوالے کے متعلق کیوں متفق ہوتیں؟

پھر ایک اور عجیب بات ہے۔ جو ہم ان پیشگوئیوں میں دیکھتے ہیں۔ اور وُہ یہ ہے۔ کہ وہ علامات جو ان موعود نبیوں کے متعلق بیان کی گئی ہیں۔ ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ سب کی سب پیشگوئیوں میں اس زمانہ میں بدیوں کی کثرت بیماریوں کی زیادتی ستاروں کا ٹوٹنا۔ سورج اور چاند گرہن کا لگنا۔ اور لڑائیوں کا ہونا وغیرہ علامات بتائی گئی ہیں۔ اور کام بھی ان موعودوں کا ایک ہی بتایا گیا ہے۔ یعنی اسوقت انکے ذریعہ سے سب دنیا پر صداقت پھیل جائیگی اور مذہب حقہ کو غیر معمولی طور پر دوسرے دینوں پر غلبہ ملیگا۔ جو اس سے پہلے کبھی حاصل نہیں ہُوا۔

اب ایک طرف تو ان پیشگوئیوں کا اپنے وقت پر پورا ہو جانا بتاتا ہے۔ کہ یہ پیشگوئیاں جھوٹی نہیں ہیں۔ دوسری طرف ان موعودوں کا مقررہ کام اس امر کو ناممکن قرار دیتا ہے۔ کہ ایک ہی وقت میں اس قدر موعود اپنے اپنے مذہب کو سارے ادیان پر غالب کریں۔ پس لازماً یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ یہ سب پیشگوئیاں ایک ہی شخص کے متعلق ہیں۔ جو اس غرض کے لئے آئیگا۔ کہ اپنی قوتِ قدسیہ سے سب ادیان کو ایک جگہ جمع کر دے۔ اور سب قومیں اسکے ذریعے سے سچا راستہ دیکھیں۔

لیکن جہاں یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ سب پیشگوئیاں ایک ہی موعود کی خبر دے رہی ہیں۔ وہاں ان پیشگوئیوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس موعود کو ایسی خصوصیات بھی حاصل ہونگی۔ جن کے سبب سے تمام اقوام اس کو اپنا ہی سمجھیں گی۔ اس کو ہندوؤں سے بھی ایسا تعلق ہوگا۔ کہ وہ اسے اپنا نہہ کلنک اوتار قرار دے سکیں گے۔ اور فارسیوں سے بھی اسے ایسا تعلق ہوگا۔ کہ وہ اسے اپنا موسیودر بہمی سمجھ سکیں گے۔ اور مسلمانوں سے بھی اُسے ایسا تعلق ہوگا۔ کہ وہ اُسے اپنا مہدی کہہ سکیں گے۔ اور مسیحیوں سے بھی اسے ایسا

تعلق ہوگا۔ کہ وُہ اسے اپنا مسیح مان سکیں گے۔ اور یہ تعلق اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ کہ وُہ مختلف نسبتوں کے ذریعہ سے مختلف قوموں کی طرف منسوب ہو۔ مثلاً کسی قوم کے ساتھ اسے مذہبی تعلق ہو۔ کسی قوم کے ساتھ نسلی تعلق ہو۔ کسی قوم کے ساتھ ملکی تعلق ہو۔ اور کسی قوم کے ساتھ سیاسی اور تمدنی تعلق ہو۔ حتٰی کہ ہر قوم اس کو اپنا قرار دے سکے۔

ہم احمدی جماعت کے لوگوں کا یہ مذہب اور یہ عقیدہ ہے۔ کہ یہ سب باتیں حضرت مرزا **غلام احمد** علیہ السّلام بانیٔ **سلسلہ احمدیہ** میں جمع ہو جاتی ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے مفاسد کی اصلاح کے لئے مبعوث فرمایا ہے۔ آپ اپنے دعوٰی کے مطابق مسیحیوں کیلئے مسیح تھے۔ اور مسلمانوں کے لئے مہدی اور ہندوؤں کے لئے کرشن یا نہہ کلنک اوتار۔ اور زردشتیوں کے لئے موسیو دربہی۔ غرض کہ آپ ہر ایک قوم کے موعود نبی تھے۔ اور سب دنیا کو ایک مذہب پر جمع کرنے کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ آپ کے وجود میں اللہ تعالےٰ نے سب قوموں کی امیدوں اور آرزوؤں کو جمع کر دیا۔ آپ وُہ صلح کا گنبد تھے جس میں ہر ایک قوم آکر اپنے پیدا کرنیوالے کے آگے جھکی۔ اور وہ کھڑکی تھے جسمیں سے سب قوموں نے خدا کو دیکھا۔ اور وُہ نقطۂ مرکزی تھے جس پر دائرہ کے سب خط آکر جمع ہوئے۔ پس آپ کے ذریعہ سے دنیا کی صلح اور آشتی مقدر ہے۔ آپ ایرانی النسل ہونے کے سبب سے زردشتیوں کے موعود تھے۔ ہندوستانی ہونے کے سبب سے ہندوؤں کے موعود تھے مسلمان ہونیکے سبب سے مسلمانوں کے موعود تھے۔ اور مسیح کا نام پانے کے سبب سے اور ان تمدنی نقائص کا علاج لانیکے سبب سے جو مسیحی ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ اور جنکی وجہ سے مسیحی ممالک کی عام آبادی کی پیٹھ جھکی جاتی ہے۔ اور مسیحیوں کی حکومت میں پیدا ہونیکے سبب سے اور مسیح کی عزت کو ان حملوں کے بچانیکے سبب سے جو ہزاروں سال سے اس پر کئے جاتے تھے۔ مسیحیوں کے موعود کہلانیکے مستحق تھے۔ اور انہی چار قوموں پر بس نہیں۔ آپ دنیا کی ہر ایک قوم کی قدیم اخبار کو پورا کرنیوالے اور ساری دنیا کی امیدوں کو برلانیوالے تھے۔

وہ سب پیشگوئیاں جو پہلے نبیوں نے کی تھیں۔ آپ کے حق میں اور آپ کے ہاتھ پر پوری ہوئیں۔ اور اللہ تعالےٰ نے ان پیشگوئیوں کے پورا ہونے سے پہلے دوبارہ ان کے

وقوع کا وقت قریب آجانیکی آپ کو خبر دی۔ اور ثابت کر دیا۔ کہ آپ ہی ان پیشگوئیوں کے پورا ہونیکے مستحق تھے۔

کہا گیا تھا۔ کہ آنیوالا موعود مشرق سے ظاہر ہوگا چنانچہ آپ مشرق سے ظاہر ہوئے (متی ۲۴ آیت ۲۷) اور کہا گیا تھا۔ کہ مسیح کی آمد سے پہلے جھوٹے مسیح ظاہر ہونگے۔ (مرقس ۱۳-۲۲) سو ایسا ہی ہوا۔ کہ آپ کے دعوٰی سے پہلے کئی مسیحیت کے مدعی پیدا ہوئے جن میں سے بعض قریب تھا۔ کہ بہت سے سمجھداروں کو بھی گمراہ کر دیتے۔ لڑائیاں ہوئیں۔ طاعون پڑی قحط پڑے۔ مگر آخر وُہ علامت ظاہر ہوئی۔ جسے انجیل اور زردشتیوں کی کتاب جاماسپی نے تو ان عام الفاظ کو بیان کیا ہے۔ کہ سورج اور چاند اندھیرے ہو جائیں گے۔ مگر اسلامی کتب میں ان کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ یعنی بتایا گیا ہے۔ کہ رمضان کے مہینہ میں سورج کو اس کی گرہن کی تاریخوں میں سے دوسری کو اور چاند کو اس کی گرہن کی تاریخوں میں سے پہلی تاریخ کو مہدی کے زمانہ میں گرہن لگیگا۔ اور یہاں تک زور دیا گیا تھا۔ کہ یہ علامت مہدی سے پہلے کسی مدعی مہدویت کے لئے علامت مقرر نہیں کی گئی۔ (دار قطنی بروایت امام محمد باقرؒ) چنانچہ یہ نشان بھی پورا ہوا۔ اور اس نشان نے تمام مدعیانِ مسیحیت اور مہدویت کے مقابلہ میں آپ کے دعوے کو ممتاز کر کے دکھا دیا یہ گرہن ۱۸۹۴ء میں آپ کے دعوٰی کے چوتھے سال رمضان کے مہینہ میں عین انہی تاریخوں میں جو بتائی گئی تھیں۔ لگا۔ اور عجیب بات ہے۔ کہ گو کئی مدعی مہدویت اور مسیحیت کے پہلے گزرے ہیں۔ کسی کے زمانہ میں یہ نشان ظاہر نہیں ہوا۔

آپ کے زمانہ میں وہ غیر معمولی حالت بھی پیدا ہوئی۔ جو پہلی کتب میں بتائی گئی تھی۔ اور اس زمانہ سے پہلے کبھی دُنیا میں اس کا ظہور نہیں ہوا۔ یعنی کہا گیا تھا۔ کہ اس زمانہ میں اسقدر امن بھی ہوگا۔ کہ بچے سانپوں سے اور بکریاں بھیڑیوں سے بے خوف کھیلیں گی۔ لیکن لڑائیاں بھی بکثرت ہونگی۔ گویا امن اور جنگ ایک ہی وقت میں دنیا میں پائے جائینگے چنانچہ یہ بات نہایت ممتاز طور پر آجکل دنیا میں نظر آتی ہے۔ کہ ایک طرف تو حب الوطنی کے جذبات اسقدر ترقی پر ہیں۔ کہ ان کے اثر کے ماتحت تمام اقوام کا اندرونی انتظام

پہلے زمانوں کی عام حالت سے بدرجہا اچھا ہے۔ اور وہ جھگڑے اور لڑائیاں اور لوٹ مار جو پہلے زمانوں میں ملکوں میں ہوتی تھی۔ اب دنیا کے بیشتر حصہ سے مفقود ہے۔ مگر اس کے مقابلہ میں بین الاقوام تعلقات بالکل خراب ہیں۔ اور ہر قوم دوسری قوم سے خائف و ترسان ہے۔ اور قومی حسد اپنی انتہاء کو پہونچ گیا ہے۔

ان کے علاوہ مسلمانوں میں آنیوالے موعود کی نسبت نہایت تفصیل سے پیشگوئیاں موجود ہیں۔ وہ سب اپنے اپنے رنگ میں پوری ہو چکی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس موعود کی پیدائش کے زمانہ میں ایک نئی سواری ایجاد ہوگی جس کے سبب سے اونٹ ترک کر دیئے جائینگے۔ چنانچہ ریل ایجاد ہو چکی ہے۔ اور ایسی ایجاد ہوگی۔ کہ تمام دنیا کی خبر ایک آن میں سنی جاسکیگی چنانچہ تار ایجاد ہو چکی ہے۔ پھر لکھا تھا۔ اس وقت عورتیں زیادہ ہو جائینگی۔ اور تجارتی کاروبار میں سے چیزوں کے فروخت کرنیکا کام عورتوں کے سپرد ہوگا۔ اور عورتوں کے لباس ایسے ہونگے۔ کہ انکے جسم کا وہ حصہ جسے پہلے لوگ بھی خواہ وہ عورتوں کے پردہ کے قائل نہ تھے۔ پردہ کے قابل سمجھا کرتے تھے۔ ننگا نظر آئیگا۔ اور اس وقت تین بڑی حکومتیں تین بڑی حکومتوں سے لڑینگی اور تین جو فاتح ہوں گی قسطنطنیہ پر قبضہ کرلینگی۔ لیکن ایک شخص قسطنطنیہ سے بھاگ کر شام کی طرف چلا جائیگا۔ اور وہاں سے جنگ کر کے اپنے علاقہ کو واپس لے لیگا۔ اسیطرح لکھا تھا۔ کہ اس وقت نصاریٰ کو دیگر اقوام پر غلبہ ہوگا۔ اور ملکِ عرب دوسرے صوبوں سے الگ ہو جائیگا۔ اور عراق اور شام اور مصر کی حکومتیں الگ قائم ہو جائینگی۔ اور ایک قوم مہینوں کو چھوٹا کر دیگی۔ اسلامی شریعت کی مقرر کردہ حدود ترک کر دیجائیں گی۔ جوا کثرت سے پھیل جائیگا۔ پولیس کثرت سے مقرر ہوگی۔ عورتوں میں مردوں کے لباس کا رواج ہو جائیگا مزدوروں کی حکومت ہوگی۔ امراء غرباء کے لئے اپنے مالوں کی زکوٰۃ نکالنے کو بوجھ خیال کرینگے۔ اسلامی حکومتیں مٹ جائینگی۔ عرب کی دینی حالت بہت خراب ہو جائیگی۔ بے جان چیزیں بولیں گی جس سے فونوگراف وغیرہ کی ایجاد کی طرف اشارہ ہے۔ ایسی سواریاں دریافت ہوں گی۔ جو اس سے پہلے دنیا میں موجود نہ تھیں جس سے ہوائی جہاز وغیرہ کیطرف اشارہ ہے دو سمندروں کے درمیان کی ایک خشکی جسکے ایک طرف مونگا پایا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف

موتی۔ اسکو پھاڑ کر دونو سمندروں کو ملا دیا جائیگا۔ اور اس میں سے کثرت سے جہاز گزرینگے جو سویز اور پناما کی نہروں کی طرف صاف اشارہ ہے۔ پھر لکھا تھا۔ کہ اس وقت کتابیں اور اخبار کثرت سے شائع ہونگے۔ علوم ہیئت کے بہت سے انکشاف ہونگے۔ دریاؤں میں سے نہریں نکالی جائیں گی حتےٰ کہ اصل دریا قریباً خشک ہو جائیں گے۔ پہاڑوں کو اڑا دیا جائیگا۔ سفر کا رواج زیادہ ہو جائیگا۔ بعض ممالک کی اصل آبادی تباہ کر دیجائیگی۔ ستی وغیرہ کی قدیم رسوم قانوناً بند کر دیجائینگی۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب پیشگوئیاں اس زمانہ میں پوری ہو چکی ہیں۔

اسی طرح بتایا گیا تھا۔ کہ یہ موعود دو بیماریوں میں مبتلا ہوگا۔ ایک دھڑ کے اوپر کے حصہ سے تعلق رکھیگی۔ اور ایک نچلے دھڑ سے۔ اور یہ کہ اسکا رنگ گندم گون ہوگا۔ سر کے بال سیدھے ہونگے۔ اور یہ کہ اس کے کلام میں لکنت ہوگی۔ کسانوں کے خاندان میں سے ہوگا۔ اور وہ بات کرتے وقت ہاتھ کو ران پر مار یگا۔ اور کدعہ نامی گاؤں سے ظاہر ہوگا مسیحیت اور مہدویت کی دو شانوں کا جامع ہوگا۔ چنانچہ اسی طرح ہوا۔ آپ کو دورانِ سر اور ذیابیطس کی دو بیماریاں تھیں۔ رنگ گندم گوں اور بال سیدھے تھے۔ اور آپ کے کلام میں خفیف لکنت پائی جاتی تھی۔ اور بات کرتے وقت آپ کو ران پر ہاتھ مارنیکی عادت تھی۔ آپ کسانوں کے خاندان میں سے تھے۔ اور قادیان کے باشندے تھے۔ جسے عوام الناس کادی کے لفظ سے پکارتے ہیں۔ غرض جب سب پیشگوئیوں پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالیں۔ تو سوائے اس زمانہ کے اور کسی زمانہ پر اور سوائے آپ کے وجود کے اور کسی شخص پر وہ چسپاں نہیں ہوتیں۔ اور صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہی زمانہ اس موعود کے ظہور کا ہے جس کی خبر پہلے نبیوں نے دی تھی۔ اور آپ ہی وہ موعود ہیں۔ جن کی انتظار میں صدیوں سے لوگ بیٹھے تھے۔ اور جب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ان علامتوں میں سے بہت سی علامتوں کے پورا ہونے سے پہلے بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے بذریعہ خاص الہام کے ان کے پورا ہونیکی خبر دی تھی۔ جیسے طاعون کی آمد۔ یورپ کی جنگِ عظیم۔ زار روس کی معزولی اور روس سے آئندہ بادشاہت کا مٹ جانا۔ اور زار روس اور اس کے خاندان کی قابلِ رحم حالت۔ اور عالمگیر زلزلوں کا آنا۔

انفلوئنزا کا حملہ وغیرہ وغیرہ۔ تو ہمارا الیقین اور ایمان اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ اور ہم اس امر پر ایمان لانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور ہر شخص جو انصاف پسندی سے کام لے گا۔ اور فیصلہ میں جلدی نہ کریگا۔ بلکہ سوچ کر اور غور کر کے فیصلہ کریگا۔ اس نتیجہ پر پہنچیگا۔ کہ خدا تعالیٰ نے بانیٔ سلسلۂ احمدیہ میں تمام اقوام کی امیدوں کو پورا کر دیا ہے۔ اور اس کی رحمت کا دریا دلوں کی خشک زمینوں کو سیراب کرنیکیلئے اپنے کناروں سے اچھل کر بہہ پڑا ہے۔ پس مبارک ہے وہ جو اس پانی کو اپنے کھیت میں جمع کرتا ہے۔ اور اِباء اور استکبار سے کام نہیں لیتا۔ اور دین کو دنیا پر مقدم کرتا ہے۔

اس امر کے بیان کر چکنے کے بعد کہ احمدی جماعت دوسرے مذاہب یا فرقوں سے اس لئے جدا ہے۔ کہ اس نے ان نشانات کو دیکھکر جو آخری زمانہ کے مصلح کیلئے بطور علامت بتائے گئے تھے۔ حضرت مرزا غلام احمد علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے دعوٰی کو قبول کر لیا ہے اور وہ اب دوسری قوموں کی طرح کسی اور مصلح کی جو اس زمانہ کے لئے مقدر ہو منتظر نہیں۔ ہے۔ اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں۔ کہ بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے اپنی آمد کی غرض کیا بتائی ہے؟

آپ فرماتے ہیں۔ "وہ کام جس کے لئے خدا نے مجھے مامور فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ خدا میں اور اس کی مخلوق کے رشتہ میں جو کدورت واقعہ ہوگئی ہے۔ اس کو دور کر کے محبت اور اخلاص کے تعلق کو دوبارہ قائم کروں۔ اور سچائی کے اظہار سے مذہبی جنگوں کا خاتمہ کر کے صلح کی بنیاد ڈالوں۔ اور وُہ دینی سچائیاں جو دنیا کی آنکھ سے مخفی ہوگئی ہیں۔ ان کو ظاہر کر دوں۔ اور وُہ روحانیت جو نفسانی تاریکیوں کے نیچے دب گئی ہے۔ اس کا نمونہ دکھاؤں اور خدا کی طاقتیں جو انسان کے اندر داخل ہو کر توجہ یا دعا کے ذریعہ سے نمودار ہوتی ہیں۔ حال کے ذریعہ سے نہ محض مقال سے ان کی کیفیت بیان کروں۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ وُہ خالص اور چمکتی ہوئی توحید جو ہر اک قسم کے شرک کی آمیزش سے خالی ہے۔ جو اب نابود ہو چکی ہے۔ اس کا دوبارہ قوم میں دائمی پودہ لگا دوں۔ اور یہ سب کچھ میری قوت سے نہیں ہوگا۔ بلکہ اس خدا کی طاقت سے ہوگا۔ جو آسمان اور زمین کا خدا ہے۔" (لیکچر اسلام صفحہ ۲۴)

خدا نے مجھے علم دیا ہے۔ "تا میں گمراہوں کو متنبہ کروں۔ اور ان کو جو تاریکی میں ہیں۔ روشنی میں لاؤں۔"

"خدا تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے۔ تا میں اس خطرناک حالت کی اصلاح کروں۔ اور لوگوں کو خالص توحید کی راہ بتاؤں۔ چنانچہ میں نے سب کچھ بتا دیا۔ اور نیز میں اس لئے بھیجا گیا ہوں۔ کہ تا ایمانوں کو قوی کروں۔ اور خدا تعالیٰ کا وجود لوگوں پر ثابت کر کے دکھلاؤں کیونکہ ہر ایک قوم کی ایمانی حالتیں نہایت کمزور ہوگئی ہیں۔ اور عالم آخرت صرف ایک افسانہ سمجھا جاتا ہے۔ اور ہر ایک انسان اپنی عملی حالت سے بتا رہا ہے۔ کہ وہ جیسا کہ یقین دنیا اور دنیا کی جاہ و مرتبت پر رکھتا ہے۔ اور جیسا کہ اس کو بھروسہ دنیاوی اسباب پر ہے یہ یقین اور یہ بھروسہ ہرگز اس کو خدا تعالیٰ اور عالم آخرت پر نہیں۔ زبانوں پر بہت کچھ ہے مگر دلوں میں دنیا کی محبت کا غلبہ ہے۔ حضرت مسیح نے اسی حالت میں یہود کو پایا تھا۔ اور جیسا کہ ضعف ایمان کا خاصہ ہے۔ یہود کی اخلاقی حالت بھی بہت خراب ہوگئی تھی۔ اور خدا کی محبت ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ اب میرے زمانہ میں بھی یہی حالت ہے۔ سو میں بھیجا گیا ہوں۔ کہ تا سچائی اور ایمان کا زمانہ پھر آوے۔ اور دلوں میں تقوےٰ پیدا ہو۔ سو یہی افعال میرے وجود کی علت غائی ہیں۔ مجھے بتلایا گیا ہے۔ کہ پھر آسمان زمین سے نزدیک ہوگا۔ بعد اس کے کہ بہت دور ہو گیا تھا۔ سو میں انہی باتوں کا مجدد ہوں۔ اور یہی کام ہیں۔ جن کے لئے میں بھیجا گیا ہوں۔" (کتاب البریہ صفحہ ۲۵۳ تا ۲۵۶)

پھر آپ فرماتے ہیں۔ کہ آپ اس لئے دنیا کی طرف بھیجے گئے۔ کہ "تا دنیا کو اخلاقی اور اعتقادی اور علمی اور عملی سچائی کی طرف کھینچا جائے۔ اور نیز یہ کہ وہ خاص کشش سے ایسے طور سے کھینچ جائیں۔ کہ ان امور کی بجا آوری میں انکو ایک قوت حاصل ہو۔" (ریویو جلد اول صفحہ ۳)

پھر آپ تحریر فرماتے ہیں۔ کہ آپ کی اولاد میں سے ایک اسیروں کی رستگاری کا موجب ہوگا۔ یعنی اس کے ذریعہ سے بہت سی قومیں اور جماعتیں اور ملک جو دوسری قوموں یا جماعتوں یا حکومتوں کے ظلم کے نیچے دبی ہوئی ہونگی۔ ظلموں سے نجات پائینگی۔ اور اپنی اپنی قیدوں سے آزاد کی جائینگی۔ اور خدا تعالےٰ ان کی مشکلات کو دور کر کے انکو راحت اور آرام کی زندگی

نصیب کریگا۔"

پھر آپ فرماتے ہیں۔ کہ آپ کا کام یہ ہے کہ "اول تمام قوموں پر اسلام کی سچائی کی حجت پوری کریں۔" دوم۔ "اسلام کو غلطیوں اور الحاقات بے جا سے منزہ کرکے وہ تعلیم جو روح وراستی سے بھری ہوئی ہے۔ خلق اللہ کے سامنے رکھیں۔" سوم۔ "ایمانی نور کو تمام قوموں کے مستعد دلوں کو بخشیں۔"

ان تمام دعاوی سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کا کام کامل توحید کی اشاعت اور نیکی اور تقویٰ کا قیام اور دلوں میں خشیت اللہ کا پیدا کرنا اور خدا تعالیٰ سے بندوں کا تعلق مضبوط کرنا اور شک اور شبہ سے نکال کر یقینی ایمان لوگوں کو عطا کرنا اور دلوں کو بے اطمینانی کی حالت سے بچا کر سکون اور آرام دینا اور علوم آسمانی کا کھولنا اور اخلاقی اور روحانی اور علمی اور عملی مشکلات کو حل کرنا اور مظلوموں کو آسمانی حربوں کے ذریعہ سے ظلموں سے بچانا۔ اور جن جماعتوں کے حق غصب ہو چکے ہیں۔ ان کے حقوق واپس دلانا۔ اور دنیا میں سے جنگ اور فساد کو دور کرکے باہمی صلح کرانا۔ اور سب دنیا کو ایک دین اور ایک کلمہ پر جمع کرنا اور تمام اقوام تک سچائی کو پہنچا...... اور اسلام کو الحاقی غلطیوں سے پاک کرنا۔ اور اسکے سچے علوم کو دنیا کے سامنے پیش کرنا۔ اور خدا تعالیٰ کی طرف سے نشانات ظاہر کرکے لوگوں پر اسکے جلال کو ظاہر کرنا تھا۔

کیسا شاندار کام اور کیسا شاندار مستقبل ہے۔ لیکن سوال یہ ہے۔ کہ کیا کوئی مدعی آج تک ایسا بھی گزرا ہے۔ جو ان امور کے خلاف کہتا ہو؟ ہر ایک مدعی ہمیشہ دنیا کے سامنے ایسے ہی شاندار مستقبل اور ایسے ہی شاندار مقاصد رکھا کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے۔ کہ بغیر اس کے لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کرینگے۔ اور اس زمانہ میں جبکہ اشاعت پر ہی ہر ایک کام کی بنیاد ہے۔ ایسے خوشنما اعلان نہایت ہی ضروری ہیں۔ پس اگر صرف ان اعلانوں تک ہی آپ کے دعوے کی بنیاد رہتی۔ تو آپ کا دعویٰ ہرگز قابل قبول نہ ہوتا۔ اور دوسرے مدعیوں کے مقابلہ میں اسے کوئی خاص فوقیت حاصل نہ ہوتی لیکن جیسا کہ میں ابھی بتاؤں گا۔ آپ نے ایسی تعلیم دی ہے۔ اور وہ قواعد مقرر فرمائے ہیں۔ کہ ہر ایک عقلمند انسان سمجھ سکتا ہے۔ کہ انکے ذریعہ

سے وہ اغراض بوجہ احسن پوری ہوسکتی ہیں۔ جو آپ نے اپنے آنیکا موجب قرار دی ہیں۔

مگر اس جگہ ایک سوال ہے اور میرے نزدیک اس سوال کا سمجھنا لوگوں کے لئے بہت مشکل ہے۔ مگر اس کے سمجھنے کے بغیر احمدیت کی حقیقت بھی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ جب بانی سلسلہ احمدیہ یہ دعوے کرتے ہیں۔ کہ وہ علوم قرآن کریم کی اشاعت کیلئے آئے ہیں۔ اور اپنے آپکو ایک مسلمان قرار دیتے ہیں۔ اور امت محمدیہ میں سے ایک فرد تو ان کی ضرورت اور سلسلہ کی اہمیت بحیثیت ایک جماعت کے کیا باقی رہجاتی ہے؟ تب تو ان کی حیثیت ایک عالم یا ایک صوفی کی رہ جائیگی۔ اور سلسلہ احمدیہ محض ایک علمی جماعت کے دوسرے درجہ کی حیثیت پر جا گریگا۔ لیکن یہ خیال صداقت سے بالکل دور ہوگا۔ اور سلسلہ احمدیہ کے سمجھنے سے بالکل محروم کر دیگا۔

اصل بات یہ ہے۔ کہ احمدیت کا یہ عقیدہ ہے۔ کہ انبیاء دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو شریعت لاتے ہیں۔ اور ایک وہ جو اس شریعت کو قائم کرنے آتے ہیں۔ اور جو نقائص مرور زمانہ سے مذہب میں پیدا ہوگئے تھے۔ ان کو دور کرتے ہیں۔ تمام مذہبی سلسلوں کا اس امر پر اتفاق ہے۔ اور موسوی سلسلہ کے انبیاء اس فرق کی ایک کھلی مثال ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام شریعت لانیوالے نبی تھے۔ آپ کے زمانہ میں ہارون اور آپکے بعد یوشع اور انکے بعد آنیوالے نبی بشمولیت حضرت مسیح علیہم السلام سب کے سب موسیٰ کی شریعت کو قائم کرنے کے لئے آئے تھے۔ حضرت مسیح خود فرماتے ہیں "یہ خیال مت کرو۔ کہ میں توریت یا نبیوں کی کتاب منسوخ کرنے کو آیا ہوں میں منسوخ کرنیکو نہیں۔ بلکہ پوری کرنے کو آیا ہوں" (متی باب ۵ آیت ۱۷) اس امر کے متعلق کہ موسیٰ کی شریعت آپکے زمانہ تک اور آپ کے شاگردوں کے لئے بھی جاری تھی۔ اس نصیحت سے جو آپ نے اپنے شاگردوں اور دوسرے لوگوں کو کی۔ ظاہر ہے۔ یعنی "فقیہی اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ اس لئے جو کچھ وے تمہیں ماننے کو کہیں مانو۔ اور عمل میں لاؤ لیکن ان کے سے کام نہ کرو۔ کیونکہ وے کہتے ہیں۔ پر کرتے نہیں (متی باب ۲۳ آیت ۱ تا ۳)

بیشک مسیح کی بعض تعلیموں کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ وہ توریت سے مختلف ہیں

لیکن اگر ہم توریت کو غور سے دیکھیں۔ تو ان کا بیج ہمیں توریت میں نظر آتا ہے۔ بلکہ خود حضرت مسیح نے ان تعلیموں کے متعلق فرمایا ہے۔ کہ یہ تعلیمیں بھی نئی نہیں ہیں۔ بلکہ وہی ہیں۔ جو پہلے توریت میں بیان ہو چکی ہیں۔ چنانچہ آپ اس پہاڑی وعظ کے بعد جس کی نصائح کو توریت سے جدا سمجھا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں "توریت اور نبیوں کا خلاصہ یہی ہے" (متی باب آیت ۱۲)

غرض انبیاء دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وُہ جو نئی شریعت لاتے ہیں جیسے کہ موسےٰ علیہ السلام۔ اور ایک وُہ جو پُرانی شریعت کو قائم کرتے ہیں۔ بعد اس کے کہ لوگوں کے خیالات کی ملونی سے وہ حقیقت سے دُور ہو گئی ہو۔ جیسے کہ ایلیاہ یسعیاہ حزقیل۔ دانیال اور مسیح علیہ السلام حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا دعویٰ بھی مؤخر الذکر قسم کے نبیوں کی طرح کا ایک نبی ہونے کا تھا۔ اور خصوصاً آپ اس امر کے مدعی تھے۔ کہ جس طرح موسوی سلسلہ کے آخری خلیفہ حضرت مسیح ناصری تھے۔ اسی طرح اسلام کے آخری خلیفہ آپ تھے۔ اور اس وجہ سے احمدیت کو دوسرے مسلمان فرقوں کے مقابلہ پر بالکل اسی مقام پر سمجھنا چاہئیے۔ کہ جس پر یہودیت کے مقابلہ میں مسیحیت ہے۔ ہم لوگ یہ یقین کرتے ہیں۔ کہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم حضرت موسےٰ کی اس پیشگوئی کے پورا کرنیوالے تھے۔ جو استثنا باب ۱۸ آیت ۱۸ میں بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ایک موسیٰ جیسے نبی یعنی صاحب شریعت نبی کے آنے کے متعلق ہے۔ آپ بھی ایک جدید شریعت لائے۔ اور بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے تھے۔ قرآن کریم آپ کے اس پیشگوئی کا مصداق ہونیکے متعلق ان الفاظ میں دعوےٰ کرتا ہے:۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا (مزمل ع۱) ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے۔ جو شریعت کے احکام پر تم سے اپنی نگرانی میں عمل کرا کے ان کو قائم کرتا ہے۔ اسی طرح جس طرح ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔ اب اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم موسیٰ کے مثیل تھے۔ تو یہ بھی ماننا پڑے گا۔ کہ مسیح ثانی جس کا وعدہ دیا گیا تھا۔ وہ آپ کی شریعت کو ہی رائج کرنے والا ہو جس طرح مسیح ناصری توریت کے احکام کو دنیا میں قائم کرنے کے لئے آئے تھے۔ اور اس کی جماعت کا اسلام سے وہی تعلق ہو۔ جو ابتدائی صدیوں میں مسیحیت کا یہودیت سے تھا۔

اس تفصیل سے آپ لوگوں پر یہ امر تو اچھی طرح واضح ہو گیا ہوگا۔ کہ اسلام اور احمدیت کا کیا تعلق ہے لیکن ابھی تک یہ واضح نہیں ہوا۔ کہ پھر احمدیت کی اہمیت کیا ہے؟ ایک امر کی طرف تو میں پہلے ہی اشارہ کر چکا ہوں۔ کہ ایسے نبیوں کا ایک کام جو شریعت کے بغیر آتے ہیں یہ ہوتا ہے۔ کہ وُہ مرور زمانہ سے جو غلط خیالات اس مذہب میں داخل ہو جاتے ہیں۔ انکو دُور کر کے اصل حقیقت کو آشکار کرتے ہیں۔ اور یہ بھی ایک بہت بڑا کام ہے۔ ضرورت کے وقت پرانی گمشدہ شئے کو تلاش کر دینا ویسا ہی بڑا کام ہے جیسے کہ نئی چیز کا لانا لیکن ہمارے نزدیک حضرت مسیح موعودؑ کا کام اس سے بھی بڑا تھا۔ مگر اس کام کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے یہ سمجھ لیا جائے۔ کہ ہم لوگ قرآن کریم کو کیا سمجھتے ہیں۔ ہم لوگوں کا برخلاف دوسرے مسلمانوں کے یہ عقیدہ ہے۔ کہ قرآن کریم کے معارف پہلے زمانوں پر ختم نہیں ہو گئے بلکہ قرآن کریم خدا کا مکمل کلام ہے۔ اور مکمل کلام کیلئے یہ شرط ہوتی ہے کہ جس طرح خدا تعالےٰ کا فعل غیر محدود عجائبات کا خزانہ ہے۔ جو وقت اور ضرورت پر ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ اسیطرح خدا کا قول بھی غیر محدود عجائبات کا خزانہ ہو۔ جو ہر رُوحانی اور اخلاقی ضرورت کے وقت اسکا علاج بتائے۔ دنیا جب سے پیدا ہوئی ہے اسکے اندر خدا تعالےٰ نئی نئی چیزیں نہیں پیدا کرتا لیکن اس کی ایک ایک چیز میں اسقدر عجائبات اور اسرار ہیں۔ کہ ایک چیز بھی دنیا کی نہیں جس کی نسبت یہ کہا جاسکے۔ کہ اس کے انکشافات ختم ہو گئے ہیں۔ اور اب اس میں سے کسی نئی طاقت یا اس کے کسی نئے فائدہ کا معلوم ہونا ناممکن ہے۔ انسانی جسم کے اسرار بھی ابھی تک پورے طور پر ظاہر نہیں ہو سکے۔ کجا یہ کہ انسان اپنے غیر کے اسرار کو بالاستیعاب دریافت کر سکتا پس جب یہ حال اس قانون قدرت کا ہے۔ جو ایک عارضی فائدہ اور عارضی نفع کے لئے بنایا گیا ہے۔ تو کلام الہٰی کو جو معالج روحانی کا قائم مقام ہے کسقدر عجائبات اور اسرار اور فوائد پر مشتمل ہونا چاہئیے۔ اور اس کی مخفی طاقتوں کا خزانہ کیسا غیر محدود ہونا چاہئیے۔ ہمارے نزدیک اور ہم سمجھتے ہیں۔ کہ ہر ایک عقلمند انسان کے نزدیک کامل کلام کے اندر اس خوبی کا پایا جانا ضروری ہے۔ اور جس کلام میں یہ خوبی نہیں۔ وہ ہرگز خدا کا کامل کلام نہیں کہلا سکتا۔

حضرت مسیح موعود علیہ السّلام اپنے مخالفوں کو جو قرآن کریم کے علوم کی نسبت یہ خیال کرتے تھے کہ وہ سب کے سب پہلے لوگوں پر ختم ہو چکے مخاطب کر کے یوں فرماتے ہیں:۔

"جاننا چاہئے کہ کھلا کھلا اعجاز قرآن شریف کا جو ہر ایک قوم اور ہر ایک اہل زبان پر روشن ہو سکتا ہے جس کو پیش کر کے ہم ہر ایک آدمی کو خواہ وہ ہندی ہو یا پارسی۔ یا یورپین یا امریکن یا کسی اور ملک کا ہو۔ ملزم و ساکت و لاجواب کر سکتے ہیں۔ وہ غیر محدود معارف وحقائق وعلوم حکمیہ قرآنیہ ہیں۔ جو ہر زمانہ میں اس زمانہ کی حاجت کے موافق کھلتے جاتے ہیں اور ہر ایک زمانہ کے خیالات کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلح سپاہیوں کی طرح کھڑے ہیں۔ اگر قرآن شریف اپنے حقائق و دقائق کے لحاظ سے ایک محدود چیز ہوتی۔ تو ہرگز وہ معجزہ تامّہ نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ فقط بلاغت وفصاحت ایسا امر نہیں ہے۔ جس کی اعجازی کیفیت ہر ایک خواندہ و ناخواندہ کو معلوم ہو جائے کھلا کھلا اعجاز اس کا تو یہی ہے۔ کہ وہ غیر محدود معارف و دقائق اپنے اندر رکھتا ہے۔ جو شخص قرآن شریف کے اس اعجاز کو نہیں مانتا۔ وُہ علم قرآن سے سخت بے نصیب ہے۔ . . . . . اے بندگانِ خدا یقیناً یاد رکھو۔ کہ قرآن شریف میں غیر محدود معارف وحقائق کا اعجاز ایسا کامل اعجاز ہے جس نے ہر ایک زمانہ میں تلوار سے زیادہ کام کیا ہے۔ اور ہر ایک زمانہ۔ اپنی نئی حالت کے ساتھ جو کچھ شبہات پیش کرتا ہے یا جس قسم کے اعلیٰ معارف کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کی پوری مدافعت اور پورا التزام اور پورا پورا مقابلہ قرآن شریف میں موجود ہے۔ کوئی شخص برہمو ہو یا بدھ مذہب والا آریہ یا کسی اور رنگ کا فلسفی کوئی ایسی الٰہی صداقت نہیں نکال سکتا۔ جو قرآن شریف میں پہلے سے موجود نہ ہو۔ قرآن شریف کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ اور جس طرح صحیفہ فطرت کے **عجائب وغرائب خواص کسی پہلے زمانہ تک ختم نہیں ہو چکے بلکہ جدید در جدید پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ یہی حال ان صحفِ مطہرہ کا ہے تا خدا تعالےٰ کے قول اور فعل میں مطابقت ثابت ہو۔**" (ازالہ اوہام صفحہ ۳۰۳ تا ۳۱۴)

یہ وُہ نکتہ عظیم ہے جسے حضرت مسیح موعودؑ نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ مسلمان یہ تو خیال کرتے تھے۔ کہ قرآن کریم کامل ہے لیکن تیرہ سو سال تک انکے ذہن اس طرف نہیں گئے کہ وُہ صرف کامل ہی نہیں۔ بلکہ ایک خزانہ ہے جس میں آئندہ زمانوں کی

ضروریات کے سامان بھی مخفی رکھے گئے ہیں۔ اور اس کی تحقیق اور تجسس سے بھی اسی طرح بلکہ اس سے بڑھکر علوم نکلیں گے جس طرح کہ نیچر پر غور کرنے سے علوم نکلتے ہیں۔ بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے اس نکتہ کے پیش کرنے سے روحانی عالم میں ایجاد کا ایک وسیع دروازہ کھول دیا ہے۔ جس کا مقابلہ علوم سائنس کی دریافت نہیں کر سکتی۔ بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے یہی نہیں کیا۔ کہ ان مسائل کو جو مرورِ زمانہ سے بگڑ چکے تھے۔ پھر اصلی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ بلکہ اس سے بڑھکر یہ کہ انہوں نے قرآن کریم کو ایسی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ کہ اس کی تمام وہ ضروریاتِ ذہنی اور علمی جو اس وقت کے متغیر حالات کے سبب سے پیدا ہو رہی تھیں۔ قرآن کریم سے پوری ہو گئیں۔ اور آئندہ کے لئے بھی تمام مشکلات کے حل کی کنجی مل گئی۔

اس میں کیا شک ہے۔ کہ دنیا اس وقت بعض صداقتوں اور بعض تمدنی مشکلات کے حل کے لئے پیاسے کی طرح حیران پھر رہی ہے۔ حتےٰ کہ بعض لوگ مذہبی کتب میں ان مشکلات کا حل نہ پا کر ان کتب سے ہی بیزار ہو گئے ہیں۔ اور بعض لوگ نئی شریعتوں کے بنانے کی طرف مائل ہیں۔ اور دنیا کی مصیبت کو اور بھی زیادہ کر رہے ہیں لیکن جیسا کہ آپ لوگوں پر ابھی ظاہر ہو جائیگا۔ ان تمام مشکلات کا حل اس تعلیم میں موجود ہے۔ جو بانی سلسلہ احمدیہ نے دنیا کے سامنے پیش کی ہے۔ وہ بیشک قرآن کریم میں موجود تھی۔ مگر اس کے ایک حصہ کی تو یہ حالت تھی۔ کہ جیسے صاف پانی میں کوئی باہر کی ناپسندیدہ آلائش شامل ہو جائے اور بعض حصہ کی یہ حالت تھی۔ جیسے زیر زمین چشمہ بہہ رہا ہو لیکن ہمیں معلوم نہ ہو کہ یہاں پانی ہے۔ آپ نے آمیزش والے پانی کو چھان کر صاف کیا۔ اور زیر زمین چشمہ کا ہمیں پتہ دیا اور ہمیشہ کے لئے ہماری آنکھوں پر سے پردہ اٹھا دیا۔ اور تحقیق اور اکتشاف کا ایک وسیع دروازہ کھول دیا۔ مگر اس حدبندی کے ساتھ اسلام کی وہ شکل بھی جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قائم کی گئی تھی۔ اور جسے اللہ تعالیٰ ہمیشہ محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ محفوظ رہے۔ اور جدید ضروریات کا سامان بھی مہیا ہوتا رہے۔

مذکورہ بالا حقیقت کے معلوم ہونیکے بعد اس امر کا سمجھنا بالکل آسان ہے۔ کہ باوجود

قرآن پر ایمان لانیکے اور مسلمان کہلانیکے احمدیہ جماعت موجودہ مسلمان فرقوں میں سے ایک فرقہ ان معنوں میں کہ جن معنوں میں عرفاً فرقہ کا لفظ بولا جاتا ہے نہیں ہے بلکہ وہ اپنے دعوی کیمطابق آج سے تیرہ سو سال پہلے کا اسلام پیش کرنیوالی جماعت ہے۔ جو قرآن کریم کے غیر محدود علوم کا انکشاف کرکے اپنے دوسرے بھائیوں کو ان سے حصہ دینے کے لئے کھڑی ہوئی ہے۔ اس کا وجود کسی خاص خیال کی ارتقائی ترقی کا نتیجہ نہیں ہے۔ نہ کسی خاص فرقہ کی طبعی رَو کی آخری موج بلکہ وہ ایک نیا اُبال ہے۔ جس نے دو سمت کا رُخ کیا ہے۔ ایک لہر اسکی تو ماضی کی طرف شدت سے نکل گئی ہے۔ اور آج سے تیرہ سو سال پہلے کے زمانہ تک چلی گئی ہے اور دوسری لہر اس کی موجودہ اور آئندہ زمانوں کی ضروریات کا احاطہ کرتی ہوئی نکل گئی ہے۔ یہ ایک ایسی لہر ہے جس نے صرف مشرق اور مغرب کو ہی نہیں ملایا۔ بلکہ ماضی اور مستقبل کو بھی ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اور اب ہم بلاشبہ اور شک کے کہہ سکتے ہیں۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جن پر آخری اور مکمل شریعت نازل ہوئی۔ آدم تکمیل شریعت تھے۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام جنکو اللہ تعالے نے علوم قرآنیہ کی وسعت اور ہر زمانہ کی ضروریات کے علاج پر مشتمل ہونیکی حقیقت کے اظہار کیلئے بھیجا ہے۔ وہ آدم تکمیل اشاعت تھے۔ جس طرح کہ پہلا آدم تکمیل انسانیت تھا۔

اس احمدی عقیدہ کا بیان کر دینا میرے مضمون کے لئے نہایت ہی ضروری تھا کیونکہ جیسا کہ میں نے بتایا ہے۔ احمدیت کسی جدید مذہب کا نام نہیں ہے۔ اگر بلا اس تشریح کے میں احمدیت کی تعلیم اور اس کے اصول کو بتاتا۔ تو چونکہ وہ قرآن کریم پر مبنی ہوتے۔ آپ لوگوں کے لئے اس امر کا سمجھنا مشکل ہو جاتا کہ میں احمدیت کا ذکر کر رہا ہوں۔ یا اسلام کا۔ حالانکہ جیسا کہ آپ لوگوں نے اب معلوم کر لیا ہوگا۔ احمدیت اور اسلام ایک ہی چیز کا نام ہے اور احمدیت سے مراد صرف وہ حقیقتِ اسلام ہے۔ جو اس زمانہ کے موعود کے ذریعہ سے اللہ تعالے نے ظاہر فرمائی ہے۔

پس احمدیت کی تمام بناء قرآن کریم اور شریعت اسلام پر ہے مگر باوجود اس کے احمدیت دوسرے مسلمان فرقوں سے بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ احمدیت اپنی تعلیم میں ان خیالات سے جو اس وقت مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں رائج ہیں۔ بالکل مختلف ہے۔

اس کے ذریعہ سے بہت سی صداقتیں جو دنیا سے مفقود ہوگئی تھیں۔ دوبارہ ان کو دنیا کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اور بہت سی صداقتیں جو اس زمانہ سے خاص ہیں۔ پہلے لوگوں کو معلوم ہی نہ تھیں۔ اُنکو ظاہر کیا گیا۔ اور بہت سے علوم قرآنیہ جو الفاظ کے نیچے مدفون چلے آتے تھے ان کو نکال کر علمی دنیا کو مالا مال کر دیا گیا ہے۔ پس جب میں اپنے مضمون میں یہ کہوں کہ اسلام کی یہ تعلیم ہے۔ تو اس سے مراد وہی تعلیم ہوگی جو احمدی نقطۂ نگاہ کے مطابق ہے۔ خواہ دوسرے لوگ اس کو قبول کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں۔ اور جب میں یہ کہوں۔ کہ احمدیت کی یہ تعلیم ہے تو اس سے مراد بھی وہ تعلیم ہوگی۔ جو اسلام نے پیش کی ہے۔ نہ کوئی جدید تعلیم۔

مگر پیشتر اس کے کہ میں ان تعلیمات اور خصوصیات کو بیان کروں۔ جو احمدیت کو دوسرے مذاہب سے ممتاز کر دیتی ہیں۔ میں تمہیداً اس امر کو بیان کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ گو بانیانِ مذہبی کانفرنس کی اس کانفرنس کے قیام سے کچھ بھی غرض ہو میرے نزدیک ایسی کانفرنس کی سب سے بڑی غرض یہی ہونی چاہئے۔ کہ ان کے ذریعہ سے لوگوں کو اس امر کے موازنہ کرنیکا موقعہ ملے۔ کہ کونسا مذہب ان کو اس مقصد کے حصول میں ممد ہو سکتا ہے۔ جس مقصد کے لئے مذہب کی جستجو کی جاتی ہے۔ پس گو یہ ضروری نہیں۔ کہ ان مضامین میں جو اس موقعہ پر پڑھے جائیں۔ ہر اک حکم کو بیان کیا جائے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ ہر مذہب کی اصولی تعلیم کا ایک مختصر لیکن مکمل نقشہ پیش کر دیا جائے۔ جس سے لوگ اس امر کا اندازہ کر سکیں۔ کہ اس مذہب میں تمام اہم ضروریات کو پورا کرنے کے سامان موجود ہیں۔ اور صرف چند باتوں کو لیکر ان پر زور نہیں دیدیا گیا۔

دوسرا امر اس غرض کو پورا کرنے کیلئے یہ ضروری ہے۔ کہ ہر اک مذہب کے قائم مقام اپنے مذہب کو پیش کریں نہ کہ اپنے خیال کو۔ اگر ایسا نہ کیا جائیگا۔ تو کبھی بھی لوگ حق کو نہیں پاسکیں گے خیالات کوئی مادی اور ٹھوس چیز نہیں ہیں جنکو مختلف مذاہب کے پیرو تالوں میں بند کرکے رکھ چھوڑیں۔ جسوقت کسی خیال کا اظہار کیا جاتا ہے۔ وہ ملکِ عام ہو جاتا ہے۔ جو چاہے اسکو اختیار کر لے۔ اور استعمال کرے۔ پس اگر ایسا کوئی علاج نہ نکالا جائے۔ جس کے ذریعہ سے یہ معلوم ہو سکے۔ کہ وہ خیالات جن کو کسی مذہب کی طرف سے پیش کیا جاتا

ہے سو وُہ فی الواقعہ اسی کے ہیں۔ اور لیکچرار نے ان خیالات کو دوسرے لوگوں سے چرایا نہیں کبھی بھی مذاہب کا فیصلہ کرنیمیں آسانی نہ ہوگی اور نہ صحیح موازنہ ہو سکے گا۔ اور نہ کوئی نتیجہ نکلیگا بلکہ الٹا لوگوں کو نقصان پہنچے گا۔ اور وُہ خیال کرنے لگیں گے۔ کہ سب مذاہب ایک سے ہیں حالانکہ صرف ایک مذہب میں وہ سچائی ہوگی۔ اور دوسرے مذاہب اس سے خالی ہونگے۔ ہاں انکے ہوشیار پیرو ان خیالات کو چرا کر اپنے مذہب کی طرف منسوب کر رہے ہونگے۔

بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے اس نقص کو دور کرنے کے لئے ایک تجویز پیش کی ہے۔ جسے وہ ہمیشہ اپنے مضامین میں مدنظر رکھتے تھے۔ اور جس کے مدنظر رکھنے سے مذکورہ بالا خرابی بالکل دور ہو جاتی ہے۔ اور وُہ یہ ہے۔ کہ ہر مذہب کے وکیل اپنے مذہب کی طرف جو امر منسوب کریں۔ اسکا ثبوت وہ اپنی مذہبی کتب سے دیں یعنی اپنی الہامی کتاب سے یا اس شخص کی تشریح سے جس پر وہ کتاب نازل ہوئی ہے۔ اس شرط پر عمل کرنیسے وہ اخفاء کا پردہ جو سچائی پر پڑا رہتا ہے۔ بالکل اٹھ سکتا ہے اور حقیقت کھل سکتی ہے۔ اور خوب ظاہر ہو سکتا ہے کہ کونسا مذہب کامل ہے۔ اور کونسے مذاہب ناقص جنکے پیرو ان کو کامل ظاہر کرنیکے لئے دوسرے مذاہب کی تعلیمات چرا کر اس کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔

چونکہ ریلیجس کانفرنس کے بانیوں نے اس قسم کی کوئی شرط نہیں لگائی گو میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ جب ریلیجس کانفرنسیں ہوں۔ تو انمیں یہ شرط رکھی جائیگی۔ تا کہ لوگوں کے لئے فیصلہ کرنیمیں آسانی ہو۔ اس لئے دوسرے مذاہب کے قائم مقام تو اس شرط کا خیال غالبًا اپنے مضامین میں نہیں رکھینگے مگر میں اپنے لئے خود یہ قید مقرر کرتا ہوں۔ کہ میں جو تعلیم اسلام اور احمدیت کی طرف منسوب کرونگا۔ وُہ وہی ہوگی۔ جسے ہمارا مذہب پیش کرتا ہے نہ وہ جسے میں خود کہیں سے مستعار لیکر پیش کر دوں۔ میں اول تو ہر بات کا ثبوت اپنی مذہبی کتب سے پیش کرتا چلا جاؤنگا۔ اور اگر بعض جگہ بسبب طوالت حوالہ کو چھوڑ دوں تو ہر شخص کا حق ہے۔ کہ وہ مجھ سے اس حوالہ کا مطالبہ کرے جس کی بنا پر میں نے اس تعلیم کو اسلام کیطرف منسوب کیا ہے۔

اس تمہید کے بعد میں اصل مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ سو یاد رکھنا چاہئے

کہ مذہب کی بڑی غرضیں چار ہیں۔ اول یہ کہ وُہ انسان کو اسکے مبدا کے متعلق علم دے یعنی اس کے پیدا کرنیوالے اور اس کے وجود میں لانے والے کے متعلق اسکو صحیح عقاید بتائے۔ تا کہ وہ اس خزانۂ قوت وطاقت سے فائدہ حاصل کرنے سے محروم نہ رہجائے۔ اور اپنی پیدائش کی غرض سے جسے پیدا کرنیوالا ہی بتا سکتا ہے۔ غافل نہ رہے۔ اس مقصد کے پورا کرنیکے لئے چار باتوں کا بیان کرنا ضروری ہے:۔

(۱) خدا تعالیٰ کی ذات اور صفات کے متعلق اصل حقیقت کو بیان کرنا۔

(۲) یہ بتانا کہ بندے کو خدا سے کیا تعلق ہونا چاہئے۔

(۳) یہ بتانا کہ کن اعمال سے بندہ اس تعلق کا اظہار کرے۔ یا یہ کہ بندہ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے کیا ذمہ واریاں ہیں۔

(۴) خدا تعالےٰ سے ملنے کا راستہ بتائے۔ اور اس غرض کو اسی دُنیا میں پورا کر کے دکھائے تا کہ انسان خدا تعالےٰ کے متعلق ظنّی علم سے گزر کر یقین کے درجہ تک پہونچ سکے۔

دوسرا مقصد مذہب کا یہ ہے۔ کہ وہ انسان کو کامل اخلاقی تعلیم دے۔ اس مقصد کے پورا کرنے کے لئے بھی مندرجہ ذیل سات امور کا بیان کرنا ضروری ہے:۔

(۱) اخلاق حسنہ کیا ہیں۔ (۲) اخلاق سیّئہ کیا ہیں۔ (۳) یہ کہ اخلاق حسنہ کے مختلف مدارج کیا ہیں۔ (۴) اخلاق سیّئہ کے مختلف مدارج کیا ہیں (۵) کسی امر کو بدی اور کسی کو نیکی کیوں قرار دیا گیا ہے (۶) وُہ ذرائع کیا ہیں۔ جن کی مدد سے انسان اخلاق حسنہ کو حاصل کر سکتا ہے (۷) وہ ذرائع کیا ہیں جنکی مدد سے انسان اخلاق سیّئہ سے بچ سکتا ہے۔

اخلاق حسنہ کے بیان میں ان سات امور کا بیان کرنا نہایت ضروری ہے بغیر اس کے یہ مقصد ہرگز پورا نہیں ہو سکتا۔

تیسرا مقصد مذہب کا بنی نوع انسان کی تمدنی ضروریات کا حل ہے۔ کیونکہ جب خدا تعالےٰ نے انسان کو مدنی الطبع پیدا کیا ہے۔ تو یہ بھی ضروری ہے۔ کہ وہ اس کے لئے ایسے اصولی قواعد تجویز فرمائے جن کے ذریعہ سے دنیا میں امن اور امان قائم ہو۔ اور ہر ایک طبقہ اور فرقہ کے لوگ اپنے حقوق کے اندر رہیں۔ اور کوئی کسی کے حق کو دانستہ یا نادانستہ نہ دبا سکے۔ اگر غور کیا

جائے تو سوائے اللہ تعالیٰ کے سوسائٹی کے حقوق کو دوسری کوئی ہستی بیان ہی نہیں کرسکتی کیونکہ دوسرے تمام لوگ اپنے ذاتی فوائد کیوجہ سے اس وسعتِ نظر سے محروم ہوتے ہیں جو اس کام کے لئے ضروری ہے پس ان قواعد کا بیان کرنا جو تمدن انسانی کے لئے بمنزلہ اساس کے ہوں مذہب کے اہم فرائض میں سے ہے۔ اور جو مذہب اس مقصد کو پورا نہیں کرتا وہ ہرگز مذہب کہلانیکا مستحق نہیں ہے۔ اس مقصد کے پورا کرنیکے لئے مندرجہ ذیل امور پر روشنی ڈالنا مذہب کا فرض ہے:۔

(۱) امور خانہ داری یعنی رشتہ داروں سے رشتہ داروں کے تعلقات اور انکے باہمی حقوق پر کہ یہ تمدنِ انسانی کا پہلا ٹکڑہ ہے۔

(۲) ملکی اور سیاسی حقوق پر کہ کس احسن طریق پر ان کو ادا کیا جاسکتا ہے۔

(۳) آقا اور ملازم یا مالداروں اور غریبوں کے تعلقات پر۔

(۴) اس سلوک پر جو ایک مذہب کے لوگوں کو دوسرے مذہب کے لوگوں سے یا ایک بادشاہت کے لوگوں کو دوسری بادشاہت کے لوگوں سے کرنا چاہیئے۔

چوتھا مقصد مذہب کا انسان کے انجام کا بیان کرنا ہے یعنی یہ بتانا کہ انسان مرنیکے بعد کہاں جائیگا۔ اس سے کیا سلوک ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے مندرجہ ذیل امور کا بیان کرنا ضروری ہے:۔

(۱) کیا موت کے بعد انسان کیلئے کوئی بقا ہے؟ اگر ہے تو کس رنگ میں؟

(۲) اگر کوئی بقا ہے تو کیا اس بقا کے ساتھ تکلیف یا خوشی کا کوئی سلسلہ وابستہ ہے؟

(۳) اگر وابستہ ہے۔ تو اس کی کیا کیفیت ہے؟

(۴) آیا مرنے کے بعد بھی انسان کے لئے بدی سے نیکی کی طرف جانیکا کوئی راستہ کھلا ہے اگر ہے۔ تو کس طرح؟

مذکورہ بالا چار مقاصد کے متعلق کسی مذہب کی تعلیم معلوم کرکے ہی اس کے دعوے کے متعلق صحیح نتیجہ نکالا جاسکتا ہے۔ اور میں ان مقاصد کے متعلق احمدیت کی تعلیم کو اس امید اور یقین کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ کہ جب آپ لوگ انصاف سے اس پر غور فرمائیں گے

تو آپ پر ثابت ہوجائیگا۔ کہ اگر ان چاروں مقاصد کو کوئی مذہب پورا کرتا ہے۔ تو وہ صرف اسلام ہی ہے۔

پہلا مقصد
یعنی خدا تعالےٰ کے متعلق اسلام کی تعلیم

جیسا کہ میں اوپر بیان کرچکا ہوں یہ مضمون چار سوالوں میں تقسیم ہے۔ پس میں ان چاروں سوالوں کو باری باری لیکر ان کے متعلق اسلام کی تعلیم کو بیان کرتا ہوں:۔

(۱) پہلا سوال مقصد اول کے متعلق یہ ہے۔ کہ اس مذہب میں خدا تعالےٰ کی ذات اور صفات کے متعلق کیا تعلیم دی گئی ہے؟ سو یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اسلام اللہ تعالےٰ کو ایک کامل ہستی بیان فرماتا ہے جس میں سب خوبیاں جمع ہیں چنانچہ قرآن کریم کی ابتداء ہی ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ سب تعریف کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے کیونکہ وُہ سب جہانوں کا پیدا کرنیوالا اور ان کو پالنے والا ہے۔ پس چونکہ ہر ایک چیز اس کی پیدا کی ہوئی اور اسی کی پرورش کی محتاج ہے۔ اس لئے جو خوبیاں دنیا میں کسی اور چیز میں نظر آویں۔ انکی تعریف کا استحقاق بھی درحقیقت اللہ تعالےٰ کو ہی حاصل ہے۔ کیونکہ انکو جو کچھ ملا ہے۔ وہ اللہ تعالےٰ سے ہی ملا ہے ایک خوبصورت نظارہ ایک خوشبودار پھول ایک خوش ذائقہ کھانا۔ ایک نرم اور ملائم فرش۔ ایک دلکش آواز غرض جسقدر اچھی چیزیں ہیں جنکو محسوس کرکے حواس انسانی خوشی اور راحت پاتے ہیں۔ ان سب چیزوں کی خوبی خدا تعالےٰ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے پھر فرماتا ہے۔ اَلرَّحْمٰنِ۔ بندوں کو جسقدر ضروریات پیش آنی تھیں اور جس قسم کے سامانوں کی انکو احتیاج ہونی تھی۔ وہ سب خدا تعالےٰ نے بطور انعام اور فضل کے پیدا کرچھوڑی ہیں جیسے نور اور روشنی یا آگ اور پانی اور ہوا اور ہر قسم کی غذائیں اور دوائیں اور لکڑی اور لوہا اور پتھر غرض انسان کی محنت اور کوشش کے لئے اس نے اسقدر چیزیں دنیا میں پیدا کرچھوڑی ہیں۔ کہ وہ جس طرف بھی رُخ کرے۔ اسے اپنے مشغول کرلے اور اپنے علم اور کمال میں ترقی کرنیکا موقعہ میسر ہے حتیٰ کہ کوئی انسانی حاجت نہیں جسکا سامان خدا تعالیٰ نے انسان

کی پیدائش سے پہلے پیدا نہیں کر دیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا نام قرآن کریم رَحِیْم بتاتا ہے۔ کہ وہ تمام محنتوں اور کوششوں کے نتائج صحیح اور اعلیٰ پیدا کرتا ہے۔ جیسی جیسی کوئی محنت کرتا ہے۔ اسی قدر اس کو بدلہ مل جاتا ہے۔ انسان کی محنت کبھی ضائع نہیں جاتی بلکہ ہمیشہ اس کے ثمرات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

پھر یہ فرمایا۔ کہ خدا تعالیٰ جزا و سزا کے وقت کا مالک ہے یعنی علاوہ ان نتائج کے جو اس کی طرف سے طبعی قانون کے ماتحت نکلتے رہتے ہیں۔ یا علاوہ ان بدلوں کے جو ساتھ کے ساتھ ملتے رہتے ہیں۔ اس نے ہر ایک کام کی ایک انتہا مقرر کی ہے۔ جس پر پہنچکر اسکا آخری فیصلہ ہو جاتا ہے۔ نیک نیک بدلہ اور بد بدی کی سزا پا لیتے ہیں۔ مگر یہ بدلے اور جزائیں اللہ تعالیٰ کی مالکیت کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اگر وہ چاہتا ہے۔ تو معاف بھی کر دیتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالےٰ کی نسبت آتا ہے۔ کہ وہ قدیر ہے۔ اس نے ہر ایک چیز اور ہر ایک چیز کا اثر اور ہر ایک چیز کے نتائج کے اندازے مقرر کئے ہوئے ہیں جنکی وجہ سے دنیا کا کارخانہ چل رہا ہے۔ اگر یہ اندازہ نہ ہوتا۔ تو دنیا میں اندھیر آجاتا کیونکہ لوگ بالکل کام چھوڑ بیٹھتے۔ کھانا پکانے والا کھانا پکانے کے لئے اس لئے آگ جلاتا ہے۔ کہ وہ جانتا ہے۔ کہ یہ ضرور گرمی پیدا کریگی اگر یہ قانون نہ ہوتا۔ اور آگ کے لئے جلانے کا کام مقرر نہ ہوتا۔ یا پانی کیلئے بجھانیکا کام کبھی آگ گرمی پیدا کرتی کبھی سردی۔ پانی کبھی آگ بجھاتا کبھی آگ لگاتا۔ تو آج جس طرح لوگ ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں کبھی نہ اٹھاتے۔ بلکہ نتائج کے یقینی نہ ہونے کے سبب ہمت ہار کر بیٹھ جاتے اور ہلاک ہو جاتے۔

اسیطرح اس کی صفت بتائی ہے۔ کہ وہ عَلِیْم ہے۔ ایک ایک ذرہ کا اس کو علم ہے۔ وہ دلوں کے پوشیدہ راز اور پردوں کے اندر کی چھپی ہوئی باتیں بلکہ انسانی فطرت کے مخفی اسرار تک سے واقف ہے۔ جن سے خود انسان بھی واقف نہیں ہوتا۔ زمین کے اندر مدفون یا پہاڑ کی چوٹی پر رکھی ہوئی چیزیں سب اس کے لئے یکساں ہیں۔ وہ پہلے زمانہ کے حالات بھی جانتا ہے۔ حال سے بھی آگاہ ہے۔ اور آئندہ زمانہ میں جو کچھ ہونے والا ہے وہ بھی اسے معلوم ہے وہ سَمِیْع ہے یعنی سننے والا ہے۔ مخفی سے مخفی بات کا اس کو

علم ہے۔ آہستہ آہستہ کلام وہ سنتا ہے۔ چیونٹی کی رفتار بھی اسکی شنوائی سے باہر نہیں۔ اور انسانی رگوں کے اندر خون کے چلنے کی حرکت سے جو آواز پیدا ہوتی ہے۔ وہ بھی اسکی سماعت سے بالا نہیں۔ وہ حَیّ ہے یعنی خود زندہ ہے۔ اور دوسروں کو زندہ کرتا ہے خَالِق ہے یعنی پیدا کرتا ہے۔ قَیُّوْم ہے یعنی دوسروں کو اپنی مدد سے قائم رکھتا ہے اور خود قائم ہے۔ صَمَد ہے۔ کوئی چیز اس کی مدد اور نصرت کے بغیر زندہ رہ ہی نہیں سکتی غَفُوْر ہے۔ لوگوں کی خطاؤں کو بخشتا ہے۔ قَہَّار ہے ہر ایک چیز اسکے قبضۂ قدرت میں ہے جَبَّار ہے ہر اک فساد کی اصلاح کرتا ہے۔ وَہَّاب ہے۔ اپنے بندوں کو انعامات وافر سے حصہ دیتا ہے۔ سبُّوْح ہے کسی قسم کا کوئی عیب اس کے اندر نہیں پایا جاتا۔ قُدُّوْس ہے تمام قسم کی پاکیزگیوں کا جامع ہے۔ نیند اس کو نہیں آتی تھکتا وہ نہیں۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ وہ مُهَيْمِن ہے۔ ہر اک چیز کا محافظ ہے۔ ان صدمات سے اور وباؤں سے جنکا انسان کو علم بھی نہیں ہوتا۔ اسکو بچاتا رہتا ہے۔ کتنی دفعہ وہ بیماریوں کی زد میں آجاتا ہے یا حادثات کا شکار ہونے لگتا ہے۔ کہ مخفی در مخفی سامان اس کو اسکے صدمہ سے بچا لیتے ہیں۔ بیماری کے پیدا ہوتے ہی جسم میں اس کے زہر کے مٹانے کے سامان بھی پیدا ہونے لگتے ہیں۔ جبتک کہ انسان بالکل ہی غافل نہ ہو جائے۔ اور قانونِ قدرت کے توڑنے پر مُصر نہ رہے وہ بہت سے بد نتائج سے محفوظ رہتا ہے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ (النحل ع)۔ اگر اللہ تعالےٰ لوگوں کو انکے غیر طبعی اعمال پر پکڑنے لگتا۔ تو دنیا پر ایک حیوان بھی باقی نہ رہتا۔

غرض کہ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى سب نیک نام اس کو حاصل ہیں۔ اور اس کی رحمت ہر اک چیز پر غالب ہے۔ جیسے فرمایا۔ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ میری رحمت ہر اک دوسری شے پر غالب ہے یعنی اللہ تعالےٰ کی صفاتِ غضبیہ اسکی صفاتِ رحمت کے ماتحت ہیں۔ اللہ احد ہے یعنی کوئی چیز اس کی ہمسر نہیں ہے۔ وہ واحد ہے۔ تمام اشیاء اسکے حکم سے نکلی ہیں۔ وہ سب کی ابتدائی کڑی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالےٰ کے اور بہت سے نام قرآن کریم میں بیان فرمائے گئے ہیں

جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسلام ایک ایسے کامل خدا کو دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جو ان دونو خوبیوں کو اپنے اندر جمع رکھتا ہے یعنی محبت اور خوف کے موجبات کو جن کے بغیر کبھی کامل تعلق پیدا ہی نہیں ہوتا۔

ہر عقلمند انسان سمجھ سکتا ہے کہ کامل اطاعت اور کامل اتحاد ہمیشہ دو ہی ذریعوں سے ہوتا ہے۔ محبت سے یا خوف سے۔ بیشک محبت کا تعلق اعلیٰ اور اکمل ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ کئی طبائع صرف خوف سے مانتی ہیں پس جبتک کوئی مذہب صفاتِ غضبیہ اور صفاتِ محبت دونو پر زور نہ دے اور دونو کو پیش نہ کرے۔ کبھی وہ مذہب تمام دنیا کو نفع نہیں پہونچا سکتا۔ اگر اصلاح ہمارے مدنظر ہو۔ تو ہم صرف یہ نہیں دیکھیں گے۔ کہ اعلےٰ طبقہ کے لوگوں کے لئے کسی کام کے کرنے کا کیا محرک ہوتا ہے۔ بلکہ ہمیں اعلےٰ اور ادنیٰ دونو قسم کے لوگوں کے حالات کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ ورنہ ہم اصلاح کے کام میں ناکام رہیں گے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ اعلیٰ طبقہ کے لوگ تو خود ہی ہدایت کی طرف مائل ہوتے ہیں ہمیں زیادہ فکر ان لوگوں کی رکھنی پڑیگی۔ جو ادنیٰ حالت میں گرے ہوتے ہیں۔ اور ان کی فطرتیں مسخ ہوگئی ہیں۔ اور وہ اپنے فرائض کو بھول گئے ہیں۔ ایسے لوگ اکثر اوقات سوائے شاذ و نادر کے خوف سے ہی مانتے ہیں۔ اور جبتک ان کے سامنے نقصان کا اندیشہ موجود نہ ہو۔ اصلاح کیطرف مائل نہیں ہوتے۔ پس وُہ مذہب جو اللہ تعالیٰ سے تمام بندوں کا تعلق پیدا کرنا چاہے۔ اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ فطرت کا لحاظ رکھے۔ اور اسلام نے جس خوبی سے صفاتِ الٰہیہ کے بیان کرنے میں اس توازن کو قائم رکھا ہے وہ یقیناً ہر اک قسم کی طبائع کے علاج پر مشتمل ہے۔ اور اس سے مکمل علاج اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نے خدا تعالےٰ کی صفاتِ غضبیہ کو بھی پیش کیا ہے۔ اور صفاتِ رحمت کو بھی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا ہے کہ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (پ۹ اعراف ع ۱۹) میری رحمت ہر اک چیز پر غالب ہے۔ آخر میری رحمت میرے غضب کو مٹا دیتی ہے۔ کیونکہ میرا غضب بغرض اصلاح ہوتا ہے۔ نہ دکھ دینے کے لئے۔

یہ تعلیم اللہ تعالےٰ کی ذات کی نسبت جیسی مکمل اور اعلےٰ ہے۔ ظاہر ہی ہے۔ جو غرض مذہب کی ہے۔ وہ اس تعلیم سے بوجہ احسن پوری ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی یہ تعلیم امتیازی نہیں

جہانتک میں سمجھتا ہوں۔ اکثر مذاہب سوائے تھوڑے تھوڑے اختلافات کے لفظاً اسی تعلیم کو پیش کرتے ہیں اور سطحی نگاہ سے دیکھنے والا انسان حیران ہوجاتا ہے کہ پھر آپس میں اختلاف کیوں ہے لیکن بات یہ ہے۔ کہ یہ دھوکا کہ سب مذاہب ایک ہی سی تعلیم پیش کرتے ہیں۔ اس امر سے لگتا ہے کہ بہت لوگ فطرت انسانی کو اس فیصلہ کے وقت نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ انسانی فطرت میں یہ خاصہ رکھا گیا ہے۔ کہ بعض امور کو وہ بلا خارجی مدد کے قبول کر لیتی ہے یا رد کر دیتی ہے۔ ایسے امور کو بدیہیات کہتے ہیں۔ گو بعض فلسفی انکے بدیہی ہونیکے بھی منکر ہوں لیکن عوام الناس انکے متعلق کوئی شبہ نہیں رکھتے۔ کیونکہ وُہ ان کی طبیعتِ ثانیہ ہوگئے ہیں ایسے امور کے خلاف بات کہکر کوئی شخص کامیاب ہونیکی امید نہیں کرسکتا۔ انہی امور میں سے ایک یہ ہے۔ کہ تمام بنی نوعِ انسان اِلّا ماشاء اللہ اس امر پر متفق ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ ایک کامل وجود ہے جس میں کوئی نقص نہیں۔ اب اگر کوئی مذہب یہ دعویٰ کرے۔ کہ نہیں خدا تعالےٰ میں بھی فلاں فلاں نقص ہے۔ یا فلاں فلاں خوبی اسمیں نہیں ہے۔ تو کبھی بھی لوگ اس مذہب کی طرف توجہ نہ کریں۔ اسلئے مذاہب میں ان ناموں کے متعلق اسقدر اختلاف نہیں ہوسکتا۔ جو اللہ تعالےٰ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ بلکہ مذاہب کا اختلاف ان تفصیلات میں ہوتا ہے جو ان ناموں کی تشریح میں مختلف مذاہب کے پیرو کرتے ہیں۔ اور اس اتحاد کی وجہ یہ نہیں۔ کہ واقع میں سب مذاہب کی تعلیم اس بارے میں ایک ہے۔ بلکہ اس کی وجہ وہ قلبی احساس ہے۔ کہ لوگ ان ناموں کے سوا دوسرے ناموں کو سننے کے لئے تیار نہیں۔ پس مذاہب کا مقابلہ کرتے ہوئے ہمیشہ ان تفاصیل کو دیکھنا چاہیئے۔ جو ان ناموں کے متعلق مختلف مذاہب نے بیان کی ہیں۔

مثلاً مذاہب اس امر پر متفق ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے۔ تمام مخلوق کا پیدا کرنے والا اور اس کو اس کے دائرۂ استعداد کے اندر ترقی دینے والا ہے۔ مگر اس کی تشریح میں مختلف مذاہب میں بڑا فرق ہے۔ چونکہ میں اس وقت احمدیت کی تعلیم کو بیان کر رہا ہوں۔ میں اس صفت کے ماتحت جو اسلام نے تعلیم دی ہے۔ اسکو بیان کر دیتا ہوں۔

یہ بات واضح ہے۔ کہ اس صفت کا یہ مطلب ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ کسی خاص جماعت کا خدا نہیں۔ بلکہ وہ تمام مخلوق کا رب ہے۔ اور اس وجہ سے اسے صرف پیدائش کیوجہ سے کسی خاص قوم

سے متعلق نہیں ہوسکتا۔ بلکہ سب انسان بحیثیت انسان ہونے کے اس کے لئے برابر ہیں۔ جس طرح وہ یورپ کے لوگوں کی ربوبیت کرتا ہے۔ ایشیا کے لوگوں کی بھی کرتا ہے۔ جس طرح امریکہ کے لوگوں کی ربوبیت کرتا ہے۔ افریقہ کے لوگوں کی ربوبیت بھی کرتا ہے۔ اور جس طرح وہ ان سب لوگوں کی جسمانی ربوبیت کرتا ہے۔ روحانی بھی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم اس اصل کے ماتحت یہ حیرت انگیز انکشاف کرتا ہے۔ اور اس زمانہ میں کرتا ہے۔ جبکہ قوم پرستی اور ملکی تعصبات کا دور دورہ تھا۔ جبکہ لوگ عام طور پر یہ بھی نہیں جانتے تھے۔ کہ دوسرے ممالک کے لوگوں میں نبوت کا خیال بھی پایا جاتا ہے یا نہیں۔ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ (فاطر ع ۳) کوئی قوم دنیا کے پردے پر ایسی نہیں ہے جس میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے انکی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے نبی نہ بھیجا ہو۔ پھر ایک دوسری جگہ فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْهِ الضَّلٰلَةُ ۚ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ۔ (نحل ع ۵) یعنی ہم نے یقیناً ہر اک قوم میں رسول بھیجے ہیں یہ پیغام دیکر کہ اللہ کی عبادت کرو اور سرکش اور شریر لوگوں کی باتوں میں نہ آؤ۔ پس بعض لوگ تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایمان لے آئے۔ اور بعض اپنی گمراہی میں ہی پڑے رہے۔ پس جاؤ۔ اور ساری دنیا میں پھر کر دیکھو تمہیں ہر قوم میں نبیوں کی خبر ملیگی۔ اور ان لوگوں کا انجام جنہوں نے خدا کے نبیوں کی مخالفت کی معلوم ہوجائیگا۔ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی آتا ہے۔ کہ بعض لوگوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یارسول اللہ کیا کبھی فارسی زبان میں بھی الہام ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں فارسی زبان میں بھی خدا تعالیٰ نے ایک نبی پر کلام بھیجا تھا۔ رب العالمین کی صفت کے ماتحت جو اسلام نے یہ انکشاف کیا ہے۔ اسکو دیکھو۔ کہ کس طرح ایک جملہ سے جو ساری دنیا میں اور سب مذاہب کے پابندوں میں مشترک تھا۔ کیسی نئی صداقت پیدا کردی ہے۔ اور کسطرح تمام بنی نوع انسان میں اخوت کی روح پھیلادی ہے۔ اس تعلیم کے ماتحت ایک مسلمان کو کسی مذہب کے بزرگوں سے پرخاش نہیں ہوسکتی۔ کرشن۔ رامچندر بدھ۔ زردشت۔ کنفیوشس۔ اسی طرح ایک مسلمان کے نبی ہیں جس طرح کہ موسےٰ اور مسیحؑ۔ صرف یہ فرق ہے۔ کہ ان کے نام قرآن کریم میں چونکہ آگئے ہیں۔ وہ ان کی نسبت زیادہ وثوق کے مقام پر ہیں

اسلام کی پوزیشن اس ایک نکتہ کی وجہ سے کیسی اعلیٰ ہوگئی ہے۔ دنیا کے کسی گوشہ میں کسی علاقہ میں کسی نئے مذہب کا علم ہو۔ کسی نبی کا پتہ لگے ایک مسلمان کا دل بجائے ایک نئے حریف کا خیال کرکے منقبض ہوجانیکے ایک نئے مصدق قرآن کی بشارت کی خبر سمجھ کر خوش ہوجاتا ہے۔ کیونکہ کیا یہ سچ نہیں۔ کہ اسلام نے خدا تعالےٰ کو رب العالمین ثابت کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ اسکا فضل عرب اور شام سے ہی مخصوص نہیں جسطرح اسکا دنیاوی سورج دنیا کے ہر گوشہ پر چڑھتا ہے۔ اسیطرح اسکے کلام کا سورج بھی ہر قوم کو منور کرتا ہے۔

اس جگہ یہ شبہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ کہ اگر ساری دنیا میں مذاہب خدا تعالےٰ کیطرف سے آئے ہیں۔ تو پھر کیوں نہ سب کو ہی سچا سمجھ لیا جائے۔ اور کیوں نہ یہ مانا جائے کہ جس مذہب پر چل کر کوئی خدا کو پانا چاہے پاسکتا ہے۔ اس شبہ کا جواب بھی قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے دیدیا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِیُّهُمُ الْیَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۔ وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۔ (نحل ع ۸) **ترجمہ**۔ ہمیں اپنی ذات کی ہی قسم ہم نے تجھ سے پہلے جسقدر امتیں گذر چکی ہیں سب کی طرف رسول بھیجے تھے۔ مگر بعد میں بعض لوگوں نے جو حق سے دور تھے ان کو اور کاموں میں ڈال دیا اور آج ایسے ہی لوگ انکے دوست ہیں اور انکو دردناک عذاب پہنچیگا۔ اور ہم نے تیری طرف کتاب نہیں بھیجی۔ مگر صرف اس لئے کہ تو ان کے سامنے ان امور کو بیان کرے جنمیں کہ انکے خیالات حق کے خلاف ہوگئے ہیں۔ اور تاکہ وہ کتاب مومنوں کیلئے ہدایت اور رحمت بنے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے ہی تمام پہلی کتب اور تعلیمیں مخلوط ہوگئی تھیں۔ اور دوسرے لوگوں کے خیالات اور وساوس ان کے اندر شامل ہوگئے تھے۔ پس باوجود اس کے کہ انکی اصل خدا تعالےٰ کیطرف سے تھی۔ وہ اپنی موجودہ صورت میں قابل عمل نہ رہے تھے۔ اور ان پر اس امر میں اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کہ وہ ایک متلاشی کو خدا تک پہونچا دینگے۔

اللہ تعالےٰ کی صفات کے متعلق یہ بھی ایک سوال ہے جس کا حل کرنا مذہبی کتب کا فرض ہے کہ خدا تعالیٰ نظر کیوں نہیں آتا؟ اب یہ کہدینا تو آسان ہے۔ کہ ایک خدا ہے لیکن یہ مشکل ہے کہ خدا تعالےٰ کی مختلف صفات کو ثابت کیا جائے۔ قرآن کریم اس ذمہ واری کا اقرار کرتا ہے اور خدا تعالےٰ کی مختلف صفات کا ثبوت دیتا ہے۔ مثلاً اسی امر کے متعلق کہ خدا تعالےٰ نظر نہیں آتا۔ فرماتا ہے۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (انعام ع ۱۳) خدا تعالےٰ کو انسانی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں لیکن وہ خود انسانی آنکھوں کے پاس آتا ہے۔ تاکہ وہ اُسے دیکھیں۔ اور وُہ نہایت لطیف ہے۔ کہ آنکھ اس کے دیکھنے سے قاصر ہے۔ اور بندے کی حالت سے بھی خبردار ہے۔

کیسے مختصر الفاظ میں سارے سوال کو حل کر دیا ہے۔ لطیف چیزیں انسان کو نظر نہیں آتیں بجلی۔ ایتھر بلکہ خالص ہوا بھی انسان کو نظر نہیں آتی۔ پھر وہ خدا جو سب لطیف اشیاء سے بھی لطیف تر ہے۔ اور مخلوق نہیں۔ بلکہ خالق ہے۔ کسی قسم کے مادہ سے نہیں بنا خواہ وہ کتنا بھی لطیف کیوں نہو کسطرح نظر آسکتا ہے؟ مگر ایکطرف وہ یہ بھی دیکھتا ہے۔ کہ اسکا بندہ اس کی ملاقات کا شایق ہے۔ اور اس کے دیدار کے لئے تڑپتا ہے اسلئے وہ خود بندے کے پاس آجاتا ہے۔ اور اس کی نظر کے سامنے اپنے آپکو کر دیتا ہے یعنی وہ اپنی قدرتوں اور اپنی صفات کی جلوہ گری کے ذریعہ سے اپنی ذات کو بندہ پر ظاہر کرتا ہے۔ اور اس طرح بندہ عقل کی آنکھوں سے خدا تعالےٰ کو دیکھ لیتا ہے۔

ثبوت ہستی باریتعالےٰ کے متعلق اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ تَبَارَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۙ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۙ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (سورۃ الملک ع ۱) بابرکت ہے وہ خدا جس کے قبضہ میں بادشاہت ہے۔ اور وہ ہر ایک چیز پر قادر ہے۔ وہ خدا جس نے موت اور زندگی کو اس لئے بنایا ہے تاکہ یہ دیکھے کہ تم میں سے

کون شخص اچھے عمل کرتا ہے یعنی اس نے زندگی کو عمل کے لئے اور موت کو جزا کے لئے بنایا ہے کیونکہ اس دنیا میں کامل جزا نہیں مل سکتی تھی۔ تا وہ لوگ جو ابھی عمل کی جد و جہد میں پڑے ہوئے ہیں۔ جزا و سزا کو دیکھکر ان کے لئے ایمان بے حقیقت نہ رہجائے۔ اور وہ خدا غالب ہے بخشنے والا ہے۔ وہی ہے کہ جس نے سات بلندیوں کو اس طرح پیدا کیا ہے۔ کہ ہر اک دوسری کو مدد دے رہی ہے۔ تو رحمان کی پیدائش میں کسی قسم کا فرق نہیں پائیگا۔ تو اپنی نظر پھیر کر دیکھ کیا تو کوئی کمی بھی دیکھتا ہے؟ پھر نظر کو پھرا اور پھر پھرا۔ مگر ہر دفعہ تیری نظر ناکام واپس آئیگی۔ درآنحالیکہ وہ تھکی ہوئی ہوگی۔ یعنی تمام کائنات پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالو۔ تو تمہیں معلوم ہوگا۔ کہ ہر ضرورت کا جواب موجود ہے۔ ہر چیز جس جس قسم کی طاقتوں کو لیکر پیدا ہوئی ہے اسی قسم کے سامان اسے میسر ہیں تا ان طاقتوں کو استعمال کر سکے۔ اس دُنیا پر پیدا ہونے والے باریک جرم کی ضروریات کروڑوں کروڑ میلوں پر چکر لگانیوالے ستارے کے ذریعہ سے پوری ہو رہی ہیں پس یہ دائرہ ضرورت اور اسکے ایفاء کا دیکھو۔ اور اس سے معلوم کر لو۔ کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے جس نے ادنےٰ ادنیٰ ضروریات کا لحاظ رکھا ہے اور ہر ایک خواہش کے پورا ہونے کا اور ہر سچی جستجو کا سامان پیدا کیا ہے۔

صفاتِ الٰہی کے متعلق یہ بھی سوال ہوتا ہے۔ کہ اگر اللہ تعالےٰ رحمٰن ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ تو اس نے مختلف قسم کے درندے اور کیڑے مکوڑے کیوں پیدا کئے ہیں؟ اور تکلیفات اور بیماریاں کیوں بنائی ہیں؟

اسلام نے اس سوال کو بھی حل کیا ہے۔ اور صرف رحمٰن کہکر نہیں چھوڑ دیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۭ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ (انعام ع ۱) یعنی سب تعریفیں اللہ تعالےٰ کے لئے ہیں جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے ہیں اور جس نے ہر قسم کی تاریکیوں اور نور کو پیدا کیا ہے۔ پھر بھی وہ لوگ جو حقیقت کے منکر ہیں خدا کا شریک قرار دیتے ہیں یعنی تمام قسم کی وہ چیزیں جو تکلیف دہ ہیں اور تاریکی کی فرزند کہلاتی ہیں۔ جیسے سانپ بچھو۔ درندے وغیرہ یا زہر وغیرہ یا بیماریاں تکلیف وغیرہ ان کو بھی اللہ تعالےٰ نے

پیدا کیا ہے اور انکی پیدائش اللہ تعالیٰ کے رحم کے خلاف نہیں۔ بلکہ اس کے رحم کو ثابت کرتی ہے اور ان کی حقیقت کو مدنظر رکھکر خدا تعالےٰ کی حمد ثابت ہوتی ہے۔ نہ کہ اس پر الزام لگتا ہے۔ مگر باوجود اس کے جو لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں ان چیزوں کی پیدائش کو خدا تعالیٰ کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اور خدا کا ایک اور شریک مقرر کر دیتے ہیں۔ کہ ایسی ضرر رساں چیزوں کا پیدا کرنیوالا کوئی اور ہے۔

دیکھو کس صفائی سے حقیقت کے منہ پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ اور کیسا لطیف جواب دیا ہے۔ کہ جن چیزوں کو ضرر رساں کہا جاتا ہے انکی پیدائش ضرر رساں نہیں ہے۔ بلکہ پیدائش کی غرض تو نیک ہی ہے۔ اور انسان کے فائدہ کے لئے ہے۔ اور اُسے انکی پیدائش پر خدا تعالےٰ کی حمد ہی کرنی چاہئے۔

اس انکشاف کے ماتحت اب ان چیزوں پر غور کیا جائے۔ جو ضرر رساں معلوم دیتی ہیں۔ تو بات ہی بالکل اور نظر آتی ہے۔ زہر بے شک انسان کو مارتا ہے لیکن کسقدر بیماریوں میں سنکھیا اور کچلا استعمال کیا جاتا ہے۔ افیون دیجاتی ہے۔ کیا وہ لوگ جو سنکھیا اور کچلے یا افیون سے مرتے ہیں زیادہ ہیں یا وہ لوگ جو انکے ذریعہ سے بچتے ہیں؟ یقیناً ان ادویہ کے ذریعہ سے ہر سال لاکھوں آدمی مرنے مرتے بچتے ہیں۔ پھر کیونکر کہا جا سکتا ہے۔ کہ خدا تعالےٰ نے یہ کیوں پیدا کی ہیں؟ اسی طرح سانپ بچھو وغیرہ کا حال ہے۔ ابھی تک خواص الاشیاء کے ماہرین نے انکی طرف توجہ نہیں کی۔ ورنہ جب وہ توجہ کرینگے۔ تو انکو معلوم ہوگا۔ کہ یہ جانور بھی طبعی طور پر نہایت مفید ہیں۔ علاوہ ازیں انکی پیدائش جیسا کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے انسان کی پیدائش کے لئے بھی ایک بہت بڑا حصہ ہے۔ اور درحقیقت یہ جانور پیدائش انسانی کی پہلی کڑیاں ہیں۔ نہ اس طرح جس طرح آجکل بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ بلکہ اس لحاظ سے کہ ان میں سے ہر ایک جانور زمین کے مختلف تغیرات پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس کی یادگار ہے۔

اسی طرح فرماتا ہے۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ۠ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ؕ (شوریٰ ع ۳-۴)

خدا تعالےٰ کے انعامات میں سے آسمانوں اور زمین اور انکے درمیان تمام چیزوں کی پیدائش بھی ہے اور وہ جب چاہے انکو ہٹا سکتا ہے۔ اور جو تکلیف تم کو پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے عمل کا نتیجہ ہے اور اللہ تعالےٰ تو تمہاری بہت سی غلطیوں کے بدنتائج کو مٹاتا رہتا ہے۔ یعنی اللہ تعالےٰ نے سورج۔ چاند ستارے اور ان کے درمیان کی چیزیں پیدا کر کے زمین پر انسان کو حاکم بنا دیا ہے۔ اب اگر وُہ بعض سامانوں سے فائدہ نہ اٹھاویں۔ یا بعض کو غلط استعمال کر کے نقصان اٹھاویں۔ تو یہ ان کا اپنا قصور ہے۔ اللہ تعالےٰ تو جو کچھ کرتا ہے۔ یہ ہے کہ انکی غلطیوں کے کئی بدنتائج سے انکو بچا لیتا ہے پس انسانی تکالیف خدا تعالےٰ کی طرف سے نہیں ہیں۔ بلکہ اس قانونِ قدرت کے غلط استعمال کے سبب سے ہیں۔ جو انسانوں کے فائدے کیلئے بنایا گیا تھا۔

بیماریاں بھی اسی قوتِ مؤثرہ اور متأثرہ کا نتیجہ ہیں۔ جو انسانوں میں پیدا کی گئی ہے۔ انسان کی تمام ترقیات اس کی ان قوتوں سے وابستہ ہیں۔ اگر اسمیں قوتِ مؤثرہ اور متأثرہ نہ ہوں۔ تو انسان کبھی وُہ نہ ہو جو اَب ہے۔ وہ ایک عام قانونِ قدرت کے ماتحت ہر اک ارد گرد کی چیز پر اثر کرتا ہے۔ اور اس سے خود متأثر ہوتا ہے۔ اور جب کسی وقت اس تاثیر یا تأثر میں قانون توڑ بیٹھتا ہے۔ تو بیمار ہو جاتا ہے۔ یا تکلیف اٹھاتا ہے۔ پس بیماری کو خدا نے نہیں پیدا کیا۔ بلکہ خدا نے اس قانونِ قدرت کو پیدا کیا ہے جس سے انسان کی ترقی وابستہ ہے۔ اس میں کمی و بیشی کرنے پر انسان خود بیماری کو پیدا کرتا ہے۔ اور بیماری جن قوانین کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنی جگہ چونکہ رحمت کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے بیماریوں وغیرہ کی پیدائش سے بھی خدا تعالےٰ کی ذات پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ جو حال بیماری کا ہے۔ بعینہٖ وہی حال گناہ کا ہے۔ گناہ بھی بیماری کی طرح کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا فقط قانونِ قدرت کے خلاف یا قانونِ شریعت کے خلاف آگے بڑھ جانے یا پیچھے رہ جانے کا نام گناہ ہے پس گناہ کی موجودگی میں بھی اللہ تعالےٰ کی رحمانیت اور اس کی قدوسیت پر اعتراض نہیں پڑ سکتا۔

قرآن کریم میں جس قدر نام گناہ کے آتے ہیں۔ وہ سب کے سب ایسے ہیں۔ کہ جو

یا افراط پر دلالت کرتے ہیں یا تفریط پر۔ کوئی بھی لفظ ایسا نہیں۔ جو اسمائے مُثبتہ میں سے ہو جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن کریم کے نزدیک گناہ کی مستقل حقیقت کوئی نہیں۔ بلکہ نیکی کے عدم کا نام گناہ ہے۔ اور عدم بندے کے فعل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جب وہ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کو چھوڑ دیتا ہے۔ یا دوسرے کے حق کو اٹھا لیتا ہے۔ تو وہ ایک چیز کو معدوم کرنیکا مرتکب ہوتا ہے۔ نہ کہ اثبات کا۔

اس لطیف تعلیم کو جو قرآن کریم نے اس بارہ میں دی ہے کہ باوجود ضرر رسان چیزوں کی موجودگی کے خدا تعالےٰ کی صفات حسنہ پر کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا۔ دوسری کتب ہرگز پیش نہیں کرتیں۔ اور نہ وہ اس طرح دعویٰ کے ساتھ دلیل دیتی ہیں۔ یہ صرف قرآن کریم کا کمال ہے کہ وہ نہ صرف خدا تعالےٰ کی صفات کو بیان کرتا ہے۔ بلکہ انکے متعلق ایسا تفصیلی علم دیتا ہے۔ کہ دل اس کے ذریعہ سے محبت اور اطاعت کے جذبہ سے پُر ہو جاتا ہے۔ اور دماغ سرشار ہو جاتا ہے۔ اور آنکھیں مخمور ہو جاتی ہیں۔ اور تمام شکوک و وساوس بالکل مٹ جاتے ہیں۔ ورنہ اجمالی طور پر اسمائے الٰہی کا بیان کرنا کوئی کمال نہیں ہے

اسی طرح مثلاً خدا کی صفتِ رحم کے خلاف یہ سوال اٹھایا جاتا ہے۔ کہ بڑوں کو تو خیر انکے اعمال کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے۔ بچوں وغیرہ کو کیوں تکلیف ہوتی ہے؟ اس سوال کا جواب بھی مذکورہ بالا جواب میں آگیا ہے۔ یعنی خدا تعالےٰ نے ایک قانون بنایا ہے اور اس قانون میں یہ بات رکھی ہے۔ کہ ہر ایک چیز دوسرے سے اثر قبول کرتی ہے۔ اگر یہ قانون نہ ہوتا تو انسان ناقابل تغیر ہوتا۔ اور جب وہ تغیر کو قبول نہ کرتا۔ تو اب جو وہ ترقیات کر رہا ہے یہ بھی نہ کرتا۔ اسی قانون کے ماتحت بچے وغیرہ اپنے ماں باپ سے اچھی باتیں بھی قبول کرتے ہیں۔ اور بُری باتیں بھی قبول کرتے ہیں۔ صحت بھی ان سے لیتے ہیں۔ اور بیماری بھی۔ اگر بیماریاں یا تکالیف ان کو ماں باپ سے ورثہ میں نہ ملتیں۔ تو اچھی طاقتیں بھی نہ ملتیں۔ اور بجائے انسان کے ایک پتھر کا وجود ہوتا۔ جو بُرے بھلے کسی اثر کو قبول نہ کرتا۔ اور جو غرض انسان کی پیدائش کی ہے۔ وہ باطل ہو جاتی۔ اور انسان کی زندگی جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتی۔ باقی رہا یہ سوال کہ اس تکلیف کا جو ان کو اس قانونِ قدرت کی وجہ سے ملتی ہے۔ ان کو کیا بدلہ ملیگا؟

کیونکہ گو قانونِ قدرت انسان کی ترقی کے لئے ہے۔ مگر پھر بھی بعض لوگوں کو بعض کی غلطیوں کے سبب تکلیف تو پہونچ جاتی ہے۔

اس کا جواب ہماری شریعت یہ دیتی ہے۔ کہ ہر اک وہ تکلیف جو انسان کو ایسے امور کی وجہ سے ملتی ہے۔ جن میں اس کا اپنا دخل نہیں۔ اسکا موازنہ کر لیا جائیگا۔ اور انسان کی روحانی ترقیات کے وقت اس کو مدنظر رکھا جائیگا۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ (اعراف ع ۱) اس جزائے عظیم کے وقت ان امور کو مدنظر رکھا جائیگا۔ جو کسی انسان کی ترقی میں حائل تھے۔ اور جن میں اسکا کوئی دخل نہ تھا۔ ایک دوسری جگہ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ (نساء۔ ع ۱۳) یعنی مومنوں میں سے جو لوگ دین کی خدمت کرتے ہیں۔ اور وہ جو نہیں کرتے وہ برابر نہیں ہو سکتے۔ مگر وہ لوگ جو خدمت میں اس لئے کوتاہی کرتے ہیں۔ کہ ان کو کوئی طبعی نقصان پہونچ گیا ہے۔ انکے متعلق یہ حکم نہیں ہے ان کی اس معذوری کو اللہ تعالےٰ مدنظر رکھیگا۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ما يزال البلاء بالمؤمن و المؤمنة في نفسه و ولده و ماله حتى يلقى الله تعالى و ما عليه خطيئة (ترمذی) مومن مرد ہو یا عورت اسکو کوئی طبعی تکلیف نہیں پہنچتی۔ خواہ نفس کے متعلق خواہ اولاد کے متعلق خواہ مال کے متعلق مگر اس کے بدلہ میں اس کی خطائیں کم ہوتی جاتی ہیں۔ اور ان تکالیف کو برداشت کرنیکے سبب سے انکی رُوح میں پاکیزگی کی ایک ایسی طاقت پیدا ہوتی جاتی ہے کہ جب وہ اللہ تعالےٰ سے ملیں گے۔ تو اسوقت تک پاک ہو چکے ہونگے۔ اس جگہ یہ دھوکا نہ لگے۔ کہ یہ حکم صرف مومنوں کے لئے ہے۔ فائدہ ہر اک کو اپنے حق کیمطابق پہونچتا ہے قرآن کریم کا فیصلہ عام ہے۔ حدیث میں چونکہ مسلمانوں کے سوال کے جواب میں یہ بات بتائی گئی ہے۔ اس لئے ان کو مخاطب کیا گیا ہے۔

اب دیکھو ایک ہی صفت کی تشریح میں مذاہب میں کہاں سے کہاں تک اختلاف پہونچ گیا ہے۔ اسلام نے اس کا مفہوم اور لیا ہے اور بعض دوسرے مذاہب نے

اور انہوں نے صفت رحم کو قائم رکھنے کے لئے تناسخ کا مسئلہ پیش کیا ہے۔ حالانکہ ایک ادنےٰ تدبر سے معلوم ہوسکتا ہے۔ کہ اسلام کی تشریح بالکل طبعی اور قانون قدرت کے مطابق ہے اور دوسری تشریح کی بنا میں بعض ایسے مفروضہ امور پر رکھنی پڑتی ہے۔ جو ثابت نہیں ہیں۔

اللہ تعالےٰ کی صفات عدل اور رحم بھی قابل توجہ ہیں۔ تمام مذاہب خدا تعالےٰ کو عادل بھی مانتے ہیں۔ اور رحیم بھی۔ لیکن تشریح میں بڑا اختلاف ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ ان دونوں صفات میں اختلاف نہیں ہے۔ یہ ایک ہی وقت میں عمل کرسکتی ہیں۔ اور کرتی ہیں۔ عدل رحم کے خلاف نہیں بلکہ اس سے بڑھکر ہے۔ چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ (انعام ع ۲۰) جو نیکی کریگا۔ اسکو دگنا بدلہ ملیگا اور جو بدی کریگا۔ اسکو اتنا ہی ملیگا۔ جتنا اس نے عمل کیا ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائیگا اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ اسلام کے نزدیک کسی کو اس کے حق سے زیادہ اجر دیدینا ظلم نہیں ہے۔ بلکہ اس کے حق سے زیادہ سزا دینا ظلم ہے۔ اور اس میں کیا شک ہے۔ کہ ظلم کہتے ہیں کسیکو اس کے حق سے زیادہ سزا دیدینے یا اس کے حق سے کم اجر دینے یا اسکا حق کسی اور کو دیدینے کو۔ اور یہ کام کبھی اللہ تعالےٰ نہیں کرتا۔ نہ کبھی کسیکو اس کے حق سے زیادہ سزا دیتا ہے۔ نہ اسکے اجر کو کم کردیتا ہے نہ کسی کا حق کسی اور کو دیدیتا ہے۔ بلکہ وہ جو کچھ کرتا ہے۔ یہ ہے۔ کہ وہ ایک نادم اور پشیمان بندے کو جو اپنی غلطی کو محسوس کرکے اپنے بداعمال کو ترک کرکے ایک دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہونٹوں اور چشمہ کیطرح جاری آنکھوں اور شرمندگی سے جھکی ہوئی گردن کے ساتھ اور آیندہ کے لئے کامل پاکیزگی اور طہارت کے خیالات سے جو متلاطم سمندر کی لہروں کیطرح جوش مار رہے ہوتے ہیں پُر دماغ سے اللہ تعالےٰ کے عرش پر جا کھڑا ہوتا ہے معاف کرکے نئی زندگی شروع کرنیکا موقعہ دیتا ہے۔ اور اس باپ کیطرح جسکا بچہ آوارہ ہوگیا تھا اور مدت کے بعد پشیمان ہوکر واپس گھر کو آیا تھا۔ اور اپنے کئے پر ایسا پشیمان تھا۔ کہ باپ کے سامنے آنکھیں نہیں اٹھا سکتا تھا۔ محبت کے جذبات سے لبریز ہوکر اپنے سینہ سے لگا لیتا ہے اور اسکو دھتکارتا نہیں۔ بلکہ اس کے واپس لوٹنے پر خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ کیا باپ کے

اس فعل پر دوسرے بیٹوں کو جو اپنے باپ کی خدمت میں لگے ہوئے تھے کوئی شکوہ کا موقعہ ہے؟ کیا انکے لئے کسی اعتراض کی گنجائش ہے؟ بخدا نہیں اور ہرگز نہیں۔

بیشک سزا ایک بہت بڑا ذریعہ اصلاح کا ہے لیکن سچی ندامت اور حقیقی پشیمانی سے زیادہ سزا دوزخ کی آگ نہیں ہوسکتی۔ جو کام دوزخ کی آگ لاکھوں سالوں میں کرسکتی ہے سچی ندامت وہ کام منٹوں میں کرجاتی ہے۔ اور جب کوئی شخص سچے طور پر اپنی بدیوں سے توبہ کرکے اور آیندہ کی اصلاح پر آمادہ ہوکر خدا تعالےٰ کے سامنے حاضر ہو تو اللہ تعالیٰ کی رحیمیت کا تقاضا ہے۔ کہ اس پر رحم کرے کیا رحیم و کریم خدا اپنے ایک عاجز بندے کو جو امید و آرزو کا مجسم نمونہ بن کر اور اپنے افعال سے بیزار ہوکر اس کی رحمت کے آستانے پر نڈھال ہوکر گرجاتا ہے۔ دھتکار دے۔ اور اس کی طرف سے منہ پھیر لے؟ نہیں بخدا ہرگز نہیں۔

سب سے آخر میں میں اس صفت کو لیتا ہوں۔ جو سب صفات سے زیادہ مشہور ہے لیکن جس میں تفصیلاً سب سے زیادہ اختلاف ہے۔ یہ صفت احدیت کی صفت ہے دنیا میں آجکل ایک مذہب بھی نہیں جو دو خداؤں یا اس سے زیادہ خداؤں کا قائل ہے توحید کے مسئلہ پر اصولی طور پر سب مذہب متفق ہوچکے ہیں بلکہ ایک مذہب کے پیرو دوسرے مذہب کے پیرووں کے خلاف یہ حربہ چلاتے ہیں کہ یہ پوری طرح توحید کے قائل نہیں ہیں۔ میں نے بعض یوروپین مصنفین کی کتب دیکھی ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں۔ کہ مسلمان مشرک ہیں۔ اور میں نے سنا ہے۔ کہ یورپ اور امریکہ میں بہت سے لوگ جو اسلامی لٹریچر سے ناواقف ہیں۔ یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ مسلمان رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پرستش کرتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عام طبائع اس امر کو محسوس کرتی ہیں۔ کہ اب ایک سے زیادہ خداؤں کا مسئلہ پیش کرنا بالکل ناممکن ہے۔ دنیا اس کو سننے کے لئے تیار نہیں۔ مگر باوجود توحید کے لفظ پر سب مذاہب کے اجتماع کے توحید کے متعلق تمام مذاہب میں اختلاف ہے۔ اور کئی مذاہب ہیں جو توحید کے نام کے نیچے ہر قسم کا شرک چھپائے بیٹھے ہیں۔ مگر اسلام شرک سے کلی طور پر پاک ہے۔ اس نے ہر قسم کی مشرکانہ باتوں کا کلی استیصال کیا ہے۔ اور شرک کی اصل حقیقت کو کھولکر سامنے رکھدیا ہے جسکی وجہ سے کسی کو دھوکا نہیں لگ سکتا۔ چنانچہ قرآن کریم شرک کو

چار قسم میں تقسیم کرتا ہے۔ایکؔ قسم شرک کی تو فرماتا ہے کہ نِدّ بنانا ہے یعنی یہ یقین کر لینا کہ خدا کی طرح کوئی اور خدا بھی ہے۔ جو اسکے ساتھ ذات میں شریک ہے۔

دوسرےؔ شریک قرار دینا یعنی یہ خیال کرنا کہ کوئی ہستی اللہ تعالےٰ کی صفات میں سے سب یا بعض میں اس کے ساتھ شریک ہے۔ خواہ اسکو معبود بنایا جائے یا نہ بنایا جائے مثلاً یہ سمجھ لیا جائے کہ فلاں انسان مخلوق پیدا کر سکتا ہے۔ یا مردے زندہ کر سکتا ہے گو کسی شخص کو انسان قرار دیکر ہی یہ صفات اسکی طرف منسوب کی جائیں۔ مگر یہ شرک ہوگا کیونکہ صرف نام کا فرق ہے حقیقتاً اس شخص کو خدا ہی قرار دیا گیا ہے۔

تیسریؔ قسم کا شرک کسی کو الٰہ قرار دینا ہے۔ یعنی کسی کی خدا کے سوا عبادت کرنی خواہ اسکو خدا نہ ہی سمجھا جائے۔ یا خدا تعالےٰ کی صفات میں شریک قرار نہ دیا جائے جیسے کہ پرانے زمانہ میں بعض اقوام میں ماں باپ کی عبادت کیجاتی تھی۔

چوتھےؔ کسی کو رب قرار دینا یعنی کسی بزرگ یا پیر کو ایسا سمجھ لینا۔ کہ وہ بشریت کی غلطیوں سے بھی پاک ہے۔ اور وہ جو کچھ حکم دے خواہ وہ کیسا ہی برا ہو۔ اسکا ماننا ضروری ہے اور کسی بندہ کی بات کو خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو خدا تعالےٰ کی بات پر عملاً مقدم کرنا خواہ اعتقاداً اسکو خدا نہ سمجھے۔ قرآن کریم میں ان چاروں قسموں کے شرکوں کا ذکر اس آیت میں فرمایا ہے۔

يَآاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (آل عمران۔ ع ۷) یعنی اے اہل کتاب اس امر میں تو ہم سے اتفاق کرو جس میں تم اور ہم اجمالاً متفق ہیں یعنی صرف اس خدا کی جسکا شریک فی الجوہر کوئی نہیں عبادت کریں۔ اور کسی کو اس کی صفات میں شریک نہ کریں۔ اور بندوں میں سے کسی کی بات کو اس کے حکم پر مقدم نہ کریں۔ اگر یہ لوگ بات نہ مانیں۔ تو کہدو کہ ہم تو اس رنگ میں خدا کے فرمانبردار ہو کر رہینگے۔ غور کرو کس طرح تمام اقسام شرک خواہ بڑی ہوں خواہ چھوٹی اس مختصر سے کلام میں جمع کر دی ہیں۔ اس حکم کے ماتحت جب ایک مسلمان یہ کہتا ہے۔ کہ وہ ایک خدا کا قائل ہے۔ تو وہ اس لفظ کے وہی معنے لیتا ہے جو زبان

میں اس فقرے کے معنے ہوتے ہیں۔ وہ سوائے ایک خدا کے کسی کی عبادت نہیں کرتا وہ اس کی صفات کسی اور کو نہیں دیتا۔ وہ اس کو ہر ایک قسم کی رشتہ داریوں سے پاک قرار دیتا ہے۔ وہ اسے حلول اور اوتار بننے کی حالتوں سے بالا سمجھتا ہے۔ وہ اسے موت اور بھوک اور پیاس کے جذبات سے خواہ بطور تنزل ہی کیوں نہ ہوں۔ پاک سمجھتا ہے۔ اس کا ماتھا کسی اور کے آگے نہیں جھکتا۔ وہ اپنی امیدوں کا ماویٰ اور کسی کو نہیں بناتا۔ وہ دعاؤں میں اور کسی کو مخاطب نہیں کرتا۔ وہ خدا کے نبیوں کا بڑا ادب کرنیوالا ہے لیکن وہ انکو بھی خدا تعالےٰ کے مقابلہ میں انسانوں جیسا انسان خیال کرتا ہے اور یہی تعلیم ہے جو اسلام اسے دیتا ہے اور جس پر عمر بھر چلنے کی اُسے تاکید کرتا ہے۔ اب اجمالاً تو سارے ہی مذہب اس کے ساتھ توحید باری کے اقرار میں متفق ہیں لیکن تفصیلات میں ہر اک اپنا الگ الگ راستہ لے لیتا ہے اور سب مذاہب میں ایک عظیم الشان تعدد پیدا ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام کی تعلیم اللہ تعالےٰ کی صفات کے متعلق نہایت مکمل ہے۔ کیا بلحاظ اجمال کے اور کیا بلحاظ تفصیل کے اور اس تعلیم سے جو رغبت انسان کے دل میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور کسی مذہب کے ذریعہ وہ رغبت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور مزید خوبی یہ ہے۔ کہ اسلام تفصیل کے ساتھ ہر اک صفت کا ذکر کرتا ہے۔ اور اس کا جو اثر روزانہ زندگی کے حالات پر پڑتا ہے اس کو بیان کرتا ہے۔ اور مختلف صفات کے آپس میں تعلقات اور انکے اثر کی حد بندیوں کو بھی بیان فرماتا ہے۔ یہانتک کہ خدا تعالیٰ کا وجود بندہ کی عقل کی آنکھوں کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ اور اس کا دل خدا کی محبت سے لبریز ہو کر بہ پڑتا ہے۔ اور اس کے ساتھ صفاتِ الٰہیہ کے بیان کرنے میں جو دوسرے مذاہب کو اشتراک ہے وہ صرف نام کا ہے نہ حقیقت کا حالانکہ اصل چیز حقیقت ہوتی ہے۔ نہ کہ محض نام۔

دُوسرا سوال

خدا سے بندہ کا تعلق

ذات و صفاتِ باری کے متعلق جو اسلام کی تعلیم ہے۔ اس کو مختصراً بیان کر دینے کے

بعد اب میں مقصد اوّل کے دوسرے سوال کو لیتا ہوں۔ جو یہ ہے۔ کہ بندے کو خدا سے کیا تعلق ہونا چاہیئے؟

یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ صرف کسی چیز کو مان لینا اور بات ہے تمام تعلیم یافتہ لوگ نارتھ پول اور ساؤتھ پول کے وجود پر یقین رکھتے ہیں لیکن ان سے تعلق سوائے ان چند لوگوں کے جو اُن علاقوں کی مزید تحقیقات میں مشغول ہیں کسیکو نہیں ہے۔ انکے ذکر سے انکے جذبات میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی لیکن ایک ایسے شخص کے ذکر سے جو ان سے کوئی حقیقی تعلق رکھتا ہے۔ انکے جذبات بیکدم بھڑک اٹھتے ہیں پس یہی سوال ہے۔ کہ کوئی مذہب اپنے پیرؤں سے خدا تعالےٰ کے متعلق کس قسم کے تعلق کا مطالبہ کرتا ہے۔ کیونکہ اسی مطالبہ کے معیار پر کسی مذہب کی سچائی یا اس کی غلطی یا اس کی قبولیت یا اس کی ناکامی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر وہ ایسا مطالبہ اپنے متبعین سے کرتا ہے۔ جو خدا تعالےٰ کی شان کے خلاف ہے۔ تو ماننا پڑیگا۔ کہ صفات الٰہیہ پر حقیقی ایمان نہیں رکھتا۔ اور اگر مطالبہ تو صحیح ہے لیکن اس کے پیرو اس مطالبہ کو پورا نہیں کرتے۔ تو ماننا پڑے گا کہ وہ مذہب اپنے مقصد کے پورا کرنے میں ناکام رہا ہے۔

میں جو اللہ تعالےٰ کی صفات پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اور جن پر تمام مذاہب قریبًا متفق ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارا اصل تعلق اللہ تعالےٰ سے ہی ہے کیونکہ ہمارے آرام اور ہماری ترقی اور ہماری کامیابی کے سب سامان اسی نے پیدا کئے ہیں۔ ہماری ہستی کے وجود میں لانیکا بھی وہی باعث ہے۔ اور ہماری آئندہ زندگی بھی اسی کے فضل سے وابستہ ہے۔ اس سے بڑھکر نہ ہمارے والدین ہو سکتے ہیں۔ نہ ہماری اولاد۔ نہ ہمارے بھائی۔ نہ ہماری بیویاں نہ ہمارے خاوند۔ نہ ہمارے دوست نہ ہمارے اہل ملک۔ نہ ہماری حکومت۔ نہ ہمارا ملک۔ نہ ہماری جائداد۔ نہ ہمارا عہدہ۔ نہ ہماری عزت نہ خود ہماری جان۔ کیونکہ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے عطیوں کا ایک جزو ہیں۔ اور وہ اس کُل کا معطی ہے۔ درحقیقت ان صفات کو بیان کرنے کے بعد جو اُوپر بیان ہو چکی ہیں۔ وہی مذہب سچا ہو سکتا ہے۔ جو انسان سے یہ مطالبہ کرے۔ کہ وُہ خدا تعالےٰ کی محبت اور اس کے ادب کو سب چیزوں کی محبت اور سب حاکموں کے ادب پر فوقیت دے۔ اور خدا کی رضا کے لئے سب چیزوں کو قربان کرنا پڑے تو کر دے۔ مگر خدا کی

رضا کو کسی اور چیز پر قربان نہ کرے۔ وہ اس امر کا مطالبہ کرے کہ خدا تعالےٰ کی محبت انسان کے دل میں سب چیزوں سے زیادہ ہونی چاہیئے اور اسکی یاد سب پیاروں کی یاد سے بڑھکر ہونی چاہیئے۔ اس کے وجود کو ایک دور کے ملک کے پہاڑ یا دریا کیطرح عالم موجودات کا ایک فرد نہیں سمجھ چھوڑنا چاہیئے بلکہ اس کو ہر ایک زندگی کا سرچشمہ اور ہر ایک امید کا مرکز اور ہر ایک نظر کا مطمح بنانا چاہیئے۔

اسلام یہی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (توبہ ع۳) اے ہمارے رسولؐ! کہدے اگر تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد اور تمہارے بھائی بہنیں اور تمہاری بیویاں یا تمہارے خاوند یا تمہاری قوم یا تمہارے مال جنکو تم محنتوں سے کماتے ہو۔ یا تمہاری تجارتیں جنہیں نقصان ہو جانیکا تمہیں خطرہ ہوتا ہے یا تمہارے گھر جن کو تم پسند کرتے ہو۔ اللہ اور اسکے رسُول اور اللہ کی رضا کے لئے کوشش کرنے کی نسبت تمہیں زیادہ پیارے ہیں تو تم مومن نہیں ہو۔ تم انتظار کرو اس وقت کا جب خدا تعالیٰ تمہارے متعلق کوئی فیصلہ کرے۔ اور اللہ عہد شکن لوگوں کو کامیاب نہیں کیا کرتا۔

ایک مسلمان ہرگز مسلمان نہیں کہلا سکتا جب تک اس کا اللہ تعالےٰ سے ایسا ہی تعلق نہ ہو جو اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ اسے خدا کی رضا کیلئے ہر ایک دیگر چیز اور ہر ایک دوسرے جذبہ کو قربان کر دینا چاہیئے، اس کی محبت ہر ایک دوسری چیز پر اسے مقدم ہونی چاہیئے ایک دوسری جگہ پر اللہ تعالیٰ محبت الٰہی کی علامت کا اس طرح ذکر فرماتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آل عمران ع۲۰) مومن وہ ہیں۔ جو خدا تعالیٰ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ کھڑے بھی اور بیٹھے بھی اور لیٹے ہوئے بھی۔ یعنی اللہ تعالےٰ کی محبت ان کے دلوں میں ایسی گھر کر جاتی ہے، کہ وہ بار بار اس کی ملاقات اور اس کے قرب کی خواہش کرتا ہے۔ اور جس طرح ایک عاشق اپنے معشوق کو ہر وقت یاد کرتا رہتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ ایسا انسان اللہ تعالےٰ کی یاد میں مشغول رہتا ہے۔ اس کے احسانات

اوراس کی خوبیاں اوراس کے قرب کی تمنا اوراس سے ایک ہوجانیکی خواہش اسکے دل میں بار بار جوش مارتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ دن کو کام کیوقت یا آرام کی خاطر بیٹھنے کیوقت یارات کو سوتے وقت بھی اس کیطرف بندہ کی توجہ پھرتی رہتی ہے۔

اسیطرح فرماتا ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ (انفال ع ۱) مومن صرف وہ لوگ ہیں جن کے دل پر خداتعالےٰ کا ایسا رعب ہوتا ہے کہ اگر خداتعالیٰ کا نام ان کی مجلس میں آجائے تو انکے دلونمیں خشیت اللہ کی ایک لہر پیدا ہوجاتی ہے اور جب اللہ تعالےٰ کا کلام ان کے سامنے پڑھا جائے۔ تو انکا دل ایمان سے بھر جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں یعنی ہراک کام کا سرانجام پانا اسی کی مدد پر موقوف سمجھتے ہیں اور اپنی کامیابیوں کو اسی کے فضل پر منحصر خیال کرتے ہیں۔

میں اسجگہ ایک شبہ کا ازالہ کردینا مناسب سمجھتا ہوں۔ جو عام طور پر اسلام کی نسبت کیا جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اسلام اس امر کی تعلیم دیتا ہے۔ کہ اسباب سے انسان کو کوئی کام ہی نہیں لینا چاہئے اور اپنے کام خدا پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ بعض لوگونمیں ایسے خیالات پائے جاتے ہیں۔ مگر اسلام کی ہرگز یہ تعلیم نہیں۔ تمام قرآن ان آیات سے بھرا ہوا ہے۔ کہ دنیا کی نعمتیں ہم نے انسان کے فائدہ کے لئے پیدا کی ہیں پس ان کو ترک کرنا اس کے منشاء کے مطابق کسطرح ہوسکتا ہے۔ اور ایک جگہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا (بقرہ۔ ع ۲۴) اور ہراک کام کے لئے ہم نے جو طریق مقرر کئے ہیں۔ انکے ذریعہ سے وہ کام کرو۔ یعنی اسباب اور ذرائع بھی اللہ تعالےٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ انہی کے ذریعہ سے کام کرنا چاہئے اور فرمایا خُذُوْا حِذْرَکُمْ (نساء ع ۱۰) اے مسلمانو! تمام وہ سامان جن سے کامیابی ہوسکتی ہے اپنے پاس رکھو۔ اور ایک جگہ فرماتا ہے۔ فَتَزَوَّدُوْا (بقرہ ع ۲۵) جب سفر کو نکلو تو اپنے پاس سفر کا سامان ضرور رکھا کرو۔ اسیطرح رسول کریم صلعم کی نسبت آتا ہے۔ کہ ایک شخص آپکے پاس آیا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ تو نے اونٹ کس کے حوالے کیا ہے۔ اس نے کہا یا رسول اللہ میں نے خدا پر توکل کرکے اسکو چھوڑ دیا ہے۔ آپنے فرمایا یہ توکل نہیں ہے۔ توکل یہ ہے۔ کہ تو پہلے اونٹ کا گھٹنا باندھ

پھر خدا پر توکل کر۔ آپؐ کا مطلب یہ ہے۔ کہ توکل ترک اسباب کا نام نہیں بلکہ اس امر پر یقین کا نام ہے کہ خداتعالےٰ ایک زندہ خدا ہے۔ وہ دنیا کو پیدا کرکے خالی ہاتھ ہوکر نہیں بیٹھ گیا۔ بلکہ اب بھی اس کا حکم دنیا میں چلتا ہے۔ سب کاموں کے نتیجے اسی کے حکم سے نکلتے ہیں۔ وہ اس بندے کی جو اس پر یقین رکھتا ہے۔ اس وقت حفاظت کرتا ہے جب وہ غافل ہوتا ہے اور اسحالت میں اسکے کام کی نگرانی کرتا ہے۔ جب وُہ سامنے نہیں ہوتا۔

غرض اس امر پر یقین کرنیکا نام کہ خداتعالیٰ اب بھی اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے۔ اور ان کی بیکسی کی حالتوں میں اس کا ساتھ دیتا ہے۔ اور باوجود سامانوں کی موجودگی کے اگر اسکا غضب نازل ہو۔ تو کوئی کامیابی نہیں ہوسکتی توکل ہے نہ ترک اسباب کا۔ گویا توکل ایک دلی حالت کو کہتے ہیں۔ نہ کسی ظاہری عمل یا ترک عمل کو۔

اسی طرح ایک جگہ فرماتا ہے۔ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ (توبہ ع ۹) اللہ تعالےٰ کی رضا سب سے مقدم ہے۔ یعنی بندہ کو خداتعالےٰ سے تعلق کی بنیاد کسی دنیوی یا اُخروی انعام پر نہیں رکھنی چاہئے۔ بلکہ جو چیز اس کے مدنظر ہونی چاہئے۔ وہ محض اللہ تعالےٰ کی رضا ہے۔ جب خداتعالےٰ اس کا محبوب ہو۔ تو اس کی رضا پر کسی اور چیز کو مقدم کرنا اپنی محبت کی ہتک کرنا ہے۔

مذکورہ بالا حوالوں سے جو صرف بطور نمونہ دیئے گئے ہیں۔ یہ اچھی طرح معلوم ہوسکتا ہے۔ کہ اسلام بندہ سے خداتعالےٰ سے کس قسم کا تعلق رکھنے کی امید کرتا ہے۔ اور جہانتک میرا خیال ہے۔ ہر ایک شخص جو خداتعالےٰ کو فی الواقعہ مانتا ہے اس امر میں ہم سے متفق ہوگا۔ کہ اگر کوئی خدا ہے۔ تو اس سے ہمارا ایسا ہی تعلق ہونا چاہئے۔

تیسرا سوال

یعنی کن اعمال سے بندہ اپنے تعلق باللہ کا اظہار کرے؟ یا یہ کہ خداتعالےٰ کی طرف سے بندہ پر کیا کیا ذمہ واریاں ہیں؟

دوسرے سوال کا جواب دینے کے بعد میں تیسرے سوال کو لیتا ہوں۔ اس سوال کا جواب مختلف

مذاہب نے مختلف طور پر دیا ہے۔ اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس سوال کے متعلق مختلف مذاہب کا پہلے سوالوں کی نسبت زیادہ اختلاف ہے۔ اسلام اس سوال کا یہ جواب دیتا ہے اور یہی طبعی جواب ہے کہ انسان کو چاہئے۔ کہ اس غرض کو پورا کرے جس غرض کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی معیت تلاش کرے اور اس کا کامل عبد بنے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚۖ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ ؗ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (مومن۔ ع ۷) یعنی اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو ایسا بنایا ہے۔ کہ اس میں تمہاری ضرورتوں کے سب سامان مہیا ہیں۔ اور آسمان کو تمہارے لئے موجب حفاظت بنایا ہے۔ اور تم کو شکلیں دی ہیں۔ اور ایسی شکلیں دی ہیں۔ جو تمہارے کام کے بالکل مطابق ہیں۔ اور پاکیزہ رزق تم کو عطا کیا ہے۔ یہ تمہارا خدا ہے بس کیا ہی برکت والا ہے۔ یہ خدا جو صرف تمہارا ہی رب نہیں۔ بلکہ سب مخلوقات کا رب ہے۔ وہ زندہ ہے۔ اور دوسروں کو زندگی بخشتا ہے۔ اسکے سوا کوئی معبود نہیں پس اس کو پکارو۔ اس طرح کہ سوائے اس کے اور کسی کی عبادت نہ کرو۔ سب تعریف اس خدا کے لئے ہے۔ جو سب مخلوق کا رب ہے۔ تو کہدے مجھے منع کیا گیا ہے۔ کہ میں اُنکی عبادت کروں جنکو تم خدا کے سوا پکارتے ہو۔ بعد اسکے کہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے کھلے کھلے نشان آچکے ہیں۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے۔ کہ میں سب جہانوں کے رب کا پورا فرمانبردار ہو جاؤں۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ اس قلبی تعلق کے علاوہ جس کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ اپنے بندے سے ظاہری اعمال میں بھی اپنے احکام کی فرمانبرداری چاہتا ہے۔ یہ احکام جیسا کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کئی قسم کے ہیں۔ مگر اس جگہ میں صرف ان احکام کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جو عبادت سے تعلق رکھتے ہیں یعنی جن میں اللہ تعالےٰ کے حضور میں اظہار عبودیت کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ بنی نوع انسان کے ساتھ ان کا براہ راست تعلق نہیں۔

یہ اعمال اسلام نے پانچ قسم کے مقرر کئے ہیں۔ (۱) نماز (۲) ذکر (۳) روزہ (۴) حج (۵) قربانی:۔ اور ان پانچوں قسم کے احکام میں تمام مذاہب میں قریبًا اشتراک پایا جاتا ہے یعنی ان میں ان پانچوں قسم کی عبادتوں کا وجود پایا جاتا ہے۔ گو طریق عبادت مختلف ہیں۔ جدید تحقیق جو پرانے مذاہب کے متعلق ہو رہی ہے۔ وہ اور نئے نئے مذاہب کو ان مذاہب کی صف میں لا کھڑا کر رہی ہے جنہیں مذکورہ بالا پانچ قسم کی عبادات پائی جاتی ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے۔ کہ جبکہ نئی تحقیقات اس امر کو ثابت کر رہی ہیں۔ کہ ان عبادات کا پتہ سب مذاہب میں ملتا ہے خیالات کی جدید رَو اس طرف جا رہی ہے۔ کہ ان عبادات کا کوئی فائدہ نہیں۔ خدا تعالیٰ کا ہرگز یہ منشاء نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے بندوں کو ان ظاہری شکلوں میں جکڑے۔ اور اسکا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ آج ہم دیکھتے ہیں۔ کہ دنیا میں سے ظاہری عبادات کا اثر بہت کچھ مٹتا جاتا ہے۔ اور اکثر مذاہب کے پیرو ظاہری عبادات کو بالکل ترک کرتے چلے جاتے ہیں۔ مگر اسلام جس طرح ہر زمانہ کی ضروریات کے لئے تعلیمات کا ذخیرہ رکھتا ہے۔ اسیطرح اس کی یہ شان بھی ہے۔ کہ اسکی قائم شدہ تعلیم بدلتی نہیں۔ وہ ایک چٹان کی طرح ہے جسے زمانہ کے سیلاب اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتے۔ وہ نیچر کی طرح نئے سے نئے انکشافات تو کرتا ہے مگر نیچر کی طرح اسمیں یہ خاصیت بھی ہے۔ کہ اس کا کوئی قانون بدلتا نہیں۔ کیونکہ اس کے سب قوانین کی بنیاد عالم الغیب ہستی کی طرف سے حق اور حکمت پر رکھی گئی ہے۔

یاد رکھنا چاہئے۔ کہ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ تعلق کی بنیاد دل پر ہے۔ اگر دل گندہ ہو۔ اور محبت سے خالی ہو۔ تو ظاہر میں کتنی ہی فروتنی دکھائی جائے یا اخلاص کا اظہار کیا جائے اسکا کوئی فائدہ نہیں۔ بلکہ ایسا فعل ایک لعنت ہے۔ جو اپنے مرتکب کو تاریکی کے عمیق گڑھوں میں گرا دیتا ہے۔ قرآن کریم نہ صرف اس نکتہ کو تسلیم کرتا ہے۔ بلکہ اس پر خاص طور سے زور دیتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝ (سورۃ ماعون) یعنی خدا تعالیٰ کا غضب نازل ہو گا۔ ان لوگوں پر جو عبادت تو کرتے ہیں مگر اسکی حقیقت سے غافل ہیں اور صرف لوگوں کے دکھاوے کیلئے نماز پڑھ لیتے ہیں۔ اسی طرح فرماتا ہے کہ جو لوگ صدقات دکھاوے کے طور پر دیتے ہیں۔ مگر دل میں کوئی اخلاص نہیں ہوتا ہے فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ

صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ (بقرہ۔ ع ۳۶) انکی حالت اس پتھر کیطرح ہوتی ہے جس پر مٹی جمی ہوئی ہو۔ اور جب بارش اس پر پڑے تو بجائے اسکے کہ دانہ اُگے وہ مٹی کو بھی بہا دیتی ہے۔ اور دانہ اُگنے کا احتمال بھی باقی نہیں رہتا۔ اس قسم کا صدقہ دینے والا بھی بجائے کسی فضل کا وارث ہونیکے اپنی حالت کو اور بھی خراب کر لیتا ہے۔ پس اسلام کے نزدیک جبتک دل ساتھ نہو اسوقت تک عبادت نفع نہیں دیتی لیکن اسلام اس امر پر بھی زور دیتا ہے۔ کہ دل کے ساتھ زبان اور جسم بھی عبادت میں شامل ہونے چاہئیں۔

قرآن کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے بالکل واضح طور سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایمان کا کمال تین چیزوں یعنی دل اور زبان اور جوارح کے ایک ہوجانے سے پیدا ہوتا ہے جس شخص کا دل سچائی کو قبول نہیں کرتا۔ اور زبان اور جوارح ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ بھی منافق ہے۔ اور جسکا دل ایمان پر قائم ہے لیکن زبان اور جوارح مخالف ہیں۔ وُہ بھی جھوٹا ہے سچا شخص وہی ہے جسکا دل بھی ایمان پر قائم ہو۔ اور زبان اور جوارح بھی اس کے ساتھ شامل ہوں۔

ہم دیکھتے ہیں۔ کہ جب کسی انسان کو کسی شخص سے پیار ہو۔ تو اس کے سامنے آنے یا اس کا ذکر آجانے سے اس کے چہرہ پر فوراً ایک خاص قسم کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ اور ایک اجنبی شخص بھی جان لیتا ہے۔ کہ اس کے دل میں اس دوسرے کی نسبت محبت ہے۔ ماں باپ اپنے بچوں کو پیار کرتے ہیں تو کیوں؟ کیا انکے دل کی محبت کافی نہیں ہوتی؟ وہ اپنے بچہ کو کس لئے چومتے ہیں؟ کس لئے اپنی گود میں اُٹھاتے ہیں؟ لوگ اپنے دوستوں سے مصافحہ کیوں کرتے ہیں؟ یورپ کے لوگ جب بادشاہوں کے سامنے حاضر ہوتے ہیں تو سر ننگا کر دیتے ہیں۔ یا ان کے سامنے گھٹنا ٹیکتے ہیں۔ ایسا کیوں کیا جاتا ہے؟ کیا ان مواقع پر دل کی محبت اور دل کا اخلاص کافی نہیں ہوتا؟ اگر کہا جائے کہ انسان چونکہ دلی حالت کو نہیں جانتا اسلئے اس کو دل کا حال بتانیکے لئے ظاہر میں بھی بعض نشانات ایسے قرار دیئے گئے ہیں۔ جن سے کہ دل کی محبت کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔ اور ان کے ذریعہ سے دوسرے کو معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ فلاں شخص مجھ سے محبت رکھتا ہے مگر یہ جواب درست نہیں۔ کیونکہ ہر اک شخص جانتا ہے کہ جب وہ اپنے بچہ کو

پیار کرتا ہے یا اپنے کسی عزیز یا دوست کی طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے۔ تو اس وقت اس کا یہ فعل اس خیال کے ماتحت نہیں ہوتا۔ کہ وہ اس پر اپنی محبت کا اظہار کرے کیا نوزائیدہ بچے کو جو بالکل سمجھ نہیں رکھتا۔ ماں پیار نہیں کرتی؟ یا سوئے بچہ کو والدین بسا اوقات پیار نہیں کرتے؟ پس معلوم ہوا۔ کہ محبت کو جسمانی علامات کے ذریعہ سے ظاہر کرنا ایک طبعی تقاضا ہے۔ نہ کہ دل کی حالت جتانے کا ایک ذریعہ پس جو شخص خدا تعالےٰ سے محبت رکھتا ہے اور فی الواقع اسکی طرف اسکے دل میں کشش ہے۔ کسطرح ممکن ہے۔ کہ اعمال اور زبان کے ذریعہ سے اسکی محبت ظاہر ہونیکی کوشش نہ کرے۔ اور یہی غرض ہے جو مذہب نے عبادات میں رکھی ہے۔ عبادت اس قلبی تعلق کا ایک ظاہری نشان ہے۔ اور جو شخص سچے طور سے خدا تعالےٰ سے محبت رکھتا ہے وہ باوجود دوسری چیزوں کی محبت کو جسمانی علامات کے ذریعہ سے ظاہر کرنیکے عبادت کے متعلق کسطرح اعتراض کر سکتا ہے۔ عبادت پر اعتراض درحقیقت محبت کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

گو مذکورہ بالا وجہ عبادات کی حقیقت کے سمجھانے کیلئے کافی تھی۔ مگر اسلام نے اس سے بڑھکر حکمتیں عبادت میں مدنظر رکھی ہیں جنمیں سے ایک یہ ہے۔ کہ قرآن کریم فرماتا ہے کہ ظاہری اعمال کا اثر باطن پر پڑتا ہے۔ اور باطن کا ظاہر پر۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ؕ (الحج ع ۴) جو شخص ان مقامات کا ادب کرتا ہے جہاں اللہ تعالےٰ کے جلال کا اظہار ہوا تھا۔ تو ایسا ہونا ہی چاہیئے کیونکہ دل کی خشیت کا ظاہر پر اثر ہوتا ہے۔ اس جگہ دلی پاکیزگی کے ظاہر پر طبعی طور پر اثر پیدا کر دینے کا ذکر ہے۔ دوسری جگہ پر ظاہر کے باطن پر اثر ہونیکا یوں ذکر فرماتا ہے۔ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (المطففین ع ۱) خبردار ہو جاؤ۔ کہ ان لوگوں کے دلوں میں بوجہ ان کے ظاہری اعمال کے نقص پیدا ہو گیا ہے۔ پہلے یہ اپنے فوائد کے لئے ظاہری حق کے خلاف کرتے رہے۔ آخر نتیجہ یہ نکلا کہ دل سے بھی حق کی محبت دُور ہو گئی۔

علم سائیکالوجی کے ذریعہ سے مذکورہ بالا حقیقت آجکل بالکل یقینی طور پر ثابت ہو چکی ہے میں نے ایک امریکن سائیکالوجسٹ کی کتاب میں پڑھا ہے۔ کہ ایک امریکن کالج کا پرنسپل جو پہلے نہایت لائق سمجھا جاتا تھا۔ پرنسپل ہو کر نہایت ناقابل ثابت ہوا۔ آخر

اسے ایک دوست نے مشورہ دیا۔ کہ اسکا منہ کھلا رہتا ہے۔ اگر وہ منہ کو بند کرنے کی عادت ڈالے تو اس سے اسکے اخلاق پر بھی اثر پڑیگا۔ اور طبیعت میں انتظام کا مادہ زیادہ ہو جائیگا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کرنا شروع کیا۔ اور آخر اس کی بے استقلالی جاتی رہی۔ اور وہ نہایت کامیاب پرنسپل ہو گیا ہم روزمرہ کے معاملات میں بھی دیکھتے ہیں۔ کہ اگر کوئی شخص غصہ کی شکل بنالے۔ تو تھوڑی دیر میں اس کے دل میں غصہ کے خیالات جوش میں آنے لگتے ہیں۔ اگر غصہ کی حالت میں کسی کو گدگدی کرکے یا اور کسی طرح ہنسا دیا جائے۔ تو دیکھا جاتا ہے۔ کہ اسکے دل کا غصہ بھی جاتا رہتا ہے۔ رونے کی شکل بنانے سے دل میں غم کے جذبات اور ہنسی کی شکل سے فرحت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی حکمت کو مدنظر رکھکر شریعت اسلام نے نماز وغیرہ ظاہری عبادات مقرر کی ہیں۔ کہ جب انسان ظاہر میں خشوع اور خضوع کی حالت اختیار کرتا ہے۔ تو آہستہ آہستہ اس کے دل میں ایک محبت کا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے۔ اور آخر وہ اس طرح خدا تعالیٰ کی طرف کھنچا جاتا ہے جس طرح کہ مقناطیس کی کشش سے لوہا کھینچا جاتا ہے۔

ایک حکمت ظاہری عبادت میں یہ بھی ہے۔ کہ اس سے قومی روح پیدا ہوتی ہے۔ بچے یہ سبق کہ اپنے بھائیوں سے اور رشتہ داروں سے محبت کرنی چاہیئے۔ انہی ظاہری تعلقات کو دیکھکر سیکھتے ہیں جو وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کے برتاؤ سے معلوم کرتے ہیں۔ اگر محبت اور غضب کے جذبات صرف قلب میں مخفی ہوتے۔ تو کبھی بھی یہ عام رشتہ محبت کا جو رشتہ داروں میں پایا جاتا ہے پایا نہ جاتا۔ کیونکہ دل کے خیالات کسی پر ظاہر نہیں ہوتے۔ بچہ کس طرح معلوم کر سکتا تھا کہ فلاں فلاں شخص سے میرے والدین کو یا دوسرے عزیزوں کو محبت کا تعلق ہے۔ اور فلاں فلاں سے انکو عداوت ہے؟ ظاہر ہے۔ کہ یہ سب ظاہری علامات سے ہی اسے معلوم ہوتا ہے۔ اور اس طرح یہ جذبات نسلاً بعد نسلٍ محفوظ چلے جاتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی محبت کے اظہار کی ظاہری علامات نہ مقرر کیجائیں اور اس کی شان اور اسکے رتبہ کا اقرار کسی جسمانی علامت سے نہ کیا جائے۔ اور متواتر نہ کیا جائے تو یقیناً آئندہ نسلوں کے دلوں میں جنہوں نے پہلے نقوش اپنے ماں باپ کے حالات سے لئے ہیں۔ وہ محبت اور اخلاص خدا تعالیٰ کی نسبت پیدا نہیں ہو سکتا۔ جو اس صورت میں ہو سکتا ہے۔ اگر وہ بعض ظاہری علامات کو روز دیکھتے اور انکے اثر کو قبول کرتے رہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ

جن قوموں میں ظاہری عبادات کیطرف سے بے رغبتی ہو رہی ہے انہیں دہریت اور خدا تعالیٰ سے بے پروائی کے خیالات بھی کثرت سے پھیلتے جاتے ہیں۔

پھر ایک فائدہ ظاہری عبادات کا یہ ہے۔ کہ اس ذریعہ سے وہ تمام حصے انسان کے جو خدا تعالیٰ کے احسانوں کے نیچے دبے ہوئے ہیں اسکے احسانوں کا شکریہ ادا کرنے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کا احسان جسم پر بھی ہے۔ اور روح پر بھی ہے پس جب عبادت میں جسم اور روح دونوں کو شامل کر لیا جاتا ہے۔ تو وہ عبادت مکمل ہو جاتی ہے بغیر اسکے وہ ادھوری رہتی ہے۔ اور کبھی محفوظ نہیں رہ سکتی کیونکہ قلبی عبادت مغز کی طرح ہے اور مغز کبھی بغیر چھلکے کے محفوظ نہیں رہتا چھلکا خود مقصود نہیں ہوتا۔ مگر مغز کے قائم رکھنے کے لئے وہ بہت ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص چھلکے کو۔ لغو سمجھ کر پھینک دے۔ تو وہ درحقیقت مغز کو بھی خراب کر دیگا۔

اس امر کو ثابت کر چکنے کے بعد کہ ظاہری عبادت بھی روحانیت کے قیام کے لئے ضروری ہے اب میں ان عبادات کا ذکر کرتا ہوں۔ جو اسلام نے اپنے متبعین کے لئے مقرر فرمائی ہیں سب سے بڑی عبادت تو نماز ہے۔ جو گویا اسلامی عبادتوں کی جان ہے۔ ہر پانچ وقت ایک مسلم کے لئے یہ فرض ہے۔ کہ وہ خدا تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہو کر ان مقررہ قواعد کے رو سے جو اس کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے۔ پہلے وہ وضو کرتا ہے یعنی ایک مقررہ طریق پر ہاتھ اور پاؤں دھوتا ہے۔ اس میں علاوہ طہارت اور صفائی کے فائدہ کے جس پر اسلام نے خاص زور دیا ہے۔ روحانی فائدہ بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس طرح ان تمام راستوں کی حفاظت ہو جاتی ہے جنکے ذریعہ سے خیالات پراگندہ ہوتے ہیں یعنی حواس خمسہ۔ کان۔ ناک۔ آنکھ۔ منہ اور قوت لامسہ کے قائم مقام ہاتھ اور پاؤں کی۔ جو لوگ روحانیت کا درک رکھتے ہیں۔ وہ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ مگر افسوس ہے۔ کہ بوجہ قلت گنجائش میں تفصیل سے اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ اسلام نے ان دونوں امور کی طرف خود اس کام کے نام سے اشارہ کیا ہے یعنی وضو کے لفظ سے جس کے معنے صفائی اور خوبصورتی کے ہیں پس اس کا نام ہی دلالت کرتا ہے۔ کہ اس فعل کے ذریعہ سے ظاہری صفائی بھی ہو جاتی ہے جو باطنی صفائی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اور اس سے نماز بھی خوبصورت ہو جاتی ہے یعنی اس کے ذریعہ سے خیالات پراگندہ ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ اور نماز میں وہ

حقیقت پیدا ہوجاتی ہے جس کے لئے وہ ادا کی جاتی ہے۔

وضو کرنیکے بعد انسان قبلہ رُخ ہو کر کھڑا ہوجاتا ہے جس سے اسے ابراہیمؑ کی قربانیوں اور انکے نیک نتائج کیطرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ پھر وُہ بعض مقررہ عبارات پڑھتا ہے۔ جو تین روحانی امور پر مشتمل ہیں۔ اوّل خدا تعالےٰ کی تسبیح اور تحمید پر کہ اس سے خدا تعالےٰ کا صفاتی وجود اس کے سامنے آجاتا ہے۔ اور اس کا دل جوشِ محبت اور غلبۂ اخلاص سے حرکت میں آجاتا ہے اور ایک خاص کشش اس کو اللہ کی طرف پیدا ہوجاتی ہے۔ دوسرے اس اقرار پر کہ بندہ اپنی تمام ترقیات میں اللہ تعالےٰ کی نصرت اور اس کی مدد کا محتاج ہے۔ اس سے اس کے دل میں اپنی کمزوریوں پر اطلاع ملتی ہے۔ اور وُہ اپنی اصلاح اور اللہ تعالےٰ کی طرف توجہ کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ تیسرے دعا پر کہ جو گویا اصل جڑ ہے نماز کی۔ اسکے ذریعہ سے انسان اللہ تعالےٰ کے فضل کو جذب کرتا ہے۔ اور اس کی محبت کی رُوح کو اپنی محبت کی رُوح پر ڈال کر اس سے وُہ فیوض حاصل کرتا ہے جو روحانی طور پر بالکل اس مادۂ تناسل سے مشابہ ہیں۔ جو ایک نَر اور مادہ کے اجتماع سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ایک نئی مخلوق اس سے ظاہر ہوتی ہے۔ غرض اسلامی نماز اپنے اندر ایسے کمالات رکھتی ہے۔ کہ انسانی عقل اس کی خوبیوں کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے۔ مگر شرط یہی ہے۔ کہ ان شروط سے ادا کی جائے۔ جو اسلام نے اسکے لئے مقرر کی ہیں۔ ورنہ وُہ کچھ اثر نہ کریگی۔ اور خواہ مخواہ نماز گزار نماز پر حرف گیری کریگا۔

نماز کے ادا کرنیمیں شریعت اسلام نے جو ظاہری علامات مقرر کی ہیں۔ وہ بھی نہایت پرحکمت ہیں یعنی ہاتھ باندھکر کھڑا ہونا۔ رکوع کرنا۔ ہاتھ چھوڑ کر کھڑا ہونا۔ سجدہ کرنا اور دو زانو بیٹھنا۔ یہ تمام حرکات وہ ہیں۔ جو دنیا کے مختلف ممالک میں کمال تذلل کے اظہار کے لئے اختیار کیجاتی ہیں۔ بعض ممالک میں لوگ انتہائی ادب کے اظہار کیلئے ہاتھ باندھکر کھڑے ہوتے ہیں۔ بعض جگہ ہاتھ چھوڑ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ مصر کے قدیم لوگ گھٹنوں پر ہاتھ رکھکر انتہائی ادب کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ہندوستان میں سجدہ کا رواج تھا۔ یورپ میں گھٹنوں کے بل گرنے کا رواج ہے۔ اسلام نے اپنی عبادت میں ان سب باتوں کو جمع کر لیا ہے۔

ان سب خوبیوں کے ساتھ یہ خوبی ملکر کہ نماز کے وقت جس کے لئے عام حکم یہی ہے۔

کہ سب مسلمان ملکر نماز ادا کریں۔ تاکہ اخوت کا جذبہ ترقی کرے۔ جس وقت بادشاہ اور ایک ادنےٰ مزدور پہلو بہ پہلو اکٹھے کھڑے ہوتے ہیں۔ تو حقیقی طور پر دل محسوس کرتا ہے۔ کہ یہ ایک حقیقت ہے بناوٹ نہیں ایک ایسی ہستی کے سامنے سب لوگ کھڑے ہوئے ہیں جس کے حضور میں ایک بادشاہ بھی اپنی بادشاہت کا خیال بھُول جاتا ہے۔ اور ایک معمولی آدمی کے پہلو میں آکر کھڑا ہوجاتا ہے۔

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ اسلام نے نماز کی تعلیم لالچ کے طور پر دی ہے۔ کہ خدا تعالےٰ اس طرح ہمیں کچھ دیگا۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے اس خیال کو باطل کیا ہے۔ اور بتایا ہے۔ کہ اسلامی عبادات ایک دنیادار کی لالچی درخواستوں کی طرح نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی دو بڑی غرضیں ہیں۔ ایک تو اللہ تعالےٰ کے احسانات کا شکریہ اور ان کا اقرار جو ایک صداقت کا اقرار ہے۔ اور بغیر صداقت کے اقرار کے انسان انسان کہلانیکا مستحق ہی نہیں ہوسکتا۔ دوسرے روحانی ترقی کا حصُول چنانچہ ان دونوں باتوں کا ذکر قرآن کریم یوں فرماتا ہے۔ اُذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِیْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ۔ (بقرہ ع ۱۸) اے لوگو میری عبادت کرو تاکہ میں تم کو اپنی ملاقات کا شرف بخشوں۔ اور میری نعمتوں کا شکریہ ادا کرو اور ناشکری نہ کرو۔ یعنی عبادات کا ایک فائدہ تو روحانی ترقی ہے اور دوسرے احسانات باریتعالیٰ کا شکریہ۔ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ۔ (عنکبوت ع ۵) اسلامی نماز انسان کو بدیوں اور ناپسند باتوں سے بچاتی ہے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہؓ نے پوچھا آپ اس قدر عبادت کیوں کرتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا۔ اَفَلَآ اَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا۔ کیا میں خدا تعالےٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ قرآن میں ایک اور جگہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ (رعد ع ۴) نماز کے ذریعے دل مطمئن ہوتے ہیں۔ اور وُہ عرفان ملتا ہے جس سے شک کی حالت جاتی رہتی ہے پس نماز روحانی ترقیات کا ایک ذریعہ ہے جس طرح مادی دنیا میں مختلف کاموں کے حصول کے ذرائع مختلف ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے۔ کہ اسلامی نماز کی تعلیم زبردست حکمتوں پر مبنی ہے۔ اور اس کے

اندر اسقدر خوبیاں جمع ہیں۔ کہ دوسرے مذاہب کی عبادات میں اسقدر خوبیاں نہیں ہیں وہ تمام ضروریات عبادت پر مشتمل ہے۔ اسلئے ایک ہی ذریعہ حصول تقویٰ کا ہے۔ اور جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انکو ظاہری عبادت کی ضرورت نہیں انکی غلطی ہے۔ بھلا یہ کونسی عقل تسلیم کر سکتی ہے۔ کہ ابراہیمؑ اپنے سارے تقویٰ کے ساتھ اور موسیٰؑ اپنی ساری قربانیوں کے ساتھ اور مسیحؑ اپنی ساری فروتنی کے ساتھ اور محمد رسول اللہ صلعم باوجود اپنے جامع کمالات ہونیکے تو ظاہری عبادت کے محتاج رہے اور انہوں نے دل کی عبادت پر اکتفا نہ کی لیکن بعض ایسے لوگ جو رات اور دن دنیوی شغلوں میں مشغول رہتے ہیں۔ اور خدا کی یاد کبھی ان کے دلوں میں بھول کر بھی نہیں گھستی۔ ان کیلئے کافی ہے۔ کہ وہ دل میں خدا تعالیٰ کو یاد کر لیا کریں۔ درحقیقت یہ ایسا خیال ہے۔ جو یا تو نفس کی سستی کیوجہ سے پیدا ہوا ہے اور نفس انسانی اس عذر کے ذریعہ سے اندرونی ملامت سے بچنا چاہتا ہے۔ یا پھر ایک بہانہ ہے جس کے ذریعہ سے بیرونی اعتراضوں کے مقابلہ میں اپنی بے دینی کو بعض لوگ چھپاتے ہیں۔

دوسری قسم عبادت کی ذکر ہے۔ یہ عبادت اسلام نے اس حکمت کے ماتحت بتائی ہے۔ کہ نماز جو خاص شکل اور خاص شرائط کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ اسے آدمی ہر وقت نہیں پڑھ سکتا۔ مگر جسطرح انسان کا جسم تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد پانی کا محتاج ہوتا ہے۔ اور بغیر پانی کے اس کے اندر ایک قسم کی تھکان اور خشکی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح اس کی روح بھی روحانی پانی کی محتاج ہے۔ کیونکہ دنیوی کاموں اور مادی امور کے پیچھے سارا دن پڑا رہنے کے سبب سے روح اپنی غذا سے محروم ہو جاتی ہے پس اس کے لئے اسلام نے یہ بتایا ہے۔ کہ چاہیئے کہ وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ کی صفات کو یاد کر کے انسان ان پر غور کر لیا کرے۔ تاکہ اسے کلی طور پر دنیا میں ہی انہماک نہ رہے۔ بلکہ خدا تعالیٰ بھی اسکو یاد آتا رہے اور قلب میں اس کی محبت کی چنگاری بھی سلگتی رہے اس ذکر کے وقت فوائد بھی وہی ہیں۔ جو اوپر بیان ہو چکے ہیں۔

تیسری قسم کی عبادت جس کا اسلام نے حکم دیا ہے وہ روزہ ہے۔ روزوں کا حکم بھی قریباً سب مذاہب میں مشترک ہے۔ مگر جس صورت اور جس شکل میں اسلام نے اس کو پیش کیا ہے اور محفوظ رکھا ہے۔ وہ باقی مذاہب سے نرالی ہے۔ اسلام میں روزوں کی یہ صورت ہے کہ ہر بالغ عاقل کو برابر ایک مہینہ کے روزے رکھنے کا حکم ہے۔ سوائے اس صورت کے کہ کوئی شخص بیمار ہو

یا اسے بیماری کا یقین ہو یا سفر پر ہو۔ یا بالکل بوڑھا اور کمزور ہو گیا ہو۔ ایسے لوگ جو بیمار ہوں یا سفر پر ہوں انکے لئے حکم ہے کہ دوسرے اوقات پر روزہ رکھیں اور جو بالکل معذور ہو گئے ہوں انکے لئے کوئی روزہ نہیں۔ روزہ کی یہ صورت ہے کہ پو پھٹنے سے لیکر سورج کے غروب تک کوئی چیز کھائے نہ پیئے نہ کم نہ زیادہ۔ اور نہ مخصوص تعلقات کیطرف توجہ کرے۔ پو پھٹنے سے پہلے چاہیئے کہ کھانا کھا لے اور پانی پی لے۔ تا جسم پر غیر معمولی بوجھ نہ پڑے۔ صرف شام ہی کو کھانا کھا کر متواتر روزے رکھنے کو شریعت نے ناپسند کیا ہے۔

روزہ کی حکمتیں قرآن کریم نے یہ بتائی ہیں۔ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (بقرہ ع ۲۳) تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی بڑائی کا اظہار کرو اسوجہ سے کہ اس نے تم کو سچا راستہ دکھایا ہے۔ اور تاکہ تم میں شکر کرنیکا مادہ پیدا ہو۔ یعنی ایک فائدہ تو یہ مدنظر ہے۔ کہ تم ان دنوں میں بوجہ سارا دن کھانے پینے کے شغلوں سے فارغ رہنے کے اور مادیت کی طرف سے توجہ کے ہٹ جانیکے اللہ تعالیٰ کا ذکر زیادہ کرو گے۔ دوسرے یہ فائدہ مدنظر ہے۔ کہ اس طرح بھوک کی تکلیف محسوس کر کے تمہارے دل میں شکر گذاری کا مادہ پیدا ہوگا۔ کیونکہ انسان کا قاعدہ ہے۔ کہ جبتک اس کے پاس کوئی نعمت ہوتی ہے۔ اسکی اسے قدر نہیں ہوتی۔ ہے جب چھن جائے تو اسکی قدر محسوس ہوتی ہے۔ بہت سے آنکھوں والے آدمیوں کے کبھی ساری عمر ذہن میں نہیں آتا۔ کہ آنکھیں بھی کوئی بڑی نعمت ہیں لیکن جب کسی کی آنکھیں جاتی رہتی ہیں تب اسے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آنکھیں اللہ تعالیٰ کی کیسی نعمت ہیں۔ اسی طرح روزہ میں جب انسان بھوکا رہتا ہے۔ اور اسے بھوک کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ تو تب اُسے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ نے اُسے کیسا آرام بخشا ہے۔ اور یہ کہ اسے اس آرام کی زندگی کو نیک اور مفید کاموں میں صرف کرنا چاہیئے نہ کہ لہو و لعب میں۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزہ کی حکمت یہ ہے کہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ تاکہ تم کو تقویٰ حاصل ہو۔ یہ تَتَّقُوْنَ کا لفظ قرآن کریم میں تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک دکھوں سے بچنے کے معنے میں۔ دوسرے گناہ سے بچنے کے معنوں میں اور تیسرے روحانیت کے اعلیٰ مدارج کے حاصل کرنے کے متعلق۔ پس اس لفظ کے ذریعہ سے تین حکمتیں اللہ تعالیٰ نے روزہ کی بیان فرمائی ہیں۔ پہلی حکمت یہ کہ انسان روزہ کے ذریعہ سے دکھوں سے بچ جاتا ہے۔ بظاہر یہ امر قابل تعجب

معلوم ہوتا ہے کہ روزے سے انسان دکھ سے بچے کیونکہ روزہ سے تو انسان اور بھی تکلیف پاتا ہے مگر جب غور سے دیکھا جائے تو روزہ درحقیقت انسان کو دو سبق دیتا ہے جس سے اس کی قومی حفاظت ہوتی ہے۔ اوّل سبق تو یہ ہے کہ مالدار لوگ جو سال بھر عمدہ سے عمدہ غذائیں کھاتے رہتے ہیں۔ انکو اپنے غریب بھائیوں کی تکلیفوں کا جو فاقوں سے دن گزارتے ہیں احساس بھی نہیں ہوتا نہ انہوں نے بھوک کی تکلیف کبھی دیکھی ہوتی ہے۔ نہ بھوک کی تکلیف کا وہ اندازہ لگا سکتے ہیں لیکن اسلام کے حکم کے ماتحت بڑے سے بڑے امراء کو روزے رکھنے پڑتے ہیں۔ اور تب انکو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ بھوک کی تکلیف کیسی ہوتی ہے اور اپنے غریب بھائیوں کی حالت کا صحیح اندازہ ہوجاتا ہے۔ اور ان کی ہمدردی کا جوش دلوں میں پیدا ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ قوم کی ترقی اور حفاظت ہوتا ہے۔ اور قوم کی حفاظت درحقیقت فرد کی حفاظت ہی ہوتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے۔ کہ اسلام نہیں چاہتا۔ کہ لوگ سست اور غافل ہوں۔ اور تکلیف برداشت کرنیکی ان میں عادت نہ ہو۔ بلکہ وہ یہ چاہتا ہے۔ کہ ضرورت کیوقت وہ ہر قسم کی مشقت برداشت کرنیکی قابلیت رکھتے ہوں۔ اور روزے ہر سال مسلمانوں کے اندر یہ مادہ پیدا کرجاتے ہیں۔ اور جو لوگ اسلام کے اس حکم پر عمل کرنے والے ہوں وہ کبھی عیاشی اور غفلت میں مبتلاء ہو کر ہلاک نہیں ہوسکتے۔

دوسرا امر کہ روزوں سے انسان گناہ سے بچتا ہے اسطرح متحقق ہوتا ہے کہ گناہ درحقیقت مادی لذات کیطرف جھکنے کا نام ہے۔ اور یہ قاعدہ دیکھا گیا ہے۔ کہ جب انسان کسی کام کا عادی ہوجائے تو وہ اسکو چھوڑ نہیں سکتا مگر جب اس میں یہ طاقت ہو کہ اپنی مرضی پر اسکو چھوڑ بھی دے۔ تو پھر وہ خواہش اس پر غلبہ نہیں مارتی جب کوئی شخص روزوں میں تمام ان لذتوں کو جو اسکو بعض اوقات گناہ کی طرف کھینچتی ہیں۔ خدا کے لئے چھوڑ دیتا ہے اور ایک مہینہ تک برابر اپنے نفس پر قابو پانے کی عادت ڈالتا ہے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ وہ ان لالچوں کا مقابلہ آسانی سے کرسکتا ہے جو اسے گناہ کی طرف کھینچتی ہیں۔

تقویٰ کے قیام میں روزوں سے اسطرح مدد ملتی ہے۔ کہ ان دنوں میں چونکہ رات کو کھانا کھانے کیلئے اٹھنا پڑتا ہے زیادہ عبادت اور دعاؤں کا موقع ملتا ہے اور دوسرے جب بندہ

خدا تعالےٰ کے لئے اپنے آرام کو چھوڑتا ہے۔ تو خدا تعالےٰ بھی اسکو اپنی طرف کھینچتا ہے اور اسکی رُوح کو طاقت بخشتا ہے۔

چوتھی عبادت حج ہے۔ اس عبادت کی بھی اغراض روزے اور نماز سے ملتی ہیں۔ یعنی اللہ تعالےٰ کے لئے اپنا وطن چھوڑنے کی عادت ڈالنی اور اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے الگ ہونے کا خوگر بنانا۔ علاوہ ازیں قرآن کریم نے خصوصاً یہ وجہ بتائی ہے۔ کہ اس عبادت سے شعائر اللہ کی عظمت ہوتی ہے۔ اور انکی یاد تازہ ہوتی رہتی ہے۔ حج دراصل اس واقعہ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ جو ابراہیم علیہ السّلام کو اپنے بیٹے اسمٰعیلؑ کو جنگل میں چھوڑ دینے کے سبب سے پیش آیا اور دوسرے خانہ کعبہ کی نسبت قرآن کریم فرماتا ہے۔ کہ وہ سب سے پہلا گھر ہے۔ جو خدائے واحد کی عبادت کے لئے بنایا گیا پس حج میں جاکر انسان کے سامنے وہ نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ کہ کس طرح خدا کے لئے قربانی کرنیوالے بچائے جاتے ہیں اور انکو اللہ تعالےٰ عزت دیتا ہے۔ اور حج کرنیوالے کے دل میں خدا کا جلال اور اسکی ذات کا یقین بڑھتا ہے۔ دوسرے وہ اپنے آپکو اس گھر میں دیکھکر جو ابتدائے دُنیا سے خدا تعالےٰ کی یاد کے لئے بنایا گیا ہے۔ ایک عجیب روحانی تعلق ان لوگوں سے پاتا ہے۔ جو ہزاروں لاکھوں سال پہلے سے اس روحانی سلک میں پروئے چلے آتے رہے ہیں جس میں یہ شخص پرویا ہوا ہے یعنی خدا تعالےٰ کی یاد اور اس کی محبت کا رشتہ جو سب کو باندھے ہوئے ہے۔ خواہ پرانے ہوں خواہ نئے۔

علاوہ ازیں حج میں سیاسی فائدہ بھی ہے۔ کہ ذی اثر لوگوں میں سے ایک جماعت سال میں جمع ہو کر تمام عالم کے مسلمانوں کی حالت سے واقف ہوتی رہتی ہے۔ اور اخوت اور محبت ترقی کرتی ہے۔ اور ایک دوسرے کی مشکلات سے آگاہ ہونے اور آپس کے تعاون اور ایک دوسرے کی خوبیوں کے اخذ کرنیکا موقع ملتا ہے۔ گو افسوس ہے کہ اسوقت اس غرض سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔

پانچویں عبادت قربانی ہے بہت لوگ اسلامی قربانی کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ اور خیال کرتے ہیں۔ کہ قربانی کا حکم اسلام نے اسلئے دیا ہے تاکہ قربانی قربانی کرنیوالے کا گناہ اٹھالے۔ لیکن یہ بات درست نہیں۔ اسلام ہرگز یہ تعلیم نہیں دیتا۔ قربانی قرب سے نکلی ہے قربانی درحقیقت ایک نہایت لطیف عملی زبان ہے جس کے نہ سمجھنے کیوجہ سے لوگوں کو دھوکا لگا ہے۔ یہ بات

تو ظاہر ہی ہے۔ کہ دُنیا میں کثرت سے تصویری اور عملی زبانوں کا رواج ہے۔ اور باوجود زبانوں کے ترقی کر جانے اور علم ادب کے کمال کو پہونچ جانیکے یہ قدیم طریق اظہار خیالات کا اب تک دُنیا میں قائم ہے اور اس کے اثر کو لوگ قبول کرتے ہیں۔ تمدن کے تمام شعبوں میں اس کا اثر پایا جاتا ہے۔ مثلاً جب دو آدمی مصافحہ کرتے ہیں۔ تو کوئی ان کو نہیں کہتا۔ کہ تم لغو فعل کر رہے ہو۔ اور نہ کوئی اتنا غور کرتا ہے۔ کہ ہاتھ کے ملانے سے دونو کو کیا خوشی ہوتی ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ یہ ہاتھوں کا ملانا ایک تصویری زبان ہے جو قدیم رسوم کے اثر کے نیچے ابتک چلی جاتی ہے۔ اور اب گو اس کی وجہ لوگوں کو معلوم نہیں۔ مگر اس کا رواج چلا جا رہا ہے۔ اور دُنیا کے بہترین اعمال میں سے ایک عمل ہے۔ کیونکہ محبتوں کے قیام اور تعلقات کے اظہار میں ممد ہے۔ مگر پہلے پہل جب اس کا رواج ہوا۔ تو اس طرح سے ہوا تھا۔ کہ دو آدمی جب آپس میں اس امر کا معاہدہ کرتے تھے۔ کہ ایک دوسرے کی مدد کریگا۔ اور حسب ضرورت اسکی طرف سے ہو کر لڑیگا۔ تو چونکہ دفاع اور حملہ دونوں ہاتھوں کے ذریعہ سے ہوتے تھے۔ اس لئے وُہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑتے تھے کہ اب جس پر تیرا ہاتھ اُٹھے گا۔ میرا اُٹھیگا۔ اب ہم دونو کے ہاتھ ایک ہو گئے ہیں۔ حملہ اور بچاؤ دونوں صورتوں میں یہ جمع رہیں گے۔ دیکھو شروع میں کیسے خطرناک معاہدہ کے لئے یہ رسم جاری کی گئی۔ مگر اب عام محبت کے اظہار کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی ایک حد تک دُنیا کو اس سے فائدہ پہونچ رہا ہے اور اسکو چھوڑنیکے لئے لوگ تیار نہیں۔

اسی طرح بوسہ کی رسم کی اصل وجہ بھی تصویری زبان ہے۔ بوسہ درحقیقت چوسنے کی حرکت کے مشابہ ہے۔ دراصل اس امر کے ذریعہ سے فطرت حیوانی (میں فطرت حیوانی اس لئے کہتا ہوں۔ کہ جانوروں میں بھی اس کا وجود پایا جاتا ہے) اس امر کا اظہار کرتی ہے۔ کہ میں اس شخص کے وجود کو جس کو میں بوسہ دیتی ہوں۔ اپنے سے جدا رہنے دینا نہیں چاہتی۔ بلکہ چاہتی ہوں۔ کہ یہ میرے جسم کا حصہ بن جائے۔

غرض اشارات کی زبان ہمارے روزمرہ کے کاموں میں استعمال ہو رہی ہے۔ اور اس سے عظیم الشان فوائد حاصل کئے جا رہے ہیں۔ انہی میں سے قربانی ہے۔ اگر غور کر کے دیکھا جائے۔ تو جان کا قربان کرنا کوئی معمولی امر نہیں ہے۔ اور طبیعت پر ایک گہرا اثر ڈالتا ہے۔ سوائے ان لوگوں کے

جو ذبح کر کرکے عادی ہو چکے ہیں۔ دوسرے شخص کی طبیعت پر ضرور ذبح کرنیکا اثر ہوتا ہے۔ اور اس وقت اس کے خیالات میں ایک وسیع ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اسی کے اثر کے ماتحت بعض قوموں نے قربانی کو ظلم قرار دیا ہے۔ یہ ان کا فعل تو کمزوری کی علامت ہے۔ مگر اسمیں شک نہیں کہ قربانی کا اثر طبیعت پر ضرور ہوتا ہے۔ اسی اثر کو پیدا کرنے کے لئے قربانی کو عبادت میں شامل کیا گیا ہے۔ اور اس سے یہ غرض ہوتی ہے۔ کہ قربانی کرنے والا اس امر کا اقرار گویا قربانی کے ذریعہ سے اشارہ کی زبان میں کرتا ہے۔ کہ جس طرح یہ جانور جو مجھ سے ادنیٰ ہے میرے لئے قربانی ہوا ہے اسی طرح میں اقرار کرتا ہوں۔ کہ اگر مجھ سے اعلیٰ چیزوں کے لئے مجھے جان دینی پڑیگی۔ تو میں خوشی سے جان دُوں گا۔

اب غور کرو کہ جو شخص قربانی کی اس حکمت کو سمجھ کر قربانی کرتا ہے۔ اس کی طبیعت پر اس کا کس قدر گہرا اثر پڑیگا۔ اور کس طرح وہ اپنے فرض کو یاد رکھیگا جو اس پر اس کے پیدا کرنیوالے کی طرف سے عائد ہے؟ اس ذبح کی یاد ہمیشہ اس کے دل میں تازہ رہیگی۔ اور اس کا دل اسے کہتا رہیگا۔ کہ دیکھ تونے اپنے ہاتھوں سے بکرے کو ذبح کر کے اس امر کا اقرار کیا تھا۔ کہ ادنیٰ چیز اعلےٰ کے لئے قربان کیجاتی ہے۔ پس تجھے بھی اس قربانی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ جو صداقتوں کے قیام یا بنی نوع انسانی کی تکالیف کے دُور کرنے کے لئے تجھے کرنی پڑے۔ اسی مضمون کی طرف قرآن کریم اشارہ کرتا ہے جب وہ فرماتا ہے۔ کہ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (الحج ع ۵) اللہ تعالیٰ کو نہ تمہاری قربانیوں کا گوشت پہونچتا ہے نہ خون۔ لیکن اللہ تعالےٰ کو وہ ارادہ جو خشیت اللہ کو مدنظر رکھکر تم نے کیا تھا وہ پہونچتا ہے۔ یعنی اگر اس غرض کو پورا کرو گے جس کے لئے قربانی کی ہے۔ تو قربانی کا فائدہ ہوگا۔ ورنہ صرف گوشت کھانے اور خون بہانے کا کام تم سے ہوا ہے اور کوئی حقیقی فائدہ تم کو نہ ہوگا۔

اس بیان سے آپ لوگوں پر اچھی طرح واضح ہو گیا ہوگا۔ کہ اسلام کے نزدیک قربانیوں کی ہرگز وہ وجہ نہیں ہے۔ جو دوسری قوموں میں ہے۔ اسلام اس مقصد کو محفوظ رکھ رہا ہے جسکی وجہ سے اس اشارے کی زبان کو جاری کیا گیا تھا۔ مگر دوسرے مذاہب اصل زبان کو بھول کر قربانی کے اور ہی مقصد تجویز کر رہے ہیں۔

مقصدِ اوّل کا سوالِ چہارم

مقصدِ اول کا سوالِ چہارم یہ ہے۔ کہ کیا خدا بندہ کو مل سکتا ہے؟ اور کیا کوئی مذہب خدا سے ملانے کا دعویدار ہے اور خدا تعالےٰ سے بندہ کو ملا دیتا ہے؟

یہ سوال جیسا کہ ظاہر ہے سب سے اہم ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو مذہب کا فائدہ اصل میں اسی سوال کے ساتھ وابستہ ہے جو شخص بھی صحیفۂ فطرت کی صحیح راہنمائی سے گریز نہیں کرتا۔ اور اس کی ہدایت سے آنکھیں بند نہیں کر لیتا اپنے دل میں محسوس کرتا ہوگا۔ کہ اگر مذہب کی کوئی غرض ہے۔ تو یہی کہ خدا سے ملنے کا راستہ بتائے۔ بلکہ خدا سے ملا دے۔ باقی سب سوال اس سوال کے مبادی یا ضمنی سوال ہیں۔

اگر کوئی مذہب خدا تعالےٰ کی صفات بھی بیان کرے۔ اس کی توحید پر بھی خوب زور دے خدا سے اخلاص کا تعلق رکھنے کے لئے بھی اپنے پیروؤں کو تاکید کرے۔ طریقِ عبادت بھی انکو بتائے لیکن وُہ اس امر پر آکر بالکل خاموش ہو جائے۔ کہ کیا وُہ خدا کو ملا بھی سکتا ہے۔ اور اسی دُنیا میں ملا سکتا ہے۔ تو اسکی سب پہلی تقریریں محض لفاظی اور وقت کا ضیاع اور بنی نوعِ انسان سے ایک ہنسی اور تمسخر ہوں گی۔

اس مذہب کی مثال بالکل اس شخص کی ہوگی۔ جو نقاروں اور بگل کے ساتھ اعلان کرائے کہ ایک عظیم الشان دریافت ہوئی ہے۔ لوگ جمع ہو جائیں تا کہ ان کو وُہ بات سنائی جائے اور چاہیے کہ کوئی پیچھے نہ رہے۔ کیونکہ وُہ ایسی اہم دریافت ہے۔ کہ ویسی دریافت کبھی نہ ہوئی تھی اور وہ ایسی دریافت ہے۔ کہ سب انسانوں کے لئے اس کا سننا ضروری ہے۔ اور وُہ سب کیلئے مفید ہے۔ اور اسکا فائدہ اسقدر زیادہ ہے۔ کہ آجتک کسی چیز کا اسقدر فائدہ نہیں ہوا۔ اور اس دریافت سے فائدہ نہ اٹھانا شقاوت اور بدبختی ہے جب لوگ اس شخص کے اعلان پر دُور اور نزدیک سے جمع ہو جائیں اور اشتیاق کیوجہ سے اپنے کام چھوڑ چھوڑ کر چلے آویں۔ تو سب لوگوں کے جمع ہونے پر وُہ شخص تقریر کرے۔ کہ ایک نیا ملک دریافت ہوا جسمیں اسقدر وسعت ہے کہ سب لوگ وہاں جا کر آرام سے بس سکتے

ہیں۔ وُہ دور بھی نہیں ہر ایک کے دروازے کے نزدیک ہے۔ اسمیں جگہ بجگہ چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ اور پھول اور پھل اور میوے کثرت سے ہیں۔ اور ہر ایک چیز کی بہتات ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ بھی اس میں بسیں وہ اپنے حصہ کی فراوانی کے سبب سے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے کو فضول سمجھیں گے کیونکہ وہاں ہر ایک کے پاس بہت کچھ ہوگا۔ اور میں کیا بتاؤں کہ وہاں کیسا آرام ہے۔ اس کا چمکتا ہوا سورج جو اپنے نور سے سطحِ زمین کو منور کرتا ہے۔ اور اسکا گھنا سایہ جو اس کی تمازت سے آرام دیتا ہے۔ ایسے دلکش ہیں۔ کہ اس سرزمین پر جا کر پھر کسی کا نکلنے کو دل نہیں چاہتا جب لوگوں کا شوق تیز ہو جائے۔ اور ان کی امیدیں وسیع ہو جائیں۔ اور وہ کہیں کہ اچھا وہ ملک کہاں ہے۔ کہ ہم وہاں جائیں۔ اور اسکے میوے چکھیں اور اسکا پانی پئیں؟ تو وہ شخص کہے کہ ملک تو وُہ ایسا ہی ہے۔ مگر افسوس ہے۔ کہ مجھے معلوم نہیں۔ کہ وُہ کہاں ہے؟ اور کس طرح وہاں جاتے ہیں میں نے اپنے باپ دادا کی لائبریری میں ایک کتاب دیکھی تھی۔ اس میں دیکھا تھا کہ ایک ایسا ملک ہے پس میں نے نہ چاہا۔ کہ آپ اس عظیم الشان دریافت کے علم سے ناواقف رہیں۔ آپ لوگ قیاس کر سکتے ہیں کہ اس شخص کے ساتھ سامعین کیا سلوک کرینگے؟ مگر تعجب ہے۔ کہ مذہب کے بارے میں لوگوں سے اسی قسم کا تمسخر کیا جاتا ہے۔ اور کوئی نہیں پوچھتا۔ کہ ایسا کیوں کیا جاتا ہے؟ خدا تعالےٰ کی طرف بلایا جاتا ہے۔ مگر جب کوئی آئے تو اسکو کچھ بھی نہیں ملتا۔ وُہ جہاں تھا وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ صرف خلش اور حسرت کی زیادتی ہو جاتی ہے۔

کسی نے آجتک نہ سُنا ہوگا۔ کہ بلا دیکھے کسی خیالی صنم سے کسی کو عشق ہو جائے۔ عشق تو حُسن کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ نہ کہ محض حُسن کا ذکر سُنکر تو پھر اس قدر محبت جس کی اُمید کی جاتی ہے۔ کہ بندہ خدا سے کرے بلا خدا تعالےٰ کو دیکھنے کے کس طرح پیدا ہو سکتی ہے؟ محبت تو دل کے گداز ہو جانیکا نام ہے۔ مگر جب آگ ہی نہ ہو تو کوئی چیز گداز کس طرح ہوگی؟ پہلے ضروری ہے۔ کہ ایک سُورج کی طرح چمکتا چہرہ ہو تا وُہ اپنی روشنی کی گرمی سے دلوں کو گداز کرے۔ تب اس کے نتیجہ میں محبت بھی پیدا ہوگی۔ پس کوئی مذہب سچا عشق خدا سے نہیں پیدا کرا سکتا جبتک کہ وہ خدا کی ملاقات کا راستہ نہیں کھولتا۔

زمانہ کی حالت کو دیکھ لو۔ آج کتنے لوگ خدا تعالےٰ کی محبت اور اس کی الفت کو

دل میں رکھتے ہیں؟ یقیناً دس فیصدی بھی نہیں۔ اور یہ دس فیصدی بھی وُہ ہیں۔ جو خیال کرتے ہیں۔ کہ خدا سے محبت ہے مگر حقیقتاً وہ قدیم رسوم اور باپ دادوں کی بنائی ہوئی راہ پر چل رہے ہیں۔ چاروں طرف دنیا میں تاریکی اور ظلمت ہی نظر آتی ہے۔ خدا کے لئے قربانی کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہے دین کے نام پر جو قربانیاں ہیں۔ انکے پیچھے بھی قوم پرستی کا جذبہ منڈلاتا نظر آتا ہے ابھی اگزیبیشن ہو رہی ہے۔ کس قدر دور دور سے لوگ اسے دیکھنے کے لئے آ رہے ہیں۔ مگر خدا کو دیکھنے کے لئے کوئی نہیں گھر سے نکلتا۔ اس لئے کہ لوگ جانتے ہیں۔ کہ وُہ نہ گھر میں نظر آتا ہے نہ باہر پس جب لوگوں کو کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ تو وہ مجبور ہیں۔ دین کا معاملہ ایسا ہے۔ کہ اسکو آخرت پر نہیں چھوڑا جائیگا۔ کیونکہ انسان دو دفعہ دُنیا میں نہیں آتا۔ اور یقیناً نہیں۔ پھر اگر اس دنیا میں انسان کو کچھ نظر نہ آئے۔ اور اگلے جہان میں اسکو معلوم ہو کہ وہ جس راستہ پر چل رہا تھا غلط تھا۔ تو وہ کیا کرے؟ اور اگر بفرض یہی بات ہو کہ نہ خدا ہے۔ نہ کوئی زندگی مابعد الموت تو بھی اس شخص کی زندگی ایک وہم کی نذر ہوئی۔

اس امر کا دعویٰ تو ہر مذہب کو ہے۔ کہ بعد الموت خدا اس کے ذریعہ سے مل جائیگا لیکن ایسے بڑے اہم معاملہ کو کوئی شخص حسن ظنی پر کس طرح چھوڑ سکتا ہے؟ جو کچھ لوگوں کو بتایا جاتا ہے۔ وُہ تو صرف یہ ہے۔ کہ تم کو چاہیئے۔ کہ یوں کرو۔ اور یوں کرو۔ لیکن اصل میں تو اس امر کی ضرورت ہے۔ کہ ہمارے ان افعال کے مقابلہ میں اللہ تعالےٰ کیا کریگا؟ ہمارے اعمال کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کوئی دروازہ پر دستک دے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جیسا کہ اس مقدس وجود نے جس نے آج سے اُنیس[١٩] سو سال پہلے دنیا کو اپنی کرنوں سے منور کر دیا تھا۔ اشارہ کیا ہے۔ کیا وُہ دروازہ ہمارے لئے کھولا بھی جائیگا؟ اگر وہ دروازہ کھولا نہیں جائیگا۔ اور اگر ہماری دستک اس قسم کا اشارہ نہیں رکھتی جس پر دروازہ کھولا جاتا ہے۔ تو بتانے والے نے کیا بتایا؟ یونہی شور تو ہم خود بھی بغیر کسی کی دستگیری کے مچا سکتے تھے۔ اس نے تو صرف نہ پوری ہونے والی امیدیں ہمارے دلوں میں پیدا کر کے ہمیں اور بھی تڑپا دیا۔ اسکے بتانے کا فائدہ تو تب تھا۔ کہ جب وُہ ہمیں وہ اشارہ سکھاتا جس پر دروازہ کھل جاتا اور اسی دُنیا میں کھل جاتا تاکہ پیشتر اس کے کہ ہمارے لئے واپس لوٹنے کا راستہ نہ رہے ہمیں یہ تسلی ہو جاتی کہ ہم صحیح راستہ پر چل رہے ہیں۔

اے بہنو اور بھائیو! خواہ تم کسی ملک کے ہو۔ میں آپ کو بشارت دیتا ہوں۔ کہ اسلام یا دوسرے لفظوں میں احمدیت اس امر کا دعوےٰ کرتی ہے۔ کہ وُہ اس اشارہ کو سکھاتی ہے جس سے دروازہ کھولا جاتا ہے۔ نہیں نہیں وہ اس سے بڑھکر اس امر کی مدعی ہے۔ کہ وہ پہلے بھی کئی لوگوں کو اس کام میں پورا اتار چکی ہے۔ کئی ہیں جن پر خدا تعالےٰ نے احمدیت کے ذریعہ سے دروازہ کھولا ہے۔ اور وُہ اسی زندگی میں ان کو مل گیا ہے۔ پس اگر آپ لوگ اسکی ملاقات کے متلاشی ہیں۔ تو اس کی طرف آئیں۔ کہ وُہ آپکی اس خواہش کو پورا کرے گی۔ الّا ماشاء اللہ۔

پیشتر اس کے کہ میں اس امر کی تشریح کروں۔ کہ احمدیت کس طرح خدا تعالےٰ سے ملاتی ہے۔ میں یہ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ خدا سے ملنے سے کیا مراد ہے؟

سو یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ خدا سے ملنے سے مراد یہ نہیں ہے۔ کہ خدا تعالےٰ کوئی مادی وجود ہے جس کو انسان اپنی جسمانی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے۔ کہ انسان خدا تعالیٰ کو روحانی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ مگر جب میں کہتا ہوں۔ کہ روحانی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ تو اس سے بھی میری مراد یہ نہیں کہ وُہ خیال کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ وُہ دیکھ رہا ہے۔ جیسا کہ وہ لوگ جو اپنے دماغ کو خاص قسم کی مشقوں میں لگا دیتے ہیں کبھی کبھی خیال کر لیتے ہیں۔ بلکہ میری مراد حقیقۃً دیکھنے سے ہے جس طرح کہ ہم سورج کو دیکھتے ہیں۔ یا چاند کو دیکھتے ہیں۔ یا اور چیزوں کو دیکھتے ہیں حتیٰ کہ ہمیں اُنکے وجود میں کوئی شک نہیں رہتا اگر دس کروڑ آدمی بھی ہمارے پاس آکر کہے۔ کہ سورج حقیقۃً ہمارے سامنے نہیں آتا۔ بلکہ ہمیں خیال ہو جاتا ہے۔ کہ سورج سامنے ہے۔ تو ہم یہ سمجھینگے۔ کہ یہ دس کروڑ آدمی پاگل ہو گیا ہے مگر یہ کبھی خیال نہیں کرینگے۔ کہ ہم نے سورج کو نہیں دیکھا۔ اسلئے کہ ہم سورج کو ان طریقوں سے دیکھ چکے ہیں۔ کہ جن طریقوں سے دیکھنے کے بعد شک پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

خیال اور واقع میں یہ فرق ہوتا ہے۔ کہ خیال میں عام طور پر صرف ایک حس شامل ہوتی ہے۔ اور علم میں کئی حسیں شامل ہوتی ہیں۔ مثلاً جب کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے۔ کہ فلاں جگہ ایک شخص کھڑا ہے لیکن وہ فی الواقع کھڑا نہیں۔ تو اگر وُہ اس شخص کو پکڑنے کے لئے ہاتھ مارےگا۔ تو اس پر ظاہر ہو جائیگا۔ کہ اس کی غلطی تھی۔ کیونکہ اس کے ہاتھ کو کچھ محسوس

نہوگا۔ مگر جب وہاں فی الواقع کوئی شخص کھڑا ہوگا۔ تو قوت لامسہ بینائی کی طاقت کی تائید کریگی۔ اور اسکو ہاتھ مارنے سے کوئی ٹھوس ٹھوس چیز محسوس بھی ہوگی۔ گو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ واہمہ کئی حسوں پر بھی قبضہ کرلیتا ہے۔ مگر یہ حالت جنون کی ہوتی ہے۔ جسکا نقص خود ہی ظاہر ہوجاتا ہے۔

مگر اس دھوکے کی اصلاح کا بھی ایک راستہ ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ اگر ایک شخص کو وہم ہو۔ تو وہ اپنے وہم کے ماتحت خواہ خود کچھ بھی دیکھے۔ مگر وہ دوسروں کو وہ چیز نہیں دکھا سکتا لیکن جب حقیقت ہوتی ہے۔ تو وہ دوسروں کو بھی اسکا نشان دکھا سکتا ہے پس جب میں کہتا ہوں۔ کہ اسلام یعنی احمدیت خدا تعالے سے انسان کو ملا دیتی ہے۔ تو اس سے مراد میری قوت واہمہ کا عمل نہیں کہ اسکے ذریعہ سے تو آج بھی ہر ایک مذہب کے پیرو خدا سے مل رہے ہیں۔ بلکہ میری مراد ایسی ہی یقینی ملاقات سے ہے۔ جیسی کہ یقینی چیزیں ہوا کرتی ہیں۔ یعنی کئی حواس اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ اور اسکے اثر لوگوں کو بھی دکھلائے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ بات ضرور ہے۔ کہ رؤیت عرفان کی ہوتی ہے۔ نہ کہ جسمانی آنکھ کی۔

اس امر کے ثبوت میں کہ اسلام سوال زیر بحث کا جواب اثبات میں دیتا ہے۔ اور خدا تعالے سے ملا دینے کا دعوے کرتا ہے مفصلہ ذیل آیات پیش کیجا سکتی ہیں قرآن کریم کے شروع میں اللہ تعالے فرماتا ہے۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (بقرہ ع ۱) یہ کتاب وہ موعود کتاب ہے جس کا وعدہ پہلی کتب میں دیا گیا تھا۔ اسمیں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ یہ کتاب متقیوں کو راستہ دکھاتی ہے اور ان کے مقام سے انکو اوپر لیجاتی ہے مطلب یہ کہ باقی مذاہب تو صرف متقی بنانے کا دعوے کرتے ہیں یعنی کہتے ہیں کہ جو شخص ہمارے طریق پر چلیگا۔ وہ متقی ہوجائیگا۔ لیکن اسلام صرف متقی بنانے کا دعوٰی نہیں کرتا۔ بلکہ متقی سے اوپر لیجاتا ہے۔ وہ صرف انسان کو وہی کام نہیں بتاتا۔ جو اس کے ذمہ ہیں۔ بلکہ جب وہ اسلام کے احکام پر عمل کرکے اپنی طرف سے تمام کوششیں کرچکتا ہے۔ تو پھر اسکو اسلام اوپر لیجاتا ہے۔ یعنی اللہ کی طرف سے بھی اسکی طرف توجہ ہوتی ہے۔ اور محبت اور کوشش صرف ایک طرف سے نہیں رہتی۔ بلکہ دونوں طرف سے اسکا ظہور ہونے لگتا ہے۔

اسی طرح ایک جگہ فرماتا ہے۔ کہ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ

الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۝ (نساء ع ۹) جو لوگ اللہ اور اسکے اس رسول یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کامل فرمانبرداری کرینگے۔ اللہ تعالیٰ ان کو چار مدارج عطا کریگا جنکو وہ علیٰ قدر مراتب حاصل کرینگے۔ جو سب سے اعلیٰ درجہ کے فرمانبردار ہونگے انکو نبیوں کا درجہ عطا کریگا۔ اور جو ان سے کم ہونگے انکو صدیقوں کا یعنی مقرب لوگوں کا درجہ دیگا۔ اور جو ان سے کم ہونگے۔ ان کو شہداء یعنی ان لوگوں کا کہ جنکی آنکھوں سے حجاب تو اٹھ گیا ہے۔ مگر وہ اس مقام پر نہیں پہنچے۔ کہ خدا کے دوستوں میں سے کہلا سکیں۔ اور جو ان سے بھی کم ہونگے۔ ان کو نیکوں کا یعنی وہ اپنے اعمال کو تو درست کر رہے ہیں۔ مگر ابھی ان پر خدا تعالے کیطرف سے کوئی کھڑکی نہیں کھولی گئی پھر فرمایا کہ یہ لوگ بطور مصاحبت کے اچھے ہیں۔ اگر انسان ان کی صحبت حاصل کرے تو وہ بھی اصلاح پا سکتا ہے۔ یہ مدارج جن کا اللہ تعالے کی طرف سے وعدہ دیا گیا ہے۔ خاص فضل کے طور پر ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے۔ یعنی اللہ تعالے اس امر سے آگاہ ہے۔ کہ اسی کی پیدا کی ہوئی غیر محدود ترقی کی خواہش انسان کے اندر موجود ہے۔ اور محبوب سے ملنے کی تڑپ اسکے اندر ودیعت کیگئی ہے پس اس خواہش کا پورا کرنا اللہ تعالے کے لئے ضروری تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے فضل کا سامان مہیا کردیا ہے۔ اب جو بندہ چاہے اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

ایک اور جگہ پر فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (یونس ع ۱) ضرور وہ لوگ کہ انہیں ہم سے ملنے کی خواہش نہیں ہے اور مادی اسباب اور مادی ترقیات پر راضی ہوگئے ہیں۔ اور انہی پر مطمئن ہیں۔ دنیا مل جائے تو سمجھتے ہیں۔ کہ جو کچھ ہمیں ملنا تھا۔ مل چکا۔ اب ہمیں کسی اور چیز کی حاجت نہیں۔ اور وہ لوگ جو ہمارے نشانات کو دیکھکر بھی جو ہم اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے دکھلاتے ہیں غفلت میں ہی پڑے رہتے ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں۔ کہ چونکہ حقیقی آرام کے سرچشمہ سے خود دور ہوتے ہیں۔ ان کو کبھی بھی راحت نہیں ملے گی۔ بلکہ اپنے اعمال کے نتیجہ میں روحانی

طور پر تکلیف ہی پاتے رہیں گے۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالٰے فرماتا ہے کہ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ (رحمٰن ع ۳) جو لوگ اپنے رب کے درجہ کو سمجھ لیتے ہیں۔ اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ ان کو دو جنّتیں دی جاتی ہیں۔ یعنی ایک اس دُنیا میں اور ایک مرنیکے بعد۔ اور ایک دوسرے مقام پر جنت کے اعلیٰ انعامات میں سے یہ انعام بیان فرماتا ہے۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (قیامۃ ع ۱) بعض چہرے یعنی وہ لوگ جو جنت میں داخل ہونگے بہت خوش ہونگے کیونکہ وہ اپنے رب کیطرف دیکھ رہے ہونگے۔ پس اس جہان میں جنت ملجانیکے یہ معنے ہیں۔ کہ اس جہان میں ان کو خدا تعالیٰ کا دیدار اور رؤیت نصیب ہوجائیگی۔ اور اپنی رُوحانی آنکھوں سے اسکی صفات کا عرفان حاصل کرلینگے۔ اور انکو اپنے نفس کے اندر جاری پائینگے۔

ایک جگہ فرماتا ہے۔ اُذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِیْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝ (بقرہ ع ۱۸) یعنی تم مجھے یاد کرو تو میں تم کو لقاء کے مقام پر ترقی دُونگا۔ اور میرا شکر کرو اور میری نعمتوں کا کفران نہ کرو یعنی جب دُنیا کے آرام کے ہیں۔ نے اسقدر سامان بہم پہونچائے تو اس اصل خواہش کو جس کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ کیوں پورا نہیں کرونگا۔

اب یہ سوال ہوتا ہے۔ کہ اس لقاء اور رؤیت کی اسلام کیفیت کیا بتاتا ہے؟ تو اسکا جواب یہ ہے۔ کہ ایسی لطیف چیز کی کیفیت بتانی تو طاقتِ انسانی سے بالا ہے۔ وہ کیفیت تو صرف دل کے سمجھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ جو شخص اس کیفیت کو حاصل کرتا ہے۔ وہی اسکو سمجھ سکتا ہے۔ دوسرے شخص کو اسکا سمجھانا آسان کام نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ذہنی کیفیت ہے۔ اور لوگ انہی کیفیات کو سمجھ سکتے ہیں جو ان پر طاری ہوچکی ہوں۔ مثلاً جس نے میٹھا کھایا ہے۔ انکو تو ہم یہ بتا سکتے ہیں۔ کہ میٹھے کا لطف کیا ہے۔ جب ہم یہ کہیں گے۔ کہ فلاں چیز میں بہت میٹھا تھا۔ فوراً اس شخص کے ذہن میں وہ کیفیت جو اس پر میٹھے کے کھانے سے طاری ہوتی ہے۔ آجائیگی لیکن وہ شخص جس نے کبھی میٹھا نہیں چکھا۔ اسے میٹھے کی کیفیت سمجھانی ناممکن ہے۔ سوائے اس کے کہ اسے اشارۃً نہیں سمجھایا جائے۔ مگر پھر بھی وہ اس حالت کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکے گا۔ ہاں بعض اثرات جو میٹھے کے دوسری چیزوں پر پڑتے ہیں جیسے تروجت اور رطوبت وغیرہ ان کے ذریعہ سے ہم اس کو یہ سمجھا سکینگے۔ کہ میٹھا نمکین وغیرہ سے

علیحدہ قسم کا مزہ رکھتا ہے۔ اور اصل سمجھانے کا طریق یہی ہوگا۔ کہ اس کے منہ میں ایک ڈلی میٹھے کی رکھدی جائے اور کہا جائے کہ یہ میٹھا ہے۔ اسی طرح لقاء اللہ کی کیفیت بھی لفظوں میں نہیں سمجھائی جاسکتی۔ ہاں چونکہ یہ مضمون انسان کے ایمان سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس پر انسان کی تمام رُوحانی ترقیات کا مدار ہے۔ اس کے آثار اللہ تعالٰے نے ایسے پیدا کردیئے ہیں۔ کہ جن کے ذریعہ سے یہ بات خوب روشن ہوجاتی ہے۔ کہ ایک زندہ خدا کی رؤیت اور اس سے تعلق فلاں شخص کو حاصل ہوگیا ہے بعینہٖ اسی طرح جس طرح کہ ایک دھات کی بنی ہوئی مشین کو جب بجلی سے جوڑ دیا جاتا ہے تو اسکے اندر ایک ایسی طاقت پیدا ہوجاتی ہے۔ کہ دیکھنے والے سمجھ جاتے ہیں۔ کہ اب اسکا تعلق کسی بڑی طاقت کی چیز سے قائم ہوگیا ہے۔ قدیم سے اسی طرح لقاء اللہ کے آثار ظاہر ہوتے چلے آئے ہیں۔ اور اب بھی اسی طرح ہوتے ہیں۔ نوح۔ ابراہیم موسٰی۔ مسیح اور محمد صلوات اللہ علیہم اور باقی تمام نبیوں کے تعلق باللہ کا حال خدا تعالٰے کی صفات کی جلوہ گری سے ہی ظاہر ہوا۔ ورنہ جو تعلق انکو خدا تعالٰے سے تھا۔ اس کی کیفیت نہ انکے زمانہ میں کوئی سمجھ سکا نہ اب سمجھ سکتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالٰے کی ذات وراء الوراء ہے۔ اس کا تعلق اور اس کی رؤیت ہوتی ہی صفات کے انعکاس سے ہے چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ یعنی تم خدا سے ملنا چاہتے ہو۔ تو خدا تعالٰے کی صفات کو اپنے اندر جذب کرو اور اپنے اخلاق صفاتِ الٰہیہ کے مطابق بناؤ۔

یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ان وجودوں سے تعلق جو وراء الوراء ہوں۔ عرفان کے ذریعہ سے ہی ہوسکتا ہے۔ اور عرفان جیسا کہ قرآن کریم نے اسکی تفصیل فرمائی ہے تین قسم کا ہوتا ہے اول علم الیقین۔ یعنی کسی چیز کا پتہ صرف اس کے آثار سے ظاہر ہو خود نہ دیکھی ہو۔ اور دوسرا درجہ عرفان کا عین الیقین ہے۔ کہ اس چیز کو خود بھی دیکھ لے صرف آثار تک بس نہ ہے لیکن ابھی اسکی حقیقت سے پوری طرح واقف نہو۔ تیسرا درجہ عرفان کا یہ ہے۔ کہ اسکی حقیقت سے اس حد تک واقف ہوجائے جس حد تک کہ اسکے ابنائے جنس کے لئے اس کی حقیقت سے آگاہ ہونا ممکن ہے۔ اور اسکے اثرات کو اپنی ذات پر پڑتا ہوا مشاہدہ کرے۔

ان تینوں علموں کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کوئی شخص مثلاً دور سے دھوآں دیکھے۔ تو اُسے یقین

ہوجائیگا۔ کہ وہاں آگ جل رہی ہے۔ مگر پھر بھی اسے کامل یقین نہ ہوگا۔ کہ بعض دفعہ آنکھ دھوکہ کھاتی ہے۔ اور گرد وغبار کو دھوآں سمجھ لیتی ہے۔ لیکن اگر وُہ قریب ہو جائے اور آگ کو شعلے مارتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھ لے تو اس کا یقین آگے بڑھ جائیگا۔ مگر پھر بھی خود اس کے نفس کو آگ دیکھنے سے آگ کی پوری کیفیت نہ معلوم ہوئی۔ مگر وُہ اگر اس کے اندر ہاتھ ڈالکر دیکھے۔ اور اسکے جلانیکی کیفیت کا ملاحظہ کرے۔ تو پھر اسکا یقین اپنے کمال کو پہنچ جائیگا۔ گو ان تینوں قسم کے یقینوں کے پھر اور بھی مدارج ہیں لیکن بڑی تقسیم یہی ہے۔ اور ان مدارج کے حصُول کی خواہش طبیعت میں رکھی گئی ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ بچے جب ذرا ہوش سنبھالتے ہیں۔ تو ضرور ایکدفعہ آگ کے شعلے میں ہاتھ ڈالکر دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہ اسکا اثر کیا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ کہ ایک بچہ بھی شاید دُنیا میں ایسا نہ ہوگا جس نے کبھی نہ کبھی اس خواہش میں اپنا ہاتھ نہ جلایا ہو۔

مذکورہ بالا تینوں مدارجِ عرفان کو اسلام پیش کرتا ہے۔ پہلا درجہ عرفانِ الٰہی کا یہ ہے۔ کہ انسان اس کی صفات کے متعلق لوگوں سے سنتا ہے۔ کہ وُہ اس طرح ظاہر ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً پہلے بزرگوں کے واقعات کو پڑھتا ہے۔ کہ ان کے ساتھ خدا تعالےٰ کا اس اس طرح کا معاملہ تھا۔ تو اس کے دل میں ایک حد تک یقین پیدا ہوتا ہے۔ کہ فی الواقع کوئی بات ضرور ہے۔ لیکن یہ یقین ایک عارضی جوش پیدا کر سکتا ہے۔ زیادہ نہیں۔ کیونکہ جب وُہ خود اس کوچے کیطرف قدم اٹھاتا ہے۔ اور اس شخص کی طرح جو دور سے دھوآں دیکھکر آگ کی تلاش میں چل پڑتا ہے لیکن جسقدر دور چلتا جائے دھوآں ہی دھوآں اسے نظر آتا ہے۔ آگ کا پتہ کچھ نہیں ملتا۔ آخر مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور یہ خیال کر لیتا ہے۔ کہ یہ دھوآں میری آنکھ کا دھوکا ہے شائد کہ کوئی بادل کا ٹکڑہ ہو یا کچھ اور۔ اسی طرح وہ شخص جو اس پرانے قصوں کے حاصل ہوتے ہوئے علم سے تسلی پا کر خود کوشش کرنے لگتا ہے۔ آخر مایوس ہو جاتا ہے۔ صرف وہی لوگ ان قصوں سے تسلی پاتے ہیں۔ جو خود کچھ حاصل کرنیکی کوشش نہیں کرتے۔ اور اسوجہ سے ان کے یقین کے باطل ہونے کا ان کو موقعہ ہی نہیں ملتا۔ مگر یہ حالت ہرگز قابلِ رشک نہیں ہے۔

اسلام صرف پہلے ہی درجہ تک انسان کے عرفان کو محدود نہیں کرتا۔ بلکہ جیسا کہ بتایا گیا ہے وہ تینوں قسم کے عرفانوں کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھلا رکھتا ہے۔ اور اس کا دعوٰی ہے کہ

جب بھی کوئی خدا تعالےٰ کیطرف اسلام کے بتائے ہوئے قواعد کے مطابق قدم بڑھاتا ہے۔ وہ اپنی کوشش کے مطابق عرفان پا لیتا ہے۔ اور کوئی عرفان کا مقام نہیں۔ جو خدا تعالےٰ نے اپنے بندوں کے لئے اب بند کر دیا ہو۔ حالانکہ وُہ پہلے لوگوں کے لئے کھلا تھا۔

میں بتا چکا ہوں۔ کہ اصل عرفان تو وہ کیفیتِ خالص ہے۔ جو انسان کے قلب میں پیدا ہوتی ہے۔ اور وُہ روحانی بینائی کی حدّت ہے۔ جس سے وُہ خدا تعالےٰ کی صفات کو ایک نئے رنگ میں دیکھتا ہے۔ اور وُہ احساسات کی تیزی ہے جن سے انسان اپنے آپکو خدا تعالےٰ کی صفات میں لپٹا ہوا پاتا ہے۔ مگر جسطرح ہر ایک چیز کے کچھ آثار ہوتے ہیں۔ خدا تعالےٰ کے لقاء کے بھی کچھ آثار ہیں جنکے ذریعہ سے بندہ اسکے تعلق کو محسوس کرتا ہے۔ اور دوسرے لوگ بھی اسکے تعلق کو محسوس کرتے ہیں کیونکہ یہ ظاہر بات ہے۔ کہ جب کوئی چیز کسی دوسری چیز کے قریب ہوتی ہے۔ تو اگر وہ دوسری چیز اپنے اندر کوئی خاص خصُوصیت رکھتی ہے۔ تو اسکا اثر اسپر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً آگ کے پاس بیٹھکر انسان کو گرمی محسوس ہوتی ہے۔ برف کے پاس بیٹھے تو اسکی سردی کا اثر اس پر پڑنے لگتا ہے۔ خوشبودار چیز سے چھُوئے تو اسکے کپڑوں میں سے بھی خوشبو آنے لگتی ہے یا بولنے والی ہستی سے قریب ہو جائے تو اسکی آواز کی پیدا کی ہوئی حرکت کی لہریں اس کے کان کے پردوں سے بھی ٹکرانے لگتی ہیں۔ اور یہ اس بولنے والے کے علم سے حصہ لینے لگتا ہے پس ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص خدا تعالےٰ کا لقاء حاصل کرے۔ تو کچھ آثار اس کی ذات میں ایسے پائے جائیں۔ جو اس پر دال ہوں۔ کہ اسے فی الواقع خدا تعالےٰ کا قرب حاصل ہوا ہے۔ ورنہ اگر منہ کے دعوے سے کچھ زیادہ نہ ہو۔ تو ایک مکار۔ فریبی اور راستباز خدا پرست کے دعووں میں کیا فرق رہے۔ اور دوسرے لوگ لقاء کے مقام والے کو دیکھکر کیا فائدہ حاصل کریں اسلام نے تین مدارج لقاء کے بتائے ہیں۔ جن کے آثار سے ان کی کیفیت معلوم ہو جاتی ہے۔ وہ ایک طرف تو لقاء ہیں۔ اور دوسری طرف خدا تعالےٰ پر یقین بڑھانیکا ایک ذریعہ (۱) پہلا درجہ دُعا کی قبولیت کا ہے (۲) دوسرا درجہ کلام الٰہی کا ہے (۳) تیسرا درجہ صفات الٰہیہ کے بندے کو اپنی آغوش میں ڈھانپ لینے کا ہے۔

پہلا درجہ یعنی دُعا کی قبولیت کا۔

اسلام کا یہ دعوٰی ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے انسانوں کو اپنی ذات کا یقین دلانے کے لئے اور اپنے وجود کا علم دینے کے لئے اور اپنی

طرف کھینچنے کے لئے دُعا کا دروازہ کھولا ہے یعنی خدا تعالےٰ سے اگر کوئی انسان دعا کرتا ہے تو خدا تعالےٰ اسے قبول کرتا ہے۔ بشرطیکہ دعا اس طریق پر ہو۔ اور اس حد تک ہو جس حد تک کہ دُعا ہونی چاہئے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ۚ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ (النمل ع ۵) وہ کون ہے جو مضطر کی دعا سنتا ہے۔ جب وُہ اسے پکارتا ہے اور اس دعا کو قبول کرکے اس پکارنے والے کی تکلیف کو دُور کرتا ہے۔ اور جو ظالم ہو۔ اس کے ظلم کو دور کرکے اس مظلوم فریادی کو اس کی جگہ پر قائم کر دیتا ہے؟ کیا اس خدا کی طاقت کا کوئی اور بھی ہے؟ مگر تم لوگ نصیحت نہیں حاصل کرتے۔

اس درجہ کو اللہ تعالےٰ نے سب کے لئے کھلا چھوڑا ہے۔ یعنی خواہ کسی مذہب کا آدمی ہو۔ اس کی دعاؤں کو جب وُہ سخت گھبراہٹ میں کیجائیں سنتا ہے۔ اور اس طرح اس امر کا موقع دیتا ہے۔ کہ وُہ خدا تعالےٰ کی زندگی اور اس کے تعلق کو محسوس کریں۔ اور شک وشبہ کی حالت سے نکلیں۔ اور اس میں کیا شک ہے۔ کہ انسان کو خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ عرفان ہر حالت کے لوگوں کو ملنا چاہئے۔ کیونکہ انسان توجہ بھی تبھی کرتا ہے جب اسکے دل میں کسی چیز کی اہمیت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ مقام جیسا کہ میں نے بتایا ہے۔ سب مذاہب کے لوگوں کے لئے کھلا ہے۔ ہر مذہب کے لوگ خدا سے دعا کرکے دیکھ سکتے ہیں۔ وہ اس کا فائدہ محسوس کرینگے۔ اور ان کو معلوم ہوگا۔ کہ بہت سی مشکلات جن سے وُہ پہلے تکلیف پاتے تھے۔ دعا کے ذریعہ سے حل ہو جائینگی۔ مگر یہ درجہ عرفان کا بہت ہی ناقص درجہ ہے کیونکہ ہر وقت یہ شبہ انسان کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ شاید جو کام دعا کے بعد ہو گیا ہے۔ اس نے یوں بھی ہو ہی جانا تھا۔ اور شاید جو مصیبت رک گئی اس نے یوں بھی رک جانا تھا۔ کیونکہ بسا اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ اتفاقات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ ہونا ہوا کام رک جاتا ہے۔ اور مشکل کام ہو جاتا ہے۔ اور اس کے لئے دعا بھی کوئی نہیں کی گئی ہوتی۔ بلکہ بعض اوقات وہ شخص جس سے یہ معاملہ گزرا ہوتا ہے۔ دعا کا قائل ہی نہیں ہوتا۔

علاوہ ازیں اس درجہ میں ایک یہ بھی نقص ہوتا ہے۔ کہ یہ بعض طبعی قوانین سے

مشابہ ہے یعنی مسمریزم اور ہپنوٹزم ان دونوں طبعی قوانین کے ذریعہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ کئی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ اور کئی تکالیف دفعہ ہو جاتی ہیں۔ پس شبہ پڑتا ہے۔ کہ شائد دعا اسی قسم کی کوئی چیز ہو۔ خدا تعالےٰ کی طرف سے کوئی مدد نہ آتی ہو۔ بلکہ صرف اجتماع توجہ کے سبب سے بعض نتائج پیدا ہو جاتے ہوں۔ گو یہ شبہات اس درجہ کی دُعا کے متعلق پیدا ہو سکتے ہیں لیکن پھر بھی بحیثیت مجموعی یہ ایک حد تک یقین کا ذریعہ ہے۔ اور لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں میں نے جو یہ کہا ہے۔ کہ اس درجہ کی دعا کے متعلق یہ شبہات ہو سکتے ہیں۔ تو میرا یہ مطلب ہے۔ کہ ایک درجہ دُعا کا اور ہے۔ جو بالکل یقینی ہے۔ مگر وہ اگلی قسم کے عرفانوں میں شامل ہے اسکا ذکر انہی کے ساتھ کرونگا۔

دوسرا درجہ عرفان کا **کلام الٰہی** ہے۔ اسلام اس درجہ کے متعلق خاص زور دیتا ہے۔ دوسرے مذاہب عام طور پر اس دروازہ کو بند سمجھتے ہیں۔ لیکن عقل اس امر کو نہیں تسلیم کر سکتی۔ کہ وہ خدا جو اپنے بندوں کو اپنی ہستی کا یقین دلانے کے لئے پہلے کلام کرتا تھا اب اس نے کلام کرنا بالکل ہی بند کر دیا ہے۔ خدا تعالےٰ کی صفات تو ہمیشہ قائم رہتی ہیں۔ وہ تو نقص اور زوال سے پاک ہے۔ پھر یہ خاموشی جو سینکڑوں سال سے شروع ہو کر اب ہزاروں تک پہنچنے والی ہے۔ کیوں ہے؟ اگر وُہ کلام نہیں کرتا تو کیونکر سمجھا جائے۔ کہ وہ سُنتا ہے؟ اور پھر کیونکر سمجھا جائے کہ اسکی باقی صفات درست ہیں؟ کیا کسی کا حق نہیں۔ کہ اس کے کلام کے . . . . بند ہو جانے پر یہ سوال کرے۔ کہ کیوں یہ نہ سمجھا جائے۔ کہ اب وہ دیکھتا بھی نہیں اور اسکا علم بھی جاتا رہا ہے۔ اور وہ حفاظت بھی اب نہیں کر سکتا۔ بلکہ دنیا کا کارخانہ اب آپ ہی آپ چل رہا ہے؟ اگر باقی صفات اسکی اسیطرح کام کر رہی ہیں۔ کہ جسطرح پہلے کام کرتی تھیں تو اسکے کلام کا سلسلہ کیوں بند ہو گیا ہے؟ وہ ورلڈ الوراء ہے۔ اور اس کی ذات کا یقین دلانے کے لئے اسکی رویت تو ممکن ہی نہیں ایک اسکا کلام تھا۔ جو لوگوں کو اس کے وجود ہونیکا علم دیا کرتا تھا۔ اب یہ راستہ بھی اگر بند ہو گیا ہے۔ تو پھر اس پر یقین دلانیکا اور کونسا راستہ کھلا ہے؟

اے بھائیو اور بہنو! اسلام کہتا ہے۔ کہ یہ خیال کہ خدا کے کلام کا سلسلہ بند ہو گیا ہے درست نہیں۔ وہ اب بھی اسی طرح بولتا ہے۔ جس طرح پہلے بولتا تھا۔ وہ اب بھی اسیطرح

اپنے بندوںکو یاد کرتا ہے جسطرح پہلے یاد کرتا تھا۔ بلکہ اس نے اپنی طرف ہدایت دینے کیلئے کلام کا سلسلہ بھی دعا کے سلسلہ کیطرح وسیع کیا ہوا ہے۔ اور ایسے لوگوںکو بھی جو خدا کے دین سے دور ہوتے ہیں۔ کبھی الہام ہوجاتا ہے۔ تاکہ وہ راستبازوں کے کلام پر شک نہ کریں بلکہ ان کی صداقت پر گواہ ہوں۔

قرآن کریم فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ (حٰم سجدہ ع)

وہ لوگ جو کہتے ہیں۔ کہ خدا ہمارا رب ہے۔ پھر اس امر پر قائم ہوجاتے ہیں کوئی مصیبت ان کو ڈراتی نہیں۔ اُنپر فرشتے یہ کلام لیکر نازل ہوتے ہیں کہ ڈرو نہیں اور نہ اپنے نقصانات پر غم کھاؤ بلکہ خوش ہو اس جنت پر کہ جسکا تمکو وعدہ دیا گیا ہے۔ ہم تمہارے ورلی زندگی میں بھی دوست ہیں۔ اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی دوست رہینگے۔ اور تمہیں وہ چیز ملیگی۔ جو تمہارے نفسوںکی خواہش ہے۔ اور جو کچھ مانگوگے وُہ ملیگا۔ یعنی لقائے الٰہی کی خواہش جو مومنوںکی اصل خواہش ہوتی ہے۔ اعلیٰ اور اکمل طور سے پوری ہوگی۔

اس آیت سے ظاہر ہے۔ کہ اسلام کلام الٰہی کے نزول کا دروازہ کھلا سمجھتا ہے بلکہ اس کا وعدہ کرتا ہے۔ اور یہ امر ظاہر ہے۔ کہ جس سے خدا تعالےٰ براہِ راست یا بذریعہ ملائکہ کلام کریگا۔ اس کا یقین اور ایمان اللہ تعالےٰ پر کسقدر بڑھ جائیگا۔ اور اسکے دل کو کسقدر تقویت حاصل ہوجائے گی کیونکہ کلام سننا بھی ایک قسم کی رؤیت ہی ہے۔ اگر جنگل میں کوئی دوست جُدا ہوجائے۔ اور وہ ہمیں آواز دیدے۔ کہ میں فلاں جگہ موجود ہوں۔ تو ہمارا خطرہ اسی طرح دُور ہوجاتا ہے جسطرح کہ دیکھ لینے سے پس جس شخص سے اللہ تعالےٰ کلام کرے۔ اسکے دل کو خدا تعالیٰ پر ایسا ہی یقین ہوجانا چاہیے۔ جیسا کہ دیکھی ہوئی چیز کا ہوتا ہے۔

اسلام کا یہ دعویٰ ہی نہیں بلکہ تیرہ سو سال سے برابر آجتک مسلمانوں میں ایسے انسان پیدا ہوتے چلے آئے ہیں۔ کہ جن سے خدا نے کلام کیا ہے۔ اور یہ امر تواتر کی حد تک پہنچا ہُوا ہے

پس اسکے متعلق شک کرنا گویا سفسطہ کا دروازہ کھولنا ہے۔ اس زمانہ میں حضرت مسیح موعودؑ پر خدا کا کلام نازل ہوا۔ اور آپکی قوت قدسیہ کے اثر سے اور ہزاروں آدمیوں کو اس جماعت میں سے خدا کا کلام سُننا میسر ہوا حتیٰ کہ میں سمجھتا ہوں کہ کم سے کم پچاس فیصدی احمدی ہونگے جنہوں نے کسی نہ کسی رنگ میں خدا تعالےٰ کا کلام سُنا ہوگا۔ اور ان کے ایمان اور یقین کو اس سے تقویت حاصل ہوئی ہوگی۔

ایک بات اس جگہ یاد رکھنی چاہیے۔ کہ خدا کے کلام سے میری مراد وہ تشریح نہیں ہے جو آجکل لوگ سمجھتے ہیں۔ یعنی کوئی خیال نیک ان کے دل میں زور سے پڑجائے۔ تو وُہ اُسے الہامِ الٰہی قرار دے لیتے ہیں۔ بلکہ بعض لوگ ناواقفیت کی وجہ سے اسقدر ترقی کر گئے ہیں کہ وُہ خیال کرتے ہیں کہ کبھی خدا تعالیٰ کا کلام الفاظ میں نازل نہیں ہوا۔ بلکہ نبیوں کے دلی خیالات کا نام ہی کلامِ الٰہی رکھ لیا گیا ہے۔ اسلام اس امر کا ہرگز قائل نہیں بلکہ اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے۔ کہ الہامِ الٰہی الفاظ میں نازل ہوتا ہے۔ اور اسی طرح بندے سے خدا ہمکلام ہوتا ہے جسطرح کہ ایک انسان دوسرے انسان سے ہمکلام ہوتا ہے۔ ایسی ہی آواز پیدا ہوتی ہے جس طرح کہ انسانوںکے کلام میں پیدا ہوا کرتی ہے۔ اور اسی طرح انسان آواز کو سنتا ہے جسطرح کہ وُہ روزمرہ کلام سنتا ہے۔ صرف فرق یہ ہے۔ کہ الہامی آواز نہایت شاندار ہوتی ہے اور اسکے اندر رُعب ہوتا ہے۔ اور باوجود رعب کے اسکے اندر ایسی لذت اور راحت ہوتی ہے۔ کہ انسان پر ایک ربودگی کی حالت طاری ہوجاتی ہے۔ اور وُہ خیال کرتا ہے۔ کہ وہ گویا اوپر کیطرف کھینچا گیا ہے اور کوئی بڑی طاقت اسپر مستولی ہوگئی ہے۔ تب کوئی لطیف کلام یا اس کے کانوں پر ڈالا جاتا ہے جسے وہ سنتا ہے۔ یا اس کی زبان پر نازل کیا جاتا ہے جسے وہ پڑھتا ہے یا لکھا ہوا اسکے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ جسے وہ یاد کرلیتا ہے مگر اس تمام عرصہ میں اس پر ایک حالت ربودگی کی طاری رہتی ہے۔ تاکہ اس امر کا ثبوت رہے۔ کہ یہ سب اس کا وہم اور خیال نہیں ہے۔ بلکہ ایک بالائی طاقت کیطرف سے یہ سب کچھ ہورہا ہے۔

الہام کی ان اقسام کے علاوہ دو اور اقسام بھی ہیں۔ جو بجائے الفاظ کے تصویری زبان میں نازل ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک قسم خواب کہلاتی ہے۔ جو کامل نیند کے عرصہ میں

ہوتی ہے۔ اور اس میں کوئی امر بطور استعارہ کے کسی شکل میں دکھایا جاتا ہے جیسے مثلاً دودھ دکھایا گیا تو اس سے مراد علم ہوگا۔ اور بھینس دکھائی گئی تو اس سے مراد وبا اور بیماری ہوگی۔ دُوسری قسم کشف کی ہے۔ جو اس طرح ظاہر ہوتی ہے۔ کہ انسان کامل ہوش میں بعض وفات یافتوں سے ملاقات کر لیتا ہے۔ یا بعض امور جو کہیں اور جگہ پر ہو رہے ہیں دیکھ لیتا ہے۔ حالانکہ وہ اپنی جگہ اپنے کام میں مشغول ہوتا ہے۔ اس قسم کے نظارہ کو اسلامی اصطلاح میں **کشف** کہتے ہیں۔ یہ سب اقسام قرآن کریم سے ثابت ہیں۔ مگر ان کا تفصیلی ذکر مضمون کو بہت لمبا کر دیگا۔

غرض یہ کہ اسلام الہام کی تشریح یہ نہیں کرتا۔ کہ یونہی دل میں ایک خیال پیدا ہو جائے ایسا خیال محض الہام کی نعمت سے دوری کیوجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اور اگر اسکو صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ تو الہام کی حقیقت کچھ باقی ہی نہیں رہتی۔ خالی خیال اور تحریک قلبی تو دُنیا کے ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور اگر یہ الہام ہے۔ تو پھر جو خیال کسی کے دل میں پیدا ہو وہ اسے الہام قرار دے سکتا ہے۔ تب تو دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں جو الہام سے خالی ہو۔ کلامِ الٰہی تو وُہ ہونا چاہیئے۔ جو یقین اور وثوق کی راہ پیدا کرے نہ کہ وساوس اور شبہات کا دروازہ کھولے۔ اور اگر الہام دل کے خیالات یا تحریک کا نام ہو۔ اور لفظی الہام نہ ہوتا ہو۔ تب تو بہت سے لوگ اس مُصیبت میں مبتلا ہو جائینگے۔ کہ جو خیال انکے دل میں پیدا ہوگا۔ وہ اسے الہام سمجھ لیں گے۔ آخر اللہ تعالےٰ کی طرف سے جو بات آتی ہے۔ اس کے اندر اسقدر امتیاز تو ہونا چاہیئے۔ کہ محض خیال اور وہم اسکا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اور یہ نہ ہو۔ کہ بلا وجہ اور بلا قصور لوگ گرفت میں آجائیں۔ آخر وہ کونسا امتیاز ہوگا جس سے انسان یہ سمجھے کہ یہ میرے دل کا خیال ہے۔ الہام نہیں یا یہ کہ الہام ہے دل کا خیال نہیں۔ یا میری تحریر ہے خدا کی نہیں۔ یا خدا کی ہے میری نہیں۔ اگر کہو۔ کہ اس وقت ساتھ ہی یہ بھی خیال ہوگا۔ کہ یہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہے میری طرف سے نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ جب ہم دلی خیال کو الہام کہنے لگیں۔ تو دماغ کو یہ خیال پیدا کرتے کونسی دیر لگے گی۔ کہ یہ تیرا خیال نہیں بلکہ الہام ہے؟ درحقیقت اس قسم کا خیال نہ صرف مذاہب کے اعتبار کو کھونے والا ہے۔ بلکہ وہم اور وسوسہ اور خدا پر جرأت کو اسقدر بڑھا نیوالا ہے۔ کہ اس قسم کے خیال والوں کیلئے خطرہ ہے۔ کہ وہ تھوڑے تھوڑے دھوکہ سے ایک نیا مذہب بنالیں اور حقیقت سے دُور جا کر خود بھی

ٹھوکر کھائیں۔ اور دوسروں کو بھی ٹھوکر کھلائیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ لفظی الہام کے متعلق بھی بعض لوگوں کو وسوسہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ دماغ کے بعض نقص ایسے بھی ہیں۔ کہ جن کی وجہ سے انسان کو مختلف نظارے نظر آجاتے ہیں یا بعض دفعہ الفاظ بھی سنائی دیتے ہیں۔ مگر اس میں ایک بچاؤ ہے۔ اور وُہ یہ کہ اس صورتِ الہام میں تو اسی کو دھوکہ لگ سکتا ہے۔ جو پاگل ہو۔ اور اسکے دماغ میں نقص ہو لیکن صورتِ اول میں تو ایک تھوڑے سے وسوسہ سے بالکل سمجھدار آدمی اپنے خیالات کو الہام قرار دے سکتا ہے۔ اور اس کے دھوکے کو دور کرنیکی کوئی صُورت ہی اسکے پاس باقی نہیں رہتی۔

غرض جیسا کہ میں بتا چکا ہوں۔ کہ یہ وسوسہ کہ الہام دلی خیال کا نام ہے۔ الہام سے دُوری کے سبب سے ہوا ہے۔ اگر ایسے لوگوں کو خدا تعالےٰ کا الہام ایک دفعہ بھی ہوتا۔ تو یہ اس دھوکے میں نہ پڑتے۔ اور سمجھ جاتے۔ کہ اللہ تعالےٰ پُر ہیبت اور ساتھ ہی دلکش آواز میں لفظوں میں کلام نازل کرتا ہے۔ جسے اس کے بندے اسی طرح سنتے ہیں جس طرح دوسرے کلاموں کو۔ اور اس میں کسی وہم یا خیال کا گمان نہیں ہو سکتا۔ خدا تعالےٰ کے فضل سے راقم مضمون بھی اس کا تجربہ کار ہے۔ اور اپنے تجربہ کی بناء پر کہہ سکتا ہے۔ کہ **خدا کا کلام الفاظ میں نازل ہوتا ہے محض خیال کے طور پر نہیں۔**

اس جگہ پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ قرآن کریم کے نزدیک ہر ایک الہام یا خواب یا کشف خدا تعالےٰ کی طرف سے نہیں ہوتا۔ بلکہ اسلام اس امر کو تسلیم کرتا ہے۔ کہ الہام یا خوابیں کئی اقسام کی ہوتی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ؕ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۚ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۙ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۔ (النجم ع ۱) ہم اس بے جڑ بُوٹی کو بطور شہادت پیش کرتے ہیں۔ جب وہ گر جائے یعنی جس طرح وہ بُوٹی جس کی جڑ نہ ہو۔ اگر اونچی ہو۔ تو گر جاتی ہے اسی طرح جو شخص نبوت کے دعویٰ میں جھُوٹا ہوتا ہے۔ خواہ الہام کا بنانے والا ہو۔ خواہ دھوکا خوردہ ہو۔ چونکہ اس کی تعلیم کی بنیاد ان رُوحانی علوم پر نہیں ہوتی۔ جو کسی سلسلہ کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس لئے جب اس کی جماعت بڑھنے لگتی ہے تو اس میں انحطاط کے آثار پیدا

ہونے لگجاتے ہیں۔ اور وُہ بلند و بالا نہیں ہوسکتی یعنی ایک مستقل مذہب کی صورت اختیار کرنے سے پہلے اس کی تباہی شروع ہوجاتی ہے۔ وہ دوسرے مذاہب کے مقابل میں سر اُونچا کرکے نہیں کھڑا ہوسکتا۔ بلکہ ایک فرقہ کی ہی صُورت میں ہوتا ہے۔ کہ اس کا سر نیچے ہوجاتا ہے۔ پھر فرماتا ہے تمہارا ساتھی گمراہ نہیں ہوا۔ اور نہ وہ شرارت سے یہ دعوےٰ کرتا ہے یعنی نہ تو اسکو دھوکا لگا ہے اور نہ یہ جانتے ہوئے کہ مجھے کوئی الہام نہیں ہوتا فریب سے الہام بناتا ہے۔ اور نہ وہ اپنی خواہشات کے سبب سے کلام کرتا ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہوا۔ کہ اس کی خواہشات نے اس کے سامنے بعض نظارے بنا کر دکھلائے ہوں۔ اور وُہ انکو الہام سمجھ بیٹھا ہو۔ بلکہ اس کو الہام ہوا ہے۔ جو کسی اور طاقت نے کیا ہے۔ مگر یہ شبہ نہ کرنا کہ شیطان کی طرف سے الہام ہوا ہے۔ بلکہ اس کا الہام کرنے والا وہ طاقتور خدا ہے۔ جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے پس وہ اپنی قوت اور طاقت کے اظہار سے اس امر کو ثابت کردیگا۔ کہ اس کا الہام سچا ہے۔ اور خدا کی طرف سے ہے اور اس کی جماعت بڑھے گی۔ اور تنے والے درخت کی طرح اونچی ہوگی۔ اور تمام طبائع اور علوم کے لوگ اس میں داخل ہونگے۔ اور زمانہ اس کو مٹا نہیں سکیگا۔ اور وُہ دوسرے کثیر التعداد مذاہب کے سامنے سر اونچا کرکے کھڑا ہوگا۔ اور ان میں سے گنا جائیگا۔

اس آیت میں الہام کی چار قسمیں بیان فرمائی ہیں ایک وُہ الہام جس کے منبع کا پتہ لگانا انسان کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ یعنی جو دماغ کی خرابی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ دوسرے وُہ الہام جو نفسانی خواہشات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور انسان سوچے تو معلوم کرسکتا ہے۔ کہ جو خیالات میرے دل میں پیدا ہوتے تھے۔ انہی کے مطابق میں نے نظارہ دیکھ لیا ہے۔ تیسرے وہ الہام جو شیطانی ہوتا ہے یعنی جس میں روحانیت کے خلاف بے دینی اور بدی کی تعلیم ہوتی ہے۔ اور چوتھے وہ الہام جو خدا تعالےٰ کیطرف سے نازل ہوتا ہے۔

پس جب میں یہ کہتا ہوں۔ کہ الہام کو اسلام خدا تعالےٰ کی ملاقات کا ایک ذریعہ قرار دیتا ہے۔ تو اس سے میری یہ مراد نہیں۔ کہ ہر خواب اور الہام ایسا ہے۔ میں اس امر کو تسلیم کرتا ہوں۔ اور قرآن کریم جدید تحقیق سے بہت پہلے خوابوں کے متعلق بیان فرما چکا ہے۔ کہ ان کی دو قسمیں طبعی ہیں۔ ایک تو وہ جو دماغی خرابی کے نتیجہ میں آتی ہیں۔ اور دوسری وہ جو

خواہشاتِ نفسانی کے نتیجہ میں آتی ہیں۔ بلکہ میرا مطلب صرف اُن الہامات سے ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں۔ اور نفسانی یا خواہشات سے پیدا ہونے والے الہاموں سے ممتاز ہوتے ہیں۔

مگر بہرحال چونکہ الہامات کی اور اقسام بھی ہیں۔ اس لئے عام الہام بھی عرفان کے لئے اس قدر مفید نہیں۔ کیونکہ کامل عرفان کے لئے ذریعہ بھی ایسا یقینی ہونا چاہئے۔ کہ جو اپنی ذات میں کامل ہو۔ اور اس کے بعد شک و شُبہ کی گنجائش ہی نہ رہے۔

یاد رکھنا چاہئے۔ کہ میں نے عام الہام کے الفاظ اس لئے استعمال کئے ہیں۔ کہ مذکورہ بالا شبہات صرف عام الہام کے متعلق ہی پیدا ہو سکتے ہیں۔ ورنہ دُعا کی طرح الہام اور وحی کا بھی ایک ایسا درجہ ہے۔ جو تیسری قسم کا عرفان پیدا کرتا ہے۔ اور جسے اس تیسری قسم کے نیچے بیان کیا جائیگا۔ ورنہ عام الہام دوسری قسم کا عرفان تو پیدا کرسکتا ہے یعنی عین الیقین تک تو پہونچا دیتا ہے۔ مگر اس سے اُوپر نہیں لیجاتا۔

دونوں قسموں کے عرفانوں کو بیان کرنے کے بعد اب میں تیسری قسم کے عرفان کا بیان کرتا ہوں۔ اسلام اس قسم کے عرفان یعنی **حق الیقین** کے پیدا کرنیکا بھی دعویدار ہے۔ اور اس پر بڑے زور سے اصرار کرتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو حکم ہے۔ کہ پانچوں نمازوں میں دن رات میں کوئی چالیس پچاس دفعہ یہ دُعا خدا تعالےٰ سے کیا کریں۔ کہ اے خدا تو ہمیں صراطِ مستقیم دکھا۔ اور وُہ صراطِ مستقیم دکھا۔ جس پر پہلے لوگ گذر چکے ہیں۔ جن پر تو نے انعام کیا تھا۔ اور قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا ہے۔ کہ "انعام والے لوگوں سے وُہ لوگ مراد ہیں۔ جن کو خدا تعالےٰ نے نبوت کے مقام پر یا صدیقیت یا شہادت یا صالحیت کے مقام پر کھڑا کیا ہے" (نساء ع ۹) یعنے یا تو وہ نبی ہیں یا نبیوں کے قریب پہونچے ہوئے ہیں۔ یا وُہ نبوت کے مقام کے قریب تو نہیں مگر ہیں خدا تعالےٰ کی صفات سے حصہ لینے والے اور اس رتبہ پر پہونچے ہوئے ہیں۔ کہ اللہ تعالےٰ کی صفات کے عملی اثرات کو لوگوں کے سامنے پیش کرسکتے ہیں۔ اور اپنے تجربہ کی بناء پر لوگوں کو خدا تعالےٰ کی صفات کی طرف رہنمائی کرسکتے ہیں۔ یا وہ شہادت کے درجہ کی قابلیت پیدا کررہے ہیں۔ ان مقامات میں سے پہلے تین مقامات ہی دراصل وُہ مقامات ہیں۔ جن پر

پہونچ کر انسان شک وشبہ سے پاک ہوجاتا ہے۔

ہمیں کیا فائدہ ہے۔ اس امر پر زور دینے کا کہ خدا تعالےٰ علیم ہے۔ جبتک کہ اسکے علم کا ہم کو یقینی ثبوت نہیں ملتا؟ جبتک ہم اپنی آنکھوں سے اسکے علم کا مشاہدہ نہ کریں۔ ہم کس طرح تسلی سے بلکہ میں کہتا ہوں دیانتداری سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ فی الواقع علیم ہے۔ خدا تعالیٰ کی نسبت کہا جاتا ہے۔ کہ وہ زندہ کرتا ہے۔ اگر ہم اس کا کوئی ثبوت نہیں دیکھتے۔ کہ وُہ زندہ کرسکتا ہے۔ تو ہم کس طرح یقین سے بلکہ میں کہتا ہوں دیانتداری سے کہہ سکتے ہیں۔ کہ وہ فی الواقع مُردوں کو زندہ کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ وہ خالق ہے لیکن ہم تو دیکھتے ہیں۔ کہ ایک خاص قانون کے ماتحت سب کچھ ہو رہا ہے۔ پھر ہم کس طرح مانیں۔ کہ اس پیدائش میں خدا کا بھی کوئی دخل ہے۔ اور ہم کس طرح وثوق سے بلکہ میں کہتا ہوں دیانتداری سے کہہ سکتے ہیں کہ واقع میں خدا خالق ہے پھر ہم کہتے ہیں۔ کہ ہر ایک چیز اس کے قبضہ میں ہے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ہزاروں انسان اسکی ذات کا بھی انکار کرنے والے موجود ہیں۔ پھر جبکہ ہم اسکے تصرف کا ظاہر میں کوئی نشان نہیں دیکھتے۔ تو ہم کس طرح علم کی بناء پر بلکہ میں کہتا ہوں کہ دیانتداری سے کہہ سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو دنیا کی چیزوں پر تصرف حاصل ہے یہی حال سب صفات کا ہے۔ جبتک ہم اس امر کا یقینی ثبوت نہ رکھتے ہوں۔ کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے ان صفات کا ظہور اس رنگ میں ہوتا ہے۔ کہ ہم اس کو اتفاق کی طرف منسوب ہی نہیں کرسکتے۔ ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ صفات خدا تعالےٰ میں ہیں۔ بلکہ حق یہ ہے۔ کہ جبکہ خدا تعالےٰ کی ذات تو نظر نہیں آتی۔ اس کا علم اس کی صفات کے ہی ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ تو جبکہ ہمارے پاس کوئی یقینی ثبوت اسکی صفات کے ظہور کا نہ ہو۔ ہم دیانتداری سے یہ بھی کب کہہ سکتے ہیں۔ کہ کوئی خدا بھی موجود ہے۔ اور جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے یہ سب کسی بیجان قانون قدرت کا جو کسی غیر معلوم پیچ در پیچ جوڑ کے ساتھ نہایت ہی مکمل طور پر چل رہا ہے نتیجہ نہیں ہے۔

اس شبہ کا ازالہ صرف اسلام ہی کرتا ہے۔ اس کی تعلیم پر چل کر ایسے لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں جو کہ صفات الٰہیہ کے مظہر ہوتے ہیں۔ اور جو پہلے خود اپنی ذات پر صفات الٰہیہ کا پرتو ڈالتے اور پھر دوسروں کو اس کا نشان دکھاتے ہیں۔ اور ہستی باری کا کامل عرفان بخشتے ہیں۔ چنانچہ

اس زمانہ میں بھی اللہ تعالےٰ نے اس غرض کے لئے کہ لوگ اس کے وجود کو پہچانیں۔ اور شک وشبہ کی زندگی سے پاک ہوں حضرت مسیح موعود ؑ کو بھیجا تھا۔ جو کہ اسلام کی تعلیم پر عمل کرکے اس مقام پر پہونچے جس پر قدیم سے نبی پہونچتے چلے آئے ہیں۔ بلکہ بہت سے نبیوں کے مقام سے بھی اُوپر۔ قرآن نے اس مقام تک آپ کی رہنمائی کی جس تک ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور مسیحؑ کو رہنمائی حاصل نہ ہوئی تھی۔ اور آپنے اپنی قوت قدسیہ سے خدا تعالےٰ کی صفات کو ایسے یقینی رنگ میں ثابت کیا۔ کہ ہر ایک جو دیکھتا ہے۔ حیران ہوجاتا ہے۔ اور جو سنتا ہے دنگ رہجاتا ہے۔ لاکھوں ہیں۔ جو ان نشانات کے ذریعہ سے زندہ کئے گئے ہیں۔ اور لاکھوں ہیں جو ان معجزات کے ذریعہ سے بیماریوں سے شفا دیئے گئے ہیں۔ آپ نے وُہ درجہ عرفان کا پایا جس کے بعد کوئی شک اور شبہ باقی نہیں رہتا۔ اور اس طرح خدا سے ملے۔ کہ جسکے بعد کوئی دُوری باقی نہیں رہتی۔ اور ایسی پیوستگی حاصل کی۔ کہ اس کے بعد کوئی افتراق ممکن نہیں۔ اور خدا تعالےٰ کے رنگ میں ایسے رنگین ہوئے کہ اور کوئی رنگ آپ پر باقی نہ رہا۔ آپ دُنیا سے بکلی منقطع ہو کر اُسی یار ازل کے ہوگئے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وُہ یار ازل آپ کا ہوگیا۔ غرض اسلام کی تعلیم کا ایک ایک حکم آپنے خود تجربہ کرکے دیکھا۔ اور اسکو صحیح پایا۔ اور اس کے نیک نتائج آپنے محسوس کئے۔ اور آپ پر خدا تعالےٰ نے اپنی صفات کی چادر ظلی طور پر اُڑھائی۔ اور آپ اس سے مزین ہو کر دُنیا کی طرف واپس لوٹے۔ تاکہ لوگوں کو خدا کی طرف لیجاویں۔ آپ ہی کا حق تھا۔ کہ آپ لوگوں کو خدا تعالےٰ کی طرف لیجاتے کیونکہ یہ قدیم سے سنت چلی آتی ہے۔ کہ وہ ہی اوپر جا سکتے ہیں۔ جو اُوپر سے آتے ہیں حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں: "اور کوئی آدمی آسمان پر نہیں جاتا لیکن وہی جو آسمان سے آتا ہے۔" اور میں اسپر یہ زیادہ کرتا ہوں۔ کہ کوئی شخص آسمان پر نہیں جا سکتا مگر وُہ جو آسمان سے بھیجا جاتا ہے پس حضرت مسیح موعود جنکو بطور عطیہ کے خدا تعالےٰ نے اپنے جلال کی چادر اُڑھائی۔ اور پھر دُنیا کی ہدایت کے لئے دُنیا میں واپس بھیجا۔ آپ ہی کا حق تھا۔ کہ لوگوں کو خدا تعالیٰ تک پہونچائیں۔ چنانچہ آپ نے اللہ تعالےٰ کی ایک ایک صفت کو اپنے وجود سے ظاہر کیا۔ اور خدا تعالےٰ کو لوگوں سے قریب کرکے لوگوں کو خدا سے قریب کردیا۔ قرآن کریم میں آتا ہے۔ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ (انعام ع ۱۳) خدا بندوں کی کمزوری کو دیکھ کر خود ان کے قریب ہوتا ہے۔ چنانچہ جس طرح قدیم زمانہ سے اسکی سنت

ہے۔ وہ اب بھی مسیح موعودؑ پر ظاہر ہوا۔ اور اس کے ذریعہ سے اس نے اپنے آپکو دوسری دُنیا پر ظاہر کیا تا ثابت ہو کہ وُہ خدا زندوں کا خدا ہے۔ وہ جس طرح ابراہیمؑ کا خدا تھا۔ موسٰیؑ کا خدا تھا۔ مسیحؑ کا خُدا تھا۔ آنحضرت صلعم کا خدا تھا۔ اب بھی وُہ ہمارا خدا ہے۔ اس نے ہم کو نہیں چھوڑا۔ بلکہ ہم نے اپنی جہالت سے اسکو چھوڑا ہوا تھا۔

یہ تو مشکل ہے۔ کہ میں خدا تعالےٰ کی ایک ایک صفت کے متعلق بیان کروں۔ کہ کس طرح مسیح موعودؑ نے عرفانِ کامل کے حصول کے بعد اس کو دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ اور ثابت کیا مگر میں بطور مثال کے چند صفات کو لے لیتا ہوں۔

اوّل ایک صفت جسے چھوٹے بڑے پیش کرتے ہیں۔ علم کی صفت ہے۔ ہر مذہب کے لوگ کہتے ہیں۔ کہ خدا علیم ہے۔ ہر اک چھوٹی بڑی بات کو جانتا ہے۔ مگر باوجود اس کے کوئی نہیں بتاتا۔ کہ کیونکر معلوم ہو۔ کہ خدا علیم ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السّلام نے اس صفت کو عملی ثبوتوں سے دُنیا پر ثابت کیا۔ چنانچہ آپ نے ایسے علوم دُنیا پر ظاہر کئے۔ جن میں سے بعض دُنیا کی نظروں سے مخفی تھے۔ بعض ایسے تھے۔ کہ ان کا طریق حصول غیر معمولی تھا۔ اور بعض ایسے تھے۔ کہ ان کا جاننا ہی انسانی طاقت سے بالا تھا۔ امر اوّل کی مثال تو مثلاً وہ تعلیم ہی ہے۔ جو آپ نے دی ہے۔ اور جس کا کچھ حصّہ مختصراً بطور نمونہ کے میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ اور کچھ حصّہ آگے بیان کروں گا۔ امر دوم اور سوم کی مثالیں میں ذیل میں بیان کرتا ہوں۔

شاید آپ لوگوں میں سے اکثر اس امر سے ناواقف ہوں۔ کہ آپؑ ہندوستان کے اس گوشہ کے رہنے والے تھے۔ جس پر سکھ حکمران تھے۔ جن کے زیرِ حکومت علم کا نام ونشان نہ ملتا تھا۔ آپ کسی مدرسہ میں نہیں پڑھے۔ دس دن کیلئے بھی آپ نے کسی درسگاہ میں تعلیم نہیں حاصل کی۔ آپ کے والد صاحب نے معمولی مدرسوں کے ذریعہ سے چند ابتدائی کتب آپ کو پڑھوا دی تھیں۔ مگر جب آپ کو اللہ تعالےٰ نے مقامِ نبوت پر ممتاز کیا۔ تو ایک ہی رات میں آپ کو عربی کا علم اس شان کے ساتھ سکھا دیا۔ کہ عرب اور مصر کے علماء اسکا مقابلہ کرنے سے عاجز آگئے۔ آپ نے عربی زبان میں بڑی تحدی کے ساتھ کتب لکھی ہیں۔ اور اپنے مخالفوں کو بار بار چیلنج دیا ہے۔ کہ اگر وُہ آپ کی تصنیفات کو انسانی علم کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ تو انکے مقابلہ میں ویسی

ہی کتب لکھ کر دکھا دیں۔ مگر باوجود بار بار چیلنج دینے کے اور مقابلہ کی دعوت دینے کے ایک شخص بھی مقابلہ پر نہیں آیا۔ نہ کوئی مصر کا عالم نہ عرب کا نہ ہندوستان کا۔ اب یہ نشان جو آپ سے ظاہر ہوا۔ اگر اللہ تعالےٰ کے علیم ہونیکا یقینی ثبوت نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا عقل اس امر کو تسلیم کرسکتی ہے۔ کہ محض وہم کے ساتھ ایک شخص ایسا کمال پیدا کرسکتا ہے؟ پنجاب کا ملک عرب سے اسقدر دُور ہے اور علمی مراکز سے اتنے فاصلہ پر ہے۔ کہ کوئی صورت امکان نہیں کہ آپ نے دوسرے لوگوں سے مل کر عربی سیکھ لی ہو۔ اور اگر سیکھ بھی لی ہو۔ تو جبکہ پنجاب کی باقاعدہ درسگاہوں میں پڑھے ہوئے لوگ چند صفحے عربی کے نہیں لکھ سکتے تو آپ نے پنجاب میں بیٹھے بیٹھے چند دن کی صحبت میں عربی پر اس قدر عبور کہاں سے حاصل کر لیا۔ کہ عربی میں پچاس کے قریب کتب لکھ دیں۔ اور پھر سب علماء کو چیلنج بھی دیا۔ مگر کوئی شخص مقابل پر نہیں آیا۔ بیشک بعض لوگ اپنی فصاحت و بلاغت میں بے نظیر سمجھے جاتے ہیں جیسے شیکسپیئر۔ ڈانٹی وغیرہ مگر ان کی مثال اسجگہ پیش نہیں کیجا سکتی۔ کیونکہ وُہ لوگ پہلے دعویٰ کر کے نہیں کھڑے ہوتے پہلے تو خود ان کو بھی علم نہیں تھا۔ کہ ان کی کتب کیا رتبہ پائیں گی۔ مگر جب وہ کتب مشہور ہوئیں۔ تو معلوم ہوا کہ وہ نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں جب چند آدمی دوڑتے ہیں۔ تو ان میں سے کوئی نہ کوئی تو اوّل نکل ہی آتا ہے۔ پس جو اوّل نکلے اس کا حق نہیں۔ کہ وُہ اس کو کوئی غیر معمولی کام قرار دے مگر ایک کمزور اور نحیف آدمی جو اچھی طرح چل بھی نہ سکتا ہو۔ وہ ایک دوڑ میں شامل ہو۔ اور پہلے سے کہدے کہ میں اوّل رہونگا۔ اور پھر اوّل رہے۔ تو اس کا اوّل رہنا بے شک ایک معجزہ ہوگا۔ اور کسی بالا طاقت کی طرف منسوب کیا جائیگا۔

خدا تعالےٰ اسی طرح اپنی صفتِ علم کا اظہار کیا کرتا ہے۔ چنانچہ اعمال باب ۲ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حواریوں کے ذریعہ سے بھی اللہ تعالےٰ نے اپنی صفتِ علم کا اظہار اسی طرح کیا تھا۔ کہ ان کو دوسرے قبائل کی زبانیں سکھا دی تھیں۔ مگر فرق یہ ہے۔ کہ ان کو جیسا کہ اعمال سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہودی قبائل کی زبانیں سکھائی گئی تھیں۔ اور وُہ انکے بولنے میں غلطیاں بھی کرتے تھے لیکن مسیح موعودؑ کو غیر ملک کی زبان سکھائی گئی تھی۔ اور ایسے کامل طور پر سکھائی گئی تھی۔ کہ خود اہلِ زبان باوجود بار بار چیلنج دینے کے مقابلہ پر نہیں آسکے۔

خدا تعالیٰ کے علیم ہونے کا ایک اور ثبوت جو حضرت مسیح موعود ؑ کے ذریعہ سے ظاہر ہوا۔ یہ مذہبی کانفرنس ہے جس کے لئے آج آپ لوگ جمع ہوئے ہیں۔ آج سے چونتیس ۳۴ سال پہلے حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کو ایک کشف ہوا تھا۔ جس میں ولایت میں آپ کے سلسلہ کی اشاعت کا ذکر تھا۔ اس کشف کو آپنے اپنی کتاب ازالہ اوہام میں جو ۱۸۹۱ء میں طبع ہوئی ہے۔ شائع بھی کر دیا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"مغرب کی طرف سے آفتاب کا چڑھنا یہ معنے رکھتا ہے۔ کہ ممالک مغربی جو قدیم سے ظلمت کفر و ضلالت میں ہیں۔ آفتاب صداقت سے منور کئے جائینگے۔ اور ان کو اسلام سے حصّہ ملے گا۔ اور میں نے دیکھا۔ کہ میں شہر لنڈن میں ایک ممبر پر کھڑا ہوں۔ اور انگریزی زبان میں ایک نہایت مُدلّل بیان سے اسلام کی صداقت ظاہر کر رہا ہوں۔ بعد اس کے میں نے بہت سے پرندے پکڑے۔ جو چھوٹے چھوٹے درختوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور انکے رنگ سفید تھے۔ اور شاید تیتر کے جسم کے موافق ان کا جسم ہوگا۔ سو میں نے اسکی یہ تعبیر کی۔ کہ اگرچہ میں نہیں۔ مگر میری تحریریں ان لوگوں میں پھیلیں گی۔ اور بہت سے راستباز انگریز صداقت کا شکار ہو جائینگے۔ درحقیقت آجتک مغربی ممالک کی مناسبت دینی سچائیوں کے ساتھ بہت کم رہی ہے۔ گویا خدا تعالےٰ نے دین کی عقل تمام ایشیا کو دیدی۔ اور دنیا کی عقل تمام یورپ اور امریکہ کو۔ نبیوں کا سلسلہ بھی اول سے آخر تک ایشیاء کے ہی حصّہ میں رہا۔ اور ولایت کے کمالات بھی انہی لوگوں کو ملے۔ اب خدا تعالےٰ ان لوگوں پر نظر رحمت ڈالنا چاہتا ہے۔" (ازالہ اوہام صفحہ ۵۱۶)

مضمون صاف ہے اور مطلب واضح ہے۔ خدا تعالےٰ نے آج سے چونتیس ۳۴ سال پہلے اطلاع دی۔ کہ آپ یورپ میں جا کر اسلام کی تبلیغ کرینگے۔ اور آپکی تقریریں اشاعت اسلام کا موجب ہونگی۔ اور آخر مغرب اسیطرح دین سے حصّہ پائیگا۔ جس طرح کہ آج وہ دُنیا سے حصّہ پا رہا ہے بیشک اس خواب میں آپنے اپنے آپ کو تقریر کرتے ہوئے دیکھا لیکن نبی سے مراد اس کی امت ہوتی ہے۔ اور انہیں سے خاص طور پر اس کے خلفاء۔ پس اس خواب میں آپکے یا آپ کے کسی

خلیفہ کے انگلستان جا کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کی خبر دیگئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے۔ کہ ایک سٹیج پر سے لوگوں کو احمدیت کی تبلیغ کیجائیگی۔ اور اسلام کی دعوت دیجائیگی۔ اور لوگ احمدیت کو قبول کرینگے۔ اور خدا ان کو برکت دے گا۔ اے بھائیو اور بہنو! اس رؤیا کے پورا ہونیکو معمولی بات نہ سمجھو۔ کیونکہ کسی چیز کی حقیقت اس کے پورے حالات کے معلوم ہونے سے ظاہر ہوتی ہے۔ اِن حالات کو مدّ نظر رکھو جس وقت یہ خبر دی گئی تھی۔ اور اس امر کو دیکھو۔ کہ خبر دینے والا کون تھا؟

حالات تو یہ تھے۔ کہ جس وقت یہ خبر دیگئی ہے۔ اسوقت مسیحیت کا اسقدر غلبہ تھا کہ مسلمان مسیحیت سے بالکل مرعوب ہو چکے تھے۔ یورپ کے مصنف تو خیر لکھتے ہی تھے۔ بعض مسلمان مصنف بھی یہ تسلیم کرنے لگ گئے تھے۔ کہ اسلام مسیحیت سے سَو سال کے عرصہ میں مغلوب ہو جائیگا۔ اور بعض لوگوں نے تو مذہبی ریفارم کے نام سے یہ تحریک شروع کر دی تھی۔ کہ اسلام اور مسیحیت کی صلح کر دی جائے۔ اور یہ تسلیم کر لیا جائے۔ کہ مسیحیت بھی سچی ہے۔ اور اسلام بھی سچا ہے۔ اور دونو میں تصادم نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ وُہ ڈرتے تھے۔ کہ اسلام مسیحیت کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ اور بعض لوگوں نے یورپ کے سامنے ان مسائل کے متعلق جن کو یورپ قابل اعتراض سمجھتا تھا۔ معذرت کرنی شروع کر دی تھی۔ کہ اسلام کا وہ منشاء نہیں جو وُہ خیال کرتے ہیں۔ بلکہ اصل میں اسلام بھی وہی کہتا ہے۔ جو وُہ کہتے ہیں۔ یا اس قسم کے عذر پیش کرنے شروع کر دیئے تھے۔ کہ اسلام ایسے تاریک زمانہ میں آیا تھا۔ جب عرب کی حالت نہایت نازک تھی۔ اس لئے ان لوگوں کی تدریجی اصلاح کے لئے بعض احکام دیئے گئے تھے۔ جو اصل مقصود نہ تھے۔ اب مسلمان علماء کی مجالس انکو منسوخ کر دینگی۔ یا یہ کہنے لگے تھے۔ کہ رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے قومی خیالات کا لحاظ کر کے انہی کے اعتقادات کے مطابق کلام کرتے تھے۔ اور اصل میں آپ کی مراد اس سے اور ہوتی تھی۔ غرض مسلمانوں نے اپنے عمل اور اپنے قول سے اس امر کو تسلیم کر لیا تھا۔ کہ اب اسلام کی زندگی چند روزہ ہے۔ اور وُہ حملہ تو الگ رہا دفاع کی بھی طاقت اپنے اندر محسُوس نہیں کرتے تھے۔ اور ہتھیار رکھنے پر آمادہ تھے۔ اور صرف اسی امر کے منتظر تھے۔ کہ زیادہ اچھی شرائط پر مسیحیت سے ان کی صلح ہو جائے۔ اور ہمیں بالکل ہی وحشی نہ قرار دیا جائے

یہ تو قومی حالت تھی۔ خود پیشگوئی کرنے والے کا یہ حال تھا۔ کہ اس کے ساتھ کوئی جماعت نہ تھی۔ اس نے مسیحیت کا دعویٰ ابھی نیا نیا کیا تھا۔ اور اسکی وجہ سے سب دنیا اسکی مخالف ہوگئی تھی۔ حکومت اسکی مخالف تھی۔ رعایا اس کے مخالف تھی مسیحی اسکے مخالف تھے۔ ہندو اسکے مخالف تھے۔ اور وُہ قوم جس کے مذہب کی تائید کے لئے وُہ کھڑا ہوا تھا۔ وُہ بھی اس کے مخالف تھی اور سب سے زیادہ مخالف تھی۔ دعویٰ اسکا بالکل نرالا تھا۔ مسلمان ایک خونی مہدی اور ایک آسمان سے آنیوالے مسیح کے منتظر تھے۔ اور وُہ یہ پیش کرتا تھا۔ کہ خونی مہدی نہیں بلکہ صلح کرنے والا مہدی مقرر ہے۔ اور مہدی اور مسیح الگ الگ نہیں۔ بلکہ ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ اور آسمان سے نہیں۔ بلکہ اسی دُنیا سے انہوں نے ظاہر ہونا ہے۔ اور سب پر طُرّہ یہ کہ وُہ کہتا تھا۔ **کہ وہ موعود میں ہی ہوں** جسے علم۔ رتبہ۔ عزت کسی بات میں بھی دوسروں پر فضیلت نہیں پھر غیر ممالک میں جانے آنے اور وہاں شہرت پانیکے لئے روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسکا حال یہ تھا۔ کہ صرف چالیس پچاس آدمی اس کے ساتھ تھے۔ جن میں سے سوائے دو کے جو کسیقدر آسودہ تھے۔ باقی سب نہایت غریب اور شکستہ حالت کے آدمی تھے۔ حتیٰ کہ انکی ماہوار آمدنیاں پندرہ روپیہ سے بھی کم تھیں۔ جن میں انکو اپنی اور اپنے رشتہ داروں کی سب ضروریات پوری کرنی پڑتی تھیں۔ ان چند غریبوں کی جماعت کے ساتھ وہ کھڑا ہوا۔ اور مذکورہ بالا حالات میں وہ مغرب سے چھ ہزار میل کے فاصلہ پر ہندوستان میں سے جو انگریزوں کی حکومت میں شامل ہے! اور اسوقت کے خیالات کے مطابق نہایت حقیر حیثیت میں تھا۔ ایک ایسے صُوبہ میں سے جو علمی حیثیت میں سب ہندوستان سے کم سمجھا جاتا ہے۔ اور ساحل سمندر سے سینکڑوں میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور ایک **ایسے گاؤں** میں سے جو ریل سے گیارہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور جہاں ڈاک بھی ہفتہ میں صرف دو بار آتی تھی۔ اور سکول کا ایک مدرس کچھ الاؤنس لیکر ڈاک کا کام کر دیتا تھا۔ اور جس جگہ علم کی انتہائی منزل ورنیکلر پرائمری تھی۔ کیونکہ اس سے زیادہ تعلیم دینے والا کوئی سکول وہاں موجود نہ تھا۔ (یہ سب نقشہ اس وقت کی **قادیان** کا ہے۔ جس وقت یہ **پیشگوئی** شائع کی گئی تھی) اس نے یہ اعلان کیا۔ کہ خدا میری تعلیم کو مغرب میں پہونچائے گا۔ اور سٹیجوں پر سے میری تعلیم پڑھ کر سنائی جائے گی۔ اور مغرب کے لوگ اس کی صداقت کو قبول کرینگے اور میرے سلسلہ

میں داخل ہونگے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اس کا سلسلہ ترقی کرتا گیا۔ اور مغرب تک جا پہنچا۔ ہر قسم کے لوگ اس میں داخل ہوئے۔ اور آخر مغرب کے صداقت پسند ارواح کو بھی اس نے اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔

مذہبی کانفرنس کی دعوت سب سلسلوں کے لئے تو ایک معمولی دعوت ہے۔ جو ایسے موقع پر دی ہی جاتی ہے۔ کیونکہ آخر مذہبی کانفرنس نے بھی تو اپنی سٹیج کو رونق دینی تھی۔ مگر ہمارے لئے اس کی حیثیت بالکل اور ہے۔ کیونکہ اس دعوت نے اس **کشف** کو جو بالکل مخالف حالات میں شائع کیا گیا تھا۔ پورا کر دیا ہے۔ کیونکہ اگر یہ سلسلہ ایک طبعی راہ اختیار کرتا۔ تو آج نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ لندن کی ریلیجنز کانفرنس اس کو دعوت دیتی۔ وہ کبھی کا فنا ہو جانا چاہیئے تھا۔ مگر خدا نے اس کشف کے مطابق اس کو بڑھایا۔ اور آخر اسی طرح ہوا۔ جس طرح کہا گیا تھا۔ اور ثابت ہوا۔ کہ خدا علیم ہے۔ وہ ایسی باتیں بتاتا ہے۔ جن کا علم انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور اس وقت بتاتا ہے۔ جب لوگ انکو عقل کے خلاف سمجھتے ہیں۔

میں ان ثبوتوں میں سے جو آپ نے صفتِ علم کے ثبوت میں پیش کئے۔ ایک اور ثبوت کے پیش کرنے سے نہیں رُک سکتا۔ کیونکہ وہ بھی یورپ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس کا نہایت گہرا اثر یورپ اور امریکہ پر آج تک چلا آتا ہے۔ اور وُہ آپکی وہ پیشگوئی ہے۔ جو جنگ یورپ اور زارِ روس کے انجام کے متعلق تھی۔ یہ پیشگوئی مختلف اوقات میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے کی گئی ہے۔ اور سنہ ۱۹۰۴ء سے سنہ ۱۹۰۸ء تک مکمل ہوئی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ کہ مجھے خدا تعالےٰ نے خبر دی ہے۔ کہ ایک شدید زلزلہ آنیوالا ہے۔ جس کی نسبت آپ لکھتے ہیں۔ کہ ضروری نہیں۔ کہ زلزلہ سے یہ مراد ہو کہ زمین ہلیگی۔ بلکہ اس سے مراد کوئی ایسی آفت ہو سکتی ہے جس سے جانوں کا نقصان ہوگا۔ اور مکانات گرینگے۔ اور خون کی ندیاں بہینگی۔ اور لوگوں میں سخت گھبراہٹ پڑے گی

پھر اس زلزلہ کی جو کیفیات آپ نے بتائی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ درحقیقت اس سے ایک جنگِ عظیم مراد تھی۔ کیونکہ آپ فرماتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے۔ کہ اس زلزلہ شدید کے وقت تمام دُنیا میں گھبراہٹ پڑ جائے گی۔ مسافروں کے لئے وُہ سخت تکلیف

کا وقت ہوگا۔ (یہ شرط صاف ظاہر کرتی ہے۔ کہ جنگ مراد ہے کیونکہ زلزلہ کا اثر مسافروں پر کوئی خاص نہیں ہوتا) ندّیاں خون سے سُرخ ہو جائینگی۔ یہ آفت یکدم اور اچانک آئیگی۔ لوگوں کو اس کی پہلے سے کچھ خبر نہ ہوگی۔ اس صدمہ سے جوان بوڑھے ہو جائیں گے۔ پہاڑ اپنی جگہوں سے اُڑا دیئے جائیں گے۔ بہت سے لوگ صدمہ سے دیوانے ہو جائینگے۔ سب دُنیا پر اس کا اثر ہوگا۔ **زارِ روس** کی حالت اسوقت نہایت ہی زار ہوگی۔ تمام حکومتیں اسکے صدمہ سے کمزور ہو جائینگی۔ جنگی بیڑے تیار رکھے جائینگے۔ اور کثرت سے ادھر ادھر چکر لگائینگے تا دشمنوں کے بیڑے ان کو ملیں۔ اور وہ ان سے جنگ کریں۔ زمین الٹا دی جائیگی۔ خدا تعالےٰ اپنی فوجوں سمیت اتریگا تا ان لوگوں کو ان کے ظلموں کی سزا دے۔ اس مصیبت کا اثر پرندوں پر بھی پڑیگا۔ عرب بھی اُسوقت اپنے قومی فوائد کو مدنظر رکھکر ایک جنگ کے لئے نکلیں گے۔ ترک شام کے میدان میں شکست کھائیں گے۔ لیکن اپنی شکست کے بعد پھر اپنی ضائع شدہ طاقت کا ایک حصّہ واپس لے لیں گے یہ زلزلہ جس وقت ظاہر ہوگا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے اس کے آثار ظاہر ہونگے۔ مگر اللہ تعالےٰ اس کو روک کر کچھ سال پیچھے ڈال دیگا۔ مگر یہ آفت پیشگوئی کے شیوع کے سولہ سال کے عرصہ میں آئے گی۔ اور پھر یہ کہ حضرت مسیح موعودؑ کی وفات کے واقعہ ہونیکے بعد ہوگی۔

کس زور اور کس طاقت کے ساتھ یہ امور پورے ہوئے ہیں۔ وہ زلزلہ جس کی خبر دی گئی تھی۔ کیسی شدت کے ساتھ آیا۔ اور اس نے کس طرح سب دُنیا کو ہلا دیا؟ زلزلہ سے جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں فقط زلزلہ ہی مراد نہ تھا۔ یہ لفظ قرآن کریم میں جنگ کے معنوں میں بھی استعمال ہؤا ہے۔ اور بائیبل میں بھی جنگ کے لئے زلزلہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ دیکھو اسموئیل باب ۱۴ آیت ۱۵۔ کس طرح اسکی تمام تفاصیل پوری ہوئیں؟ کس طرح اچانک یہ جنگ چھڑی؟ تمام دنیا اس کی لپیٹ میں آگئی ۱۹۰۵ء میں یہ پیشگوئی شائع کیگئی تھی۔ پس پورے نَو سال بعد جنگ شروع ہوئی۔ اور ہوئی بھی حضورؑ کی وفات کے بعد جو ۱۹۰۸ء میں واقع ہوئی۔ ساری دنیا پر اسکا ایسا خطرناک اثر پڑا کہ کوئی اس کی زد سے نہیں بچا۔ جو حکومتیں اس جنگ میں شامل ہوئیں ان پر تو اس کا اثر ہونا ہی تھا۔ دوسری حکومتیں بھی اس کے اثر سے محفوظ نہیں رہیں۔ مسافروں کے لئے اسکا اثر ایسا سخت تھا۔ کہ اس کا خیال کرنے سے دل کانپتا ہے۔ جس وقت یہ جنگ شروع

ہوئی ہے۔ اسوقت لڑنیوالی قوموں کے جو لوگ مخالف قوم کے ملکوں میں تھے۔ وہ جس جس مصیبت میں مبتلا ہوئے ہیں اور جن جن مشکلات میں پڑ کر بھاگے ہیں یا آخر قید ہوئے ہیں۔ وہ ایک دردناک قصہ ہے ہزاروں تھے جنکو سالوں تک اپنے رشتہ داروں کی اور ان کے رشتہ داروں کو انکی اطلاع نہیں ملی کہ وہ کس حال میں ہیں پہاڑ اس طرح اڑائے گئے جس طرح ٹیلے اڑائے جاتے ہیں فرانس کی بعض پہاڑیاں جو جنگ کے میدانمیں تھیں۔ قریبًا برابر کر دیگئیں۔ بار ہا ایسی خونریزی ہوئی۔ کہ عملًا خون کی ندیاں بہ گئیں۔ اور دریا سُرخ ہو گئے۔ کئی لوگ اس کے صدمہ سے قبل از وقت بوڑھے ہو گئے اور جیسا کہ کہا گیا تھا۔ بہت سے لوگ پاگل ہو گئے۔ بلکہ پاگلوں کی تعداد اسقدر بڑھ گئی کہ shell shock کہ جنگی جنون ایک نئی بیماری قرار دی گئی۔ ہزاروں آدمی اس بیماری کا شکار ہوئے اور مہینوں بلکہ سالوں ناقابل کار ہو گئے۔ جنگی بیڑے اس کثرت سے چکر لگاتے پھرے۔ کہ تا اپنا شکار تلاش کریں۔ کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہؤا۔ زمین ایسی الٹائی گئی کہ ابتک فرانس اپنے تباہ شدہ علاقہ کو درست نہیں کر سکا۔ پرندوں پر اس کا ایسا اثر پڑا کہ ان دنوں میں خبریں شائع ہوئی تھیں۔ کہ شور اور گولہ باری کیوجہ سے پرندے ہوا میں اڑنے لگ جاتے تھے۔ اور بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ اور بہت سے پرندے تھک کر زمین پر گر جاتے اور مر جاتے تھے۔

اس جنگ کے آثار مطابق پیشگوئی ایک وقت پہلے ظاہر ہو کر رک گئے تھے۔ یعنی جولائی ۱۹۱۱ء میں جبکہ جرمن نے اپنا جہاز پنتھر مراکو کے بندر Agadir (اغادیر) کیطرف بھیجا تھا۔ کہ تا اس بندر پر قبضہ کرے۔ اگر انگریزی حکومت سختی سے دخل نہ دیتی اور بعض یورپین مدبرین یہ نہ خیال کر لیتے۔ کہ اسوقت انکے ملک جنگ کے لئے تیار نہیں ہیں تو یہ جنگ بجائے ۱۹۱۴ء کے ۱۹۱۱ء میں ہی واقع ہو جاتی۔

جیسا کہ بتایا گیا تھا۔ عرب بھی اس جنگ میں اتحادیوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اور اپنے ملک کے مصالح کو مدنظر رکھکر انہوں نے ترکوں سے علیحدگی کر لی۔ آخر مطابق پیشگوئی جبکہ درۂ دانیال اور عراق میں تمام کوششیں ناکام رہیں۔ حالانکہ یہی اصل محاذ جنگ سمجھے جاتے تھے۔ مطابق پیشگوئی ترکوں کو شام میں شکست ہوئی۔ اور جنگ کا خاتمہ ہوا۔ مگر پھر ترکوں کو

مصطفٰے کمال پاشا کے ذریعہ سے قوت حاصل ہوئی۔ اور جیسا کہ خبر دی گئی تھی۔ انہوں نے اپنی گم گشتہ عزت کا ایک حصہ واپس لیا۔

مگر سب سے زیادہ ہیبت ناک حصہ اس پیشگوئی کا وُہ ہے۔ جو **زارِ روس** کے متعلق ہے۔ تمام بادشاہوں سے قطع نظر کر کے زار روس کی نسبت خبر دی گئی تھی۔ اور بتایا گیا تھا کہ اسکی حالت زار ہوگی۔ یعنی وہ صرف حکومت سے ہی علیحدہ نہیں کیا جائیگا بلکہ اور صدمہ بھی دیکھیگا۔ یعنی نہ مریگا نہ مارا جائیگا بلکہ زندہ رہیگا۔ اور نہایت تکلیف دہ مصیبت میں مبتلا رہیگا کس طرح ایک ایک لفظ ایک ایک اشارہ اس پیشگوئی کا پورا ہوا ہے؟ پہلے اس کی حکومت گئی لیکن اسکی جان بچالی گئی پھر ایک اور تغیر اور تنگی کے ساتھ دکھ دے دیکر اس کو مارا گیا۔ اس کی بیوی اور لڑکیوں کی اس کے سامنے ہتک کی گئی جبکہ وہ بالکل بےبس دبے طاقت تھا۔

جسم ان مصائب کا خیال کر کے جو زار کو پہونچے۔ کانپ جاتا ہے۔ اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی اس خدائے علیم پر کس قدر یقین بڑھ جاتا ہے جس نے چودہ سال پہلے ان واقعات کی خبر دی تھی۔ جب کہ ان واقعات میں سے بہتوں کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

کیا یہ واقعات اس امر کے ثابت کرنیکے لئے کافی نہیں۔ کہ **اسلام کا خدا علیم خدا ہے**۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو **اسلام ہی وہ مذہب ہے جس کے ذریعہ سے علیم خدا کی معرفت حاصل ہوسکتی ہے اور وہی وُہ مذہب ہے جس کے ذریعہ سے انسان خدا تعالےٰ سے تعلق پیدا کر سکتا ہے**۔

صفاتِ الٰہیہ میں سے دوسری صفت جو ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر ہے۔ اور جس پر اکثر مذاہب متفق ہیں۔ وُہ **خلق** کی صفت ہے۔ اکثر مذاہب مدعی ہیں۔ کہ وہ خدا جسے وہ پیش کرتے ہیں۔ دُنیا کا خالق ہے تمام انسان اور حیوان اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں ایک ایک ذرّہ اسی کا بنایا ہوا ہے۔ مگر وہ کیا ثبوت ہے۔ جسے وہ اس امر کی تائید میں پیش

کرتے ہیں؟ یقیناً کوئی بھی نہیں۔ ان کے دعویٰ کی بناء صرف اس امر پر ہے کہ اگر خدا تعالےٰ دنیا کا خالق نہیں تو پھر اور کون ہے؟ مگر یہی دلیل دہریہ کے سامنے بھی موجود ہے۔ وہ قوانینِ نیچر کا زیادہ گہرا واقف ہے۔ کیونکہ اس کی دُنیا اور اس کا دین صرف قوانینِ قدرت کا مطالعہ ہے وہ باوجود اس گہرے مطالعہ کے پھر اس نتیجہ پر پہونچتا ہے۔ کہ یہ سب کارخانۂ قدرت آپ ہی آپ چل رہا ہے۔ تو جب وُہ لوگ جو اپنی عمر کو قانونِ قدرت کے مطالعہ پر ہی خرچ کرتے ہیں اس کی رہنمائی سے فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ تو دوسرے لوگ اس سے کیا نفع اٹھا سکتے ہیں۔ اور اس پر کیا یقین کر سکتے ہیں؟ پھر یہ بھی تو دیکھنا چاہیئے۔ کہ زیادہ سے زیادہ جو بات اس قانونِ قدرت سے ہمیں معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے۔ کہ کوئی خدا اس دُنیا کا خالق **ہونا چاہیئے**۔ مگر **ہونا چاہیئے** ایک ظن ہے۔ یہ استدلال ہمیں یقین کے مقام تک ہرگز نہیں پہونچا سکتا۔

ہم روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ کہ ایک بات جسکا سبب ہمیں معلوم نہیں ہوتا ہم عقل سے اس کا ایک سبب دریافت کرتے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصل سبب اور ہی ہے۔ اور ہمارے خیالات بالکل غلط ثابت ہوجاتے ہیں پس کیا یہ ممکن نہیں ہوسکتا۔ کہ ہم چونکہ ابھی تک مادہ اور اسکی بناوٹ اور اس کی خصوصیات اور اس کے محرکاتِ عمل سے پوری طرح واقف نہیں اس لئے یہ خیال کرتے ہوں کہ اس کارخانۂ عالم کے چلانے کیلئے علاوہ قوانین قدرت کے کوئی اور مدبّر بھی ہونا چاہیئے لیکن درحقیقت مادہ کی بعض خصوصیات اور اس کے محرکاتِ عمل ایسے ہوں جنکی وجہ سے وہ کسی بیرونی مدبّر کا محتاج نہو۔ بلکہ خود بخود ہی سب کام کر سکتا ہو؟ پس جب ایسے احتمالات موجود ہیں۔ تو یہ دلیل ہمیں کب تسلّی دے سکتی ہے؟ تسلی وہی دلیل دے سکتی ہے جو **ہونا چاہیئے** کے مقام سے بلند کر کے ہمیں **ہے** کے مقام تک پہونچا دے۔ اور شک و شبہ کا احتمال مٹا دے۔ اور یہ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفت خلق کا ہم اپنی آنکھوں سے مطالعہ کرلیں۔ اور خود دیکھ لیں۔ کہ وُہ پیدا کرتا ہے۔ مگر یہ یقین ہمیں کوئی مذہب دلانیکے لئے تیار نہیں۔ سوائے حضرت **مسیح موعودؑ** کے جو ہمیں اس یقین کے مقام تک پہونچاتے ہیں۔ اور اس عرفان سے ہمیں حصہ دیتے ہیں۔ آپؑ ہمیں

یہ نہیں کہتے۔ کہ مان لو کہ کوئی خدا ہے۔ اور وہ خالق ہے۔ بلکہ یہ فرماتے ہیں۔ کہ آؤ میں تمہیں خدا تعالےٰ پیدا کرتا ہوا دکھا دوں۔ اور اس امر کا یقین دلا دوں کہ نیچر نہیں بلکہ نیچر کا پیدا کرنیوالا خدا پیدا کرتا ہے۔ اس قسم کے ثبوت جو آپنے دیئے ہیں گو بہت سے ہیں۔ مگر مثال کے طور پر میں دو تین پیش کر دیتا ہوں۔

یاد رکھنا چاہئے۔ کہ کسی شخص کے کسی کام کا سبب ہونیکا مکمل ثبوت تبھی مل سکتا ہے۔ جب ہم اسکی طاقت کا دو طرح نمونہ دیکھیں۔ ایک تو یہ کہ جب وہ چاہے تو وہ کام ہو جائے۔ اور دوسرے یہ کہ جب وہ نہ چاہے تو نہ ہو۔ اگر صرف ایک پہلو ظاہر ہو یعنی جب وُہ چاہے تب وُہ کام ہو جائے۔ تب بھی ہمارے دلمیں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ شاید اس کام کے مدبّر ایک سے زیادہ ہوں۔ اور وہ بھی اسیطرح اس کام کو کر سکتے ہوں پس جب ہم کہتے ہیں کہ یہ کام صرف فلاں شخص کر سکتا ہے۔ تو ہمیں دو قسم کے ثبوت دینے چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ ہم ثابت کریں۔ کہ اس کام کے کرنے پر وہ قادر ہے۔ اور دوسرے یہ کہ جب وُہ اس کام کو نہ کرے تو وُہ کام نہیں ہوتا۔ اس ثبوت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں خدا تعالےٰ کے خالق ہونے کے ثبوت میں اثبات اور نفی کے جو ثبوت حضرت مسیح موعود علیہ السّلام نے پیش کئے ہیں پیش کرتا ہوں۔

پہلے میں اس امر کا ثبوت پیش کرتا ہوں۔ کہ آپ نے کونسے ایسے نشانات دکھائے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ خدا خالق ہے؟ اور میں سب سے پہلے اس کے متعلق ایک صاحب کا اپنا بیان جو کتاب "سیرۃ المہدی" میں شائع ہوا ہے۔ پیش کرتا ہوں۔ ان صاحب کا نام عطا محمد ہے۔ اور یہ پٹواری کا کام کرتے ہیں۔ وُہ بیان کرتے ہیں:۔

جب میں غیر احمدی تھا اور ونجواں ضلع گورداسپور میں پٹواری ہوتا تھا۔ تو قاضی نعمت اللہ صاحب خطیب بٹالوی جن کے ساتھ میرا ملنا جلنا تھا۔ مجھے حضرت صاحبؑ کے متعلق بہت تبلیغ کیا کرتے تھے۔ مگر میں پروا نہیں کرتا تھا۔ ایک دن انہوں نے مجھے بہت تنگ کیا۔ میں نے کہا بہت اچھا میں تمہارے مرزا کو خط لکھکر ایک بات کے متعلق دُعا کراتا ہوں اگر وُہ کام ہو گیا۔ تو میں سمجھ لونگا کہ وہ سچے ہیں۔

چنانچہ میں نے حضرت صاحبؑ کو خط لکھا کہ آپ مسیح موعود اور ولی اللہ ہونیکا دعوےٰ رکھتے

ہیں اور ولیوں کی دعائیں سُنی جاتی ہیں۔ آپ میرے لئے دعا کریں۔ کہ خدا مجھے خوبصورت صاحب اقبال لڑکا جس بیوی سے میں چاہوں عطا کرے۔ اور نیچے میں نے لکھ دیا۔ کہ میری تین بیویاں ہیں مگر کئی سال ہو گئے آجتک کسی کے اولاد نہیں ہوئی۔ میں چاہتا ہوں کہ بڑی بیوی کے بطن سے لڑکا ہو (ان کا منشاء یہ تھا کہ چونکہ وہ زیادہ عمر رسیدہ تھی اس لئے اس کے ہاں لڑکا ہونا اور بھی مشکل ہوگا) حضرت صاحب کی طرف سے مجھے مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط گیا۔ (مولوی صاحب مرحوم جو جماعت احمدیہ کے عمائد میں سے تھے۔ حضرتؑ کے صیغۂ ڈاک کے افسر تھے) کہ مولےٰ کے حضور دعا کی گئی ہے۔ اللہ تعالےٰ آپ کو فرزند ارجمند صاحب اقبال خوبصورت لڑکا جس بیوی سے آپ چاہتے ہیں عطا کریگا۔ مگر شرط یہ ہے۔ کہ آپ زکریا والی توبہ کریں۔

منشی عطا محمد صاحب بیان کرتے ہیں۔ کہ میں ان دنوں سخت بیدین اور شرابی کبابی۔ راشی مرتشی ہوتا تھا۔ چنانچہ میں نے جب مسجد میں جا کر ملّاں سے پوچھا۔ کہ زکریا والی توبہ کیسی تھی؟ تو لوگوں نے تعجب کیا۔ کہ یہ شیطان مسجد میں کسطرح آگیا ہے۔ مگر وُہ ملّاں مجھے جواب نہ دے سکا۔ پھر میں نے دھرم کوٹ کے مولوی فتح الدین صاحب مرحوم احمدی سے پوچھا۔ انہوں نے کہا۔ کہ زکریا والی توبہ بس یہی ہے۔ کہ بیدینی چھوڑ دو۔ حلال کھاؤ۔ نماز روزہ کے پابند ہو جاؤ۔ اور مسجد میں زیادہ آیا جایا کرو۔ یہ سُنکر میں نے ایسا کرنا شروع کر دیا۔ شراب وغیرہ چھوڑ دی۔ رشوت بھی بالکل ترک کر دی اور صلوٰۃ و صوم کا پابند ہو گیا۔

چار پانچ ماہ کا عرصہ گذرا ہوگا۔ کہ میں ایک دن گھر گیا تو اپنی بڑی بیوی کو روتے ہوئے پایا۔ سبب پوچھا۔ تو اس نے کہا۔ کہ پہلے مجھ پر یہ مصیبت تھی۔ کہ میرے اولاد نہیں ہوتی تھی۔ آپنے میرے پر دو بیویاں کیں۔ لیکن اب یہ مصیبت آئی ہے۔ کہ میرے حیض آنا بند ہو گیا ہے (گویا اولاد کی کوئی امید ہی نہیں رہی) ان دنوں میں اسکا بھائی امرتسر میں تھانیدار تھا۔ چنانچہ اس نے مجھے کہا۔ کہ مجھے میرے بھائی کے پاس بھیجدو۔ کہ میں کچھ علاج کرواؤں میں نے کہا وہاں کیا جاؤگی یہیں دائی کو بلوا کر دکھلاؤ۔ اور اس کا علاج کرواؤ۔

چنانچہ اس نے دائی کو بلوا دیا۔ اور کہا کہ مجھے کچھ دوا وغیرہ دو۔ دائی نے سرسری دیکھکر

کہا میں تو دوا نہیں دیتی نہ ہاتھ لگاتی ہوں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا تیرے اندر بھول گیا ہے (یعنی تو تو بانجھ تھی۔ مگر اب تیرے پیٹ میں بچہ معلوم ہوتا ہے پس خدا نے تجھے (نعوذ باللہ) بھول کر حمل کروا دیا ہے۔ مؤلف سیرۃ) اور اس نے گھر سے باہر آ کر بھی یہی کہنا شروع کیا۔ کہ خدا بھول گیا۔ مگر میں نے اُسے کہا کہ ایسا نہ کہو بلکہ میں نے مرزا صاحب سے دعا کروائی تھی۔

پھر منشی صاحب بیان کرتے ہیں۔ کہ کچھ عرصہ میں حمل کے پورے آثار ظاہر ہو گئے۔ اور میں نے ارد گرد سب کو کہنا شروع کیا۔ کہ اب دیکھ لینا میرے لڑکا پیدا ہوگا۔ اور ہوگا بھی خوبصورت۔ مگر لوگ بڑا تعجب کرتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ کہ اگر ایسا ہو گیا تو واقعی بڑی کرامت ہے۔ آخر ایک دن رات کے وقت لڑکا پیدا ہوا اور خوبصورت ہوا۔ میں اسی وقت دھرم کوٹ بھاگا گیا جہاں میرے کئی رشتہ دار تھے۔ اور لوگوں کو اس کی پیدائش سے اطلاع دی۔ چنانچہ کئی لوگ اسی وقت بیعت کے لئے قادیان روانہ ہو گئے۔ مگر بعض نہیں گئے۔ اور پھر اس واقعہ پر دنجواں کے بھی بعض لوگوں نے بیعت کی۔ اور میں نے بھی بیعت کر لی۔ اور لڑکے کا نام عبدالحق رکھا۔ منشی صاحب بیان کرتے ہیں۔ کہ میری شادی کو بارہ سال سے زائد ہو گئے تھے اور کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔"

یہ واقعہ کیسا بیّن اور واضح ہے اور کس طرح روز روشن کیطرح اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ہمارا خدا **ایک زندہ خدا ہے** اور وہ **خالق** ہے۔ اگر کوئی خدا نہیں یا وُہ خالق نہیں تو کس طرح ایک ایسے شخص کے ہاں جو بانجھ تھا جس نے تین بیویاں بارہ سال کے عرصہ میں کیں کہ اس کے ہاں اولاد ہو۔ مگر ایک کے ہاں بھی اس عرصہ میں اولاد نہ ہوئی۔ **مرزا صاحب** کی دُعا سے اولاد ہو گئی۔ اور پھر ان شرائط کے ساتھ ہوئی جو سوال کرنے والے نے کئے تھے یعنی اس عورت سے ہوئی جو سب سے معمر تھی۔ اور ہوا بھی لڑکا اور ہوا بھی خوبصورت اگر کوئی خدا نہیں اور اگر وُہ خالق نہیں۔ تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی دُعا سے یہ سب کچھ کس طرح ہوا؟ اور اس نشان کی عظمت اور شان اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ سائل کو قبل از وقت لکھ دیا گیا تھا۔ کہ اس کی طلب کردہ شرطوں کیساتھ

اس کے ہاں اولاد ہو جائیگی۔

پھر اس واقعہ کی عظمت اس اثر سے معلوم ہوتی ہے۔ جو اُن لوگوں پر ہوا جنہوں نے اس کو دیکھا اور اس وقت ہوا جب وہ امر واقع ہوا۔ اس واقعہ کا اثر جیسا کہ لکھا گیا ہے یہ ہوا کہ اس شخص نے بھی بیعت کر لی۔ اور اسکے دوسرے بہت رشتہ دار اسی وقت رات کیوقت ہی اٹھکر بیعت کرنیکے لئے قادیان چل پڑے۔ اور اس گاؤں کے دوسرے لوگوں نے بھی بیعت کر لی۔ وہ شخص اور وہ لڑکا اور بہت سے لوگ جنہوں نے اس واقعہ کو دیکھا تھا۔ ابتک بفضلہٖ زندہ موجود ہیں۔ اور ہر ایک شخص جو تحقیق کرنی چاہے۔ ان سے پوچھ سکتا ہے۔

اس واقعہ کے علاوہ اور بہت سے اس قسم کے واقعات ہیں کہ بے اولادوں کو آپکی دعا سے اولاد ہو گئی۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی مثالوں میں سے یہی ایک کافی ہے۔ ورنہ اصل میں تو حضرت مسیح موعودؑ کا ہر اک بچہ خواہ لڑکا ہو خواہ لڑکی پیشگوئی کے ماتحت ہوا ہے۔ اور اور بہت سے لوگوں کو بھی آپ کی دُعا سے اولاد عطا ہوتی ہے۔

اولاد کے بارہ میں جو خلق الٰہی پر ایک معتبر اور یقینی شہادت ہے۔ میں خلق کی قسم کا ایک اور معجزہ آپ کا پیش کرتا ہوں۔ یہ معجزہ اس طرح ظاہر ہوا کہ آپ نے رؤیا میں دیکھا۔ کہ آپ نے کچھ امور قضاء و قدر کے اہل دُنیا کی نیکی بدی کے متعلق اپنے لئے اور اپنے دوستوں کے متعلق لکھے اور خواہش کی کہ خدا تعالےٰ ان امور کو اسیطرح ظاہر کرے پھر آپنے خدا تعالےٰ کو متمثل دیکھا۔ اور وُہ کاغذ اس کے سامنے رکھدیا کہ تا وُہ اس پر دستخط کر دے۔ خدا تعالےٰ نے اس پر سُرخ سیاہی سے دستخط کر دیئے۔ دستخط کرنے کے وقت قلم کی نوک پر جو سُرخی زیادہ تھی۔ اسکو اس نے جھاڑا اور اس کے چھینٹے آپ کے کپڑوں پر پڑے اسوقت اس خیال سے کہ اللہ تعالےٰ نے میری باتوں کو مانکر ان پر دستخط کر دیئے ہیں۔ آپکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور آپؑ جاگ اُٹھے اس پر ایک شخص میاں عبداللہ صاحب نے جو اسوقت آپکے پاؤں دبا رہے تھے۔ آپ کو آپکے کپڑوں پر سُرخ نشان دکھائے۔ جو تازہ سُرخ سیاہی کے تھے۔ اور پوچھا کہ ابھی دباتے ہوئے میں نے یہ سُرخی جو ابھی تازہ ہے۔ کیونکہ ایک قطرہ کو میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ تو وُہ گیلی تھی دیکھی ہے یہ کیا امر ہے؟ کیا آپ نے کچھ دیکھا ہے؟ اس پر حضرت مسیح موعودؑ نے انکو

وُہ کشف سُنایا۔

یہ قطرے آپ کے کُرتے پر اور مولوی عبد اللہ صاحب کے گرد اور ریاست پٹیالہ جو اُس وقت آپ کو دبا رہے تھے کی ٹوپی پر پڑے تھے۔ چنانچہ اس نشان کی یاد میں مولوی عبد اللہ صاحب نے وہ کرتہ مسیح موعودؑ سے لے لیا تا کہ اس نشان کی یادگار کے طور پر رہے اور آپ نے اس شرط پر ان کو دیا۔ کہ وہ اپنی وفات کے وقت اسکو اپنے ساتھ ہی دفن کرنے کی وصیت کر جائیں تا بعد میں اس کے ذریعہ سے شرک نہ پھیلے۔ میں نے مولوی عبد اللہ صاحب سے جو اللہ تعالےٰ کے فضل سے ابھی تک زندہ ہیں پوچھا ہے کہ آیا سیاہی وغیرہ کے گرنے کا وہاں کوئی ظاہری امکان بھی تھا مگر وہ بیان کرتے ہیں۔ کہ اس کمرہ کی چھت بھی صاف تھی۔ . . . . . اور میں نے اس خیال سے کہ کہیں چھپکلی کی دم کٹ کر اس کے خون کے قطرے نہ گرے ہوں۔ اسی وقت اوپر دیکھا بھی تھا۔ مگر مجھے اوپر کوئی نشان نہیں ملا۔ اور نہ چھت ایسی تھی کہ اس پر اس قسم کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی تھی۔ اور انہوں نے یہ بھی بتایا۔ کہ اس کمرہ میں بھی کوئی اور چیز نہ تھی نہ دوات نہ کوئی اور چیز۔ مولوی عبد اللہ صاحب جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ اب تک زندہ ہیں۔ اور اس کُرتے کو انہوں نے اب تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ اور حلفی طور پر اس واقعہ کی گواہی دیتے ہیں۔

یاد رکھنا چاہئے۔ کہ ہم لوگوں کا ہرگز یہ عقیدہ نہیں۔ کہ خدا تعالےٰ کی واقع میں کوئی شکل ہے یا یہ کہ وہ بھی دستخط کرتا ہے یا قلم اور سیاہی استعمال کرتا ہے۔ یا یہ کہ کُرتے پر جو نشان پڑے تھے وہ فی الواقعہ اس سیاہی کے داغ تھے۔ جو اللہ تعالےٰ نے استعمال کی۔ بلکہ ہم تو جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ خدا تعالےٰ کو تمثیل مانتے ہیں۔ اور تمثل اور حلول سے پاک سمجھتے ہیں۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے۔ کہ جو کچھ آپ نے دیکھا وُہ ایک کشف تھا۔ خدا تعالےٰ کی صُورت جو دکھائی گئی وہ تصویری زبان میں اس تعلق کا تجسّم تھا جو خدا تعالےٰ کو آپؑ سے تھا۔ اور دستخط وغیرہ سے بھی یہی مراد تھی۔ کہ آپ کا مدّعا اور آپ کی خواہشات خدا تعالیٰ پوری کریگا۔ اور سیاہی جو آپ کے کپڑوں پر گری بلکہ اس شخص پر بھی گری جو آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا وہ بھی واقعہ میں خدا تعالےٰ کی قلم کی سیاہی نہ تھی۔ کیونکہ خدا تعالےٰ تو نہ قلم استعمال کرتا ہے۔ نہ سیاہی

بلکہ وہ رنگ خدا تعالیٰ نے اپنی صفتِ خلق کے ساتھ خارج میں پیدا کر کے گرا دیا تھا۔ تا وہ آپ کے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی ایک نشان ہو۔ اور خدا تعالےٰ کی صفتِ خلق پر یقین کیا جا سکے اور لوگ سمجھ سکیں۔ کہ اللہ تعالےٰ بلا ظاہری سامانوں کے اشیاء کو پیدا کر سکتا ہے اور اس کی صفتِ خلق آج بھی اسی طرح اپنا کام کر رہی ہے۔ اور کر سکتی ہے جس طرح کہ ابتدائے پیدائش میں وُہ کام کرتی تھی۔

اب میں ایک نشان آپ کا ایسا پیش کرتا ہوں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس طرح خدا پیدا کرتا ہے اسی طرح جب وہ حکم دیدے کہ یہ امر نہ ہو تو وہ نہیں ہو سکتا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ **صفتِ خلق** کلّی طور پر اللہ تعالےٰ میں ہی پائی جاتی ہے۔ اور اس کے کسی غیر کو اس میں دخل نہیں ہے۔ کیونکہ اگر غیر کو بھی حصہ ہوتا۔ تو اللہ تعالےٰ کے اس فیصلہ کے باوجود کہ فلاں کام نہ ہو۔ ان ہستیوں کے ذریعہ سے وُہ کام ہو سکتا تھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے۔ کہ آپ کا ایک دشمن سعد اللہ نامی تھا جو لدھیانہ کے مشن سکول میں مدرس تھا۔ سخت بدگو تھا۔ ہمیشہ آپ کے خلاف نظمیں اور مضمون شائع کرتا رہتا تھا۔ اور ان میں ایسی گندی گالیاں دیتا تھا۔ کہ میں نہیں جانتا۔ کہ شرفاء ان گالیوں کو خیال میں بھی لا سکتے ہیں حضرت مسیح موعود علیہ السّلام خود اس کی نسبت فرماتے ہیں۔ کہ شاید اور کسی شخص نے کسی نبی کو اس قدر گالیاں نہ دی ہونگی۔ جس قدر کہ اس شخص نے مجھے گالیاں دی تھیں۔ انہی گالیوں کے ساتھ یہ شخص یہ بھی شائع کرتا رہتا تھا۔ کہ چونکہ مرزا صاحب نعوذ باللہ من ذالک جھوٹے ہیں۔ اس لئے وہ تباہ ہو جائینگے اور وُہ اپنی اولاد کی نسبت جو خبریں شائع کرتے ہیں وہ بھی پوری نہ ہونگی۔ اور وہ نامراد ہی رہینگے۔ جب اس شخص کی گالیاں حد سے بڑھ گئیں اور بہتوں کے لئے یہ شخص ٹھوکر کا موجب ہوا۔ تو حضرت مسیح موعودؑ نے اللہ تعالےٰ سے دعا کی۔ کہ خدایا اس شخص کے لئے کوئی نشان ظاہر کر۔

چنانچہ خدا تعالےٰ نے آپکی دعا سُن لی۔ اور چونکہ یہ شخص ہدایت سے دُور ہو چکا تھا۔ اور خود اپنے لئے خدا کی رحمت کا دروازہ بند کر رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا۔ کہ یہ اسی تلوار سے مارا جائے۔ جو یہ مسیح موعودؑ کے خلاف چلاتا ہے۔ اور اس نے آپ کو وحی کی۔ کہ اِنَّ شَانِئَکَ

هُوَ الْاَبْتَرُ۔ تیرا دشمن جو تیری نسبت کہتا ہے۔ کہ تیری نسل قطع ہو جائیگی۔ اسی کی نسل قطع ہوگی۔ اور وہ بے نسل رہجائیگا۔

اب عجیب بات ہے۔ کہ جب یہ الہام آپکو ہوا۔ تو اس وقت اس شخص کے ہاں ایک لڑکا پہلے سے موجود تھا جسکی عمر چودہ سال کے قریب تھی۔ اور یہ مولوی ابھی جوان ہی تھا۔ اور اولاد کا سلسلہ آئندہ منقطع ہونیکی کوئی وجہ نہ تھی۔ مگر اس نے جو خالق ہے اس الہام کے بعد اس شخص سے اپنی صفت خلق کا سایہ ہٹا لیا۔ اور باوجود اسکے کہ اس شخص کی عمر ابھی تھوڑی ہی تھی۔ اسکی نسل کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اور گو وُہ اس پیشگوئی کے بعد چودہ سال تک زندہ رہا مگر اسکے ہاں اولاد نہ ہوئی۔ اور آخر جنوری ۱۹۰۷ء میں اس پیشگوئی کو سچا کرتا ہوا مر گیا۔

اگر نشان اس حد تک ہی رہتا۔ تو بھی ایک بہت بڑا ثبوت خدا تعالےٰ کی خالقیت کا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس نشان کو اور بھی زیادہ کیا۔ اور وُہ یہ کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دشمنوں نے یہ دیکھکر کہ آپ کا ایک نشان ظاہر ہوگا۔ ایک طرف تو شور مچانا شروع کیا۔ کہ مرزا صاحبؑ نے تو کہا تھا۔ کہ سعد اللہ ابتر رہیگا لیکن اسکے تو ایک لڑکا موجود ہے اور دوسری طرف اس لڑکے کی شادی کی کوششیں شروع کر دیں تا کہ اسکی اولاد ہو جائے۔ اور مرزا صاحب پر جھوٹ کا الزام آئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ان حملوں کے جواب میں اپنی کتاب حقیقۃ الوحی میں لکھا۔ کہ یہ لڑکا تو پیشگوئی سے پہلے ہی موجود تھا۔ پس یہ لڑکا تو پیشگوئی کے خلاف نہیں ہو سکتا ہاں اگر اس کی اولاد ہو جائے۔ تو بیشک اعتراض پڑ سکتا ہے۔ مگر یہ یاد رکھو کہ اس کے ہاں اولاد نہ ہوگی۔ اور سعد اللہ ضرور منقطع النسل ہو کر رہے گا۔ چنانچہ آخر اسی طرح ہوا۔ یعنی گو مولوی سعد اللہ کے لڑکے کی شادی کر دی گئی لیکن اس کے اولاد نہ ہوئی۔ آخر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دشمنوں نے آپکو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے اس کی ایک اور شادی کر دی۔ کہ شاید اس سے اولاد ہو مگر باوجود اسکے بھی آجتک اس کے کوئی لڑکا نہیں ہُوا۔

ایک جوان آدمی کی نسبت یہ لکھنا کہ اس کے اولاد نہ ہوگی ایک ایسا بڑا معاملہ ہے۔ کہ انسان کی طبیعت اس کا خیال کر کے بھی گھبراتی ہے۔ چنانچہ جب آپؑ نے اپنی کتاب میں یہ لکھا۔ تو آپ کا ایک مرید جو وکیل تھا۔ اور جس کا ایمان بوجہ کمی بصیرت کے کمزور تھا۔ اور جو آپؑ کی وفات کے

بعد اسی طرح ٹھوکر کھا گیا جس طرح بعض مسیح ناصری کے حواریوں نے ٹھوکر کھائی تھی اسپر سخت معترض ہُوا۔ کہ ایسا آپؑ کیوں لکھتے ہیں؟ اگر اسکے اولاد ہوگئی تو سخت مشکل ہوگی۔ اور لوگوں میں بدنامی ہوگی۔ اور شاید کوئی مقدمہ بھی دشمن کھڑا کر دے۔ مگر آپؑ نے اسکو یہی جواب دیا۔ کہ جو کچھ اللہ تعالےٰ مجھے بتاتا ہے میں اس سے کیونکر منہ پھیر سکتا ہوں۔ اور اس میں شک لا سکتا ہوں تمہارا یہ اعتراض قلتِ ایمان کا نتیجہ ہے۔ اور کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ثابت ہوا۔

اب دیکھو اگر وہ لڑکا بچپن میں مر جاتا تو شاید کوئی کہدیتا۔ کہ یہ اتفاق تھا۔ مگر پیشگوئی کے بعد پہلے تو باپ کی پندرہ سال تک اولاد بند رہی۔ اور پھر جو لڑکا موجود تھا اسکی دو دفعہ شادی کی گئی۔ مگر اولاد اس کے بھی پیدا نہ ہوئی۔ اگر خالق خدا نے ہی یہ فیصلہ نہ کیا ہوتا۔ کہ دشمن کے منہ پر اس کی بدزبانی ماری جائے۔ اور سرکش کو اس کے کئے کی سزا دیجائے تو یہ کس طرح ممکن تھا۔ اس نشان کو دیکھکر اور بے تعصبی سے غور کر کے کون ہے جو یہ کہہ سکے۔ کہ اسلام کا خدا ایسا ہی خالق نہیں ہے جیسا کہ وہ ابتدائے آفرینش میں تھا؟ کیونکہ کیا ایسا نہیں ہوا کہ اس نے کہا کہ فلاں کے اولاد ہو۔ اور اسکے اولاد ہوگئی۔ اور اس نے کہا کہ فلاں کے اولاد نہ ہو۔ اور اس کے اولاد نہ ہوئی۔ پھر کون ہے جو اس نشان کو دیکھکر تازہ ایمان نہ حاصل کرے اور اس کا دل یقین اور انشراح سے بھر نہ جائے؟ اور وُہ **"کوئی خالق ہونا چاہیئے"** کے شک اور گمان کے مقام سے بلند ہو کر **"دنیا کا ایک خالق ہے"** کے وثوق اور اطمینان کے مرتبہ تک نہ پہونچ جائے۔ فَسُبْحَانَ اللّٰہِ اَحْسَنَ الْخَالِقِیْنَ؛

اب میں اللہ تعالیٰ کی ایک تیسری صفت کو لیتا ہوں جو مذکورہ بالا صفات کی طرح مشہور صفت ہے۔ اور جس سے چھوٹے بڑے سب واقف ہیں یعنی **صفت شفا**۔ اس صفت پر تو لوگوں کو ایسا یقین ہے۔ کہ کئی مذاہب کے پیروؤں کا دعویٰ ہے۔ کہ وُہ اس صفت کا نمونہ دکھا سکتے ہیں۔ چنانچہ بہت سے لوگ دعا سے مریضوں کا علاج کرنے کی طرف متوجہ ہیں۔ مگر ہر شخص جو عقل سے کام لے سمجھ سکتا ہے۔ کہ یہ کام دعا یا خدا کی خاص تقدیر سے بالکل تعلق نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس قسم کی شفا کسی خاص مذہب کے لوگوں سے تعلق نہیں رکھتی۔ بلکہ ایسے لوگ جو اس طرح شفا دیتے ہیں مسیحیوں میں بھی پائے جاتے ہیں ہندوؤں میں بھی یہودیوں میں بھی

اور زرد شتیوں میں بھی پس یہ امر کسی مذہب کی صداقت کا ثبوت کس طرح کہلا سکتا ہے؟ اور کس طرح تعلق باللہ کا نشان سمجھا جا سکتا ہے؟

دوسرے یہ کہ اگر یہ تعلق باللہ کی علامت ہے۔ تو ہم ان لوگوں سے دریافت کرنیکا حق رکھتے ہیں۔ کہ کیا وجہ ہے۔ کہ صرف صفتِ شافی تو انکی دُعا کی وجہ سے حرکت میں آتی ہے۔ اور مریض کو شفا بخشتی ہے۔ مگر خدا تعالیٰ کی باقی صفات انکی دعا کے ذریعہ سے جوش میں نہیں آتیں؟ نہ خَلق کی نہ علم کی نہ احیا کی نہ حفاظت کی نہ اور دوسری صفات۔ جو لوگ کہ صفاتِ الٰہیہ کے ظہور کے بالکل ہی منکر ہیں وہ تو خیر یہ جواب دے بھی سکتے ہیں۔ کہ خدا کی صفات ظاہر نہیں ہوتیں لیکن جو شخص کہ ایک صفت کیمتعلق دعویٰ کرتا ہے۔ کہ میری دُعا اور توجہ سے وُہ ظاہر ہوتی ہے۔ اس پر واجب ہے کہ وُہ اس سوال کا بھی جواب دے کہ پھر باقی صفات کا اظہار خدا تعالےٰ کیوں نہیں کرتا؟

اصل بات یہ ہے کہ علاوہ دعا اور اسکی قبولیت کے انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک طبعی مادہ رکھا ہے۔ کہ اس کی توجہ کا ایک مخفی اثر دوسرے انسان پر ہوتا ہے۔ اور اسکے خیالات کی لہر اس کے معمول کے اندر جا کر اسکے اعصاب پر قبضہ پا لیتی ہے۔ اور اسکے خیالات کو اپنے خیالات کے مطابق کر لیتی ہے۔ اور جب معمول کے خیالات عامل کے خیالات کے مطابق ہو جاتے ہیں۔ تو پھر ان خیالات کے اثر کے نیچے اسکے اندر ایک اچھی یا بُری تبدیلی شروع ہو جاتی ہے۔ جو عامل نے معمول کے اندر پیدا کرنی چاہی تھی۔ مگر یہ اثرات قریبًا قریبًا اعصابی دور تک ہی محدود ہیں۔ مثلاً یہ تو ہو جائیگا کہ ایک شخص کی توجہ سے کسی کا بخار ٹوٹ جائے۔ یا آنکھ کی سُرخی جاتی رہے۔ یا سردرد دور ہو جائے۔ مگر مثلاً یہ نہیں ہوگا کہ آتشک یا کوڑھ یا سِل وغیرہ کی بیماریاں دور ہو جاویں یہ طاقت مشق کرنے سے بہت بڑھ جاتی ہے اور یہ شرط نہیں ہے۔ کہ ضرور مقررہ قواعد کے ساتھ ہاتھ پھیرنے یا [illegible] یا سجیشن دینے سے ہی ایسے نتائج نکلیں۔ اصل امر تو توجہ کا قیام ہے۔ اگر توجہ کا قیام اور احساسات کا اجتماع کسی خاص امر کے متعلق ہو جائے۔ تو خواہ دُعا کے ہی رنگ میں ہو۔ اس کا اثر ہو جاتا ہے۔ ہر اک شخص جو اس طرف توجہ کرے تھوڑی سی کوشش سے اسمیں ترقی کر سکتا ہے۔ بلکہ جو لوگ شراب اور سؤر کا استعمال نہیں کرتے۔ وہ تو بہت ہی جلد اس علم کے ماہر ہو سکتے ہیں۔ مگر اس علم میں انسان خواہ کس قدر بھی ترقی کر جائے۔ اسے رُوحانیت

کی ترقی نہیں کہہ سکتے نہ خدا تعالےٰ کا کوئی غیر معمولی نشان قرار دینگے ہاں یہ کہینگے۔ کہ فلاں شخص نے خدا تعالےٰ کے بنائے ہوئے ایک قدرت کے قانون سے فائدہ اٹھایا ہے۔

خلاصہ یہ کہ آجکل جو لوگ شفا کے اس قسم کے شعبدے دکھاتے ہیں۔ وہ ہرگز خدا کے نشانات نہیں کہلا سکتے۔ اور نہ وہ کسی خاص مذہب سے مخصوص ہیں۔ مگر جو نشانات خدا تعالےٰ کی صفتِ شافی ہونیکے ثبوت میں حضرت مسیح موعودؑ نے دکھلائے ہیں۔ وہ بے شک ایسے ہیں۔ کہ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا ہے اور اس میں شفا دینے کی طاقت ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر میں آپؑ کا ایک نشان پیش کرتا ہوں۔

جب آپؑ کے سلسلہ کی ترقی شروع ہوئی۔ تو آئندہ نسلوں کو احمدی خیالات میں رنگین کرنیکے لئے اور ان کے اندر علمی جذبہ پیدا کرنے کے لئے حضرت مسیح موعودؑ نے قادیان میں ایک ہائی سکول اپنی جماعت کیطرف سے جاری کیا۔ اس سکول میں احمدی جماعت کے طالب علم بہت دور دور کے علاقوں سے آتے تھے۔ تاکہ دُنیاوی تعلیم کے علاوہ دینی تعلیم بھی پاویں۔ ان طالب علموں میں جو دور سے آئے ہوئے تھے۔ ایک لڑکا عبدالکریم نامی ریاست حیدر آباد کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس لڑکے کو اتفاقًا دیوانے کتے نے کاٹ کھایا اور اسکو علاج کے لئے کسولی بھیجدیا گیا۔ جہاں کہ پیشیور انسٹی ٹیوٹ کی ایک شاخ ہے۔ لڑکا علاج کرا کے واپس آگیا۔ اور یہ سمجھ لیا گیا۔ کہ وہ خطرہ سے باہر ہو گیا ہے۔ مگر قادیان میں واپس آتے ہی اسے دیوانگی کا دورہ ہو گیا۔ اور نہایت سخت تکلیف میں جو اس بیماری کا خاصہ ہے وہ مبتلاء ہو گیا گلے کے تشنج اور خوف کی زیادتی اور نیند کے اڑ جانے اور جنون کے دوروں کی وجہ سے جن میں اس کا دل تیمار داروں کو مارنے کو اور کاٹنے کو چاہتا تھا۔ اور جن پر وہ بعد میں اس قدر پشیمان ہوتا کہ تیمار داروں کو کہتا۔ کہ وہ اسے چھوڑ کر چلے جائیں۔ تا وہ ان کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ اس کی حالت نہایت نازک ہو گئی۔ تب ہیڈ ماسٹر مدرسہ نے کسولی کے پیشیور انسٹی ٹیوٹ کے انچارج ڈاکٹر کو تار دی۔ کہ اب اس کے لئے کچھ ہو سکتا ہے۔ یا نہیں؟ مگر اس نے بجواب تار دی کہ "افسوس! عبدالکریم کے لئے کچھ نہیں کیا جا سکتا"

"Sorry nothing can be done for Abdul Karim."

چونکہ وُہ لڑکا دُور سے آیا تھا۔ اور جس علاقہ کا وہ لڑکا تھا۔ اسمیں تعلیم کا بہت ہی کم رواج تھا۔ اور خیال تھا کہ اگر یہ مرگیا۔ تو ان علاقوں پر اس کا بداثر پڑیگا۔ آپؑ کے دل میں اُسکی نسبت دعا کا ایک خاص جوش پیدا ہوا۔ اور آپ نے اس کیلئے دعا کی۔ آخر اللہ تعالےٰ نے آپکی دُعا سُنی اور وُہ لڑکا جس کی نسبت خیال تھا۔ کہ چند گھنٹوں میں مرجائیگا۔ اور جس کی تشنج کی حالت نہایت شدید ہوگئی تھی۔ جسے کہ اس کو دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اس کو اللہ تعالےٰ نے آپؑ کی **دُعا سے اچھا کردیا۔**

جو لوگ علم طب سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں۔ کہ دیوانے کتے کے مریض کو جب دورہ ہوجائے تو اس کا کوئی علاج نہیں تب وہ ضرور مرجاتا ہے۔ اور آجتک ایک کیس بھی ایسا نہیں ہُوا کہ ایسا مریض بچ گیا ہو۔ چنانچہ جب اس لڑکے کی شفایابی کی خبر کسولی پہونچی۔ تو وہاں سے ایک شخص نے یہ خط لکھا:۔

"سخت افسوس تھا۔ کہ عبدالکریم جس کو دیوانے کتے نے کاٹا تھا۔ اس کے اثر میں مبتلا ہوگیا۔ مگر اس بات کے سننے سے بڑی خوشی ہوئی کہ وُہ دعا کے ذریعہ سے صحت یاب ہوگیا۔ ایسا موقعہ جانبر ہونیکا کبھی نہیں سُنا۔"

یہ وُہ شفا کی قسم ہے۔ جو حقیقی شفا کہلا سکتی ہے۔ اور جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے۔ کہ کوئی خدا ہے جسمیں شفا دینے کی طاقت ہے۔ اور وُہ لوگ جو ایسی شفا کے نمونے دکھائیں۔ اس امر کا حق رکھتے ہیں۔ کہ کہیں کہ انہوں نے خدا تعالےٰ کو اسکی اصلی صورت میں اور یقینی طور پر دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

حضرت مسیح موعودؑ نے اور بھی بہت سے نشانات اس صفت کے ظاہر اور روشن کرنے کے لئے دکھائے ہیں۔ مگر اسجگہ ان سب کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں یہ مضمون نامکمل رہے گا اگر میں اس چیلنج کا ذکر نہ کروں۔ جو آپؑ نے پادری صاحبان کو دیا تھا۔ آپ نے اس میں لکھا تھا۔ کہ آپ لوگ مسیحؑ اول کے پیرو ہیں۔ جو نشانات دکھاتا تھا۔ اور آپ لوگوں کو اس کا قائم مقام ہونے کا دعوےٰ ہے۔ اور مجھے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام ہونے کا دعوےٰ ہے پس میں آپ کو چیلنج دیتا ہوں۔ کہ آپ میرے ساتھ دعا میں اس طرح مقابلہ کرلیں۔ کہ بعض

خطرناک مریض جو عام طور پر اچھے ہونیکے قابل نہیں سمجھے جاتے ان کو لیکر بذریعہ قرعہ آپس میں برابر تعداد میں تقسیم کرلیا جائے۔ پھر جو مریض میرے حصے میں آئیں ان کیلئے میں دعا کروں اور جو آپ لوگوں کے حصہ میں آئیں انکے لئے آپ دعا کریں۔ پھر دیکھیں۔ کہ اللہ تعالےٰ کس فریق کے بیماروں کو اچھا کرتا ہے؟ مگر افسوس کہ پادری صاحبان اس مقابلہ پر نہ آئے۔

اللہ تعالےٰ کی صفات میں سے ایک صفت **قدوس** بھی ہے۔ یعنی وُہ پاک ہے۔ اب اس صفت پر سب مذاہب ہی متفق ہیں لیکن کوئی ہمیں یہ نہیں بتاتا۔ کہ خدا تعالےٰ کی نسبت کیونکر معلوم ہوا کہ وُہ قدوس ہے۔ اول تو جو صفات اسکی بیان کیجاتی ہیں۔ وہی مشتبہ ہیں۔ ان سے ہم اندازہ کس طرح لگا سکتے ہیں۔ کہ وہ قدوس ہے؟ اگر اس امر کو نظرانداز بھی کردیا جائے اور اس صفت کو مستقل طور پر الگ ہی تسلیم کرلیا جائے۔ تو بھی اس کا ثبوت ہمیں کوئی نہیں ملتا۔ اس صفت کا ثبوت صرف ایک ہی ہوسکتا ہے۔ اور وُہ یہ کہ کوئی ایسے لوگ ہوں۔ جو خدا تعالےٰ کا قرب پانیوالے اور اسکے لقا کا رتبہ حاصل کرنیوالے ہوں پھر انکے وجود میں قدوسیت کی صفت کو جلوہ گر ہوتے ہوئے دیکھیں۔ اور اگر یہ نہ ہو تو ایکطرف خدا تعالےٰ کی صفت قدوسیت مشتبہ رہتی ہے۔ اور دوسری طرف اس امر کا بھی انکار کرنا پڑتا ہے۔ کہ خدا تعالےٰ سے کبھی کسیکو قرب حاصل ہوا ہے۔ کیونکہ جب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ایک گلاب کا پھول تھوڑی دیر کپڑوں کے ساتھ لگا رہے۔ تو تمام کپڑے اس کی خوشبو سے مہک جاتے ہیں۔ اور ایک معطر انسان کے پاس تھوڑی دیر کوئی بیٹھ جائے تو اس سے بھی خوشبو کی لپٹیں آنے لگتی ہیں۔ تو ہم کس طرح قبول کرسکتے ہیں۔ کہ ایک شخص خدا تعالےٰ کا مقرب تو بنا۔ مگر اس نے خدا سے کچھ نہ پایا؟ اور اسکی اس خوشبو سے جو درحقیقت سب صفات کی جامع ہے یعنی قدوسیت۔ کورا کا کورا ہی رہا؟ چونکہ یہ امر خلافِ عقل ہے۔ اس لئے وہی شخص خدا تعالےٰ کا مقرب سمجھا جاسکتا ہے۔ اور اسی کے ذریعہ سے اللہ تعالےٰ کی قدوسیت کا ثبوت مل سکتا ہے۔ جو خدا سے قدوسیت حاصل کرکے خود قدوس ہو۔ اور اپنی نیکی اور تقویٰ کی وجہ سے دنیا کے لئے نمونہ بنے۔

حضرت مسیح موعودؑ کی زندگی کو جب ہم دیکھتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپؑ اس صفت کے بھی ثابت کرنیوالے ہیں۔ آپؑ نے اپنے وجود سے خدا تعالےٰ کی صفت قدوسیت کو

روزِ روشن کیطرح ثابت کر دیا ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ انسان پر اس صفت کا انعکاس ایسے ہی رنگ میں ہو سکتا ہے۔ جو بشریت کے مناسب حال ہو ورنہ وہ خدا بنجائیگا۔ جو خلافِ عقل ہے مگر بشریت کے مطابق اس کا انعکاس اس کی شان کو کم نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے مقصد کو یعنی صفاتِ باری کو پورے طور پر ثابت کرنیکے کام کو خوب اچھی طرح ادا کرتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس صفت کو بھی جیسا کہ میں بتا چکا ہوں۔ اپنے وجود میں پیدا کیا ہے اور ہم دیکھتے ہیں۔ کہ دشمن سے دشمن بھی اس امر کا مُقر ہے۔ کہ آپؑ میں کوئی عیب نہ تھا۔ اس جگہ ایک نکتہ یاد رکھنے والا ہے۔ کہ موعود جب دُنیا میں آتے ہیں تو بوجہ مذہبی مخالفت کے لوگ ان پر کئی قسم کے عیب لگانے لگتے ہیں۔ کیونکہ عداوت انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔ اور خوبی کو بھی عیب کر کے دکھاتی ہے پس انبیاء کی زندگی کو جانچتے ہوئے ہمیشہ ان کے دعویٰ سے پہلے کی زندگی کو لینا چاہئے۔ کیونکہ اسوقت تک لوگوں کو ان سے ایسی خاص عداوت نہیں ہوتی۔ کہ تعصب سے بالکل ہی اندھے ہو جائیں۔ پس وہی زندگی ان کی قدوسیت کا معیار ہے۔

حضرت مسیح ناصری جو اللہ تعالیٰ کے ہادیوں میں سے ایک ہادی تھے۔ اور اسی جماعت کے ایک فرد تھے جنہیں سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام ہیں۔ آپکی زندگی بھی جیسا کہ ضروری تھا نہایت پاکیزہ اور صاف تھی۔ حتےٰ کہ آپنے اپنے دشمنوں کو چیلنج دیا تھا کہ "کون تم میں سے مجھ پر گناہ ثابت کر سکتا ہے؟" (یوحنا باب ۸ آیت ۴۶) مگر یہ دعوے پہلی ہی زندگی کے متعلق ہو سکتا تھا۔ ورنہ نبوت کے بعد کی زندگی پر لوگ بوجہ تعصب سے اندھا ہو جانیکے معترض تھے۔ چنانچہ خود حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

"ابن آدم کھاتا پیتا آیا۔ اور وُہ کہتے ہیں۔ دیکھو کھاؤ۔ اور شرابی آدمی محصول لینے والوں اور گنہگاروں کا یار۔" (متی باب ۱۱ آیت ۱۹)

مسیح ایسا نہ تھا۔ بلکہ ان لوگوں کی آنکھوں پر بوجہ تعصب پٹی بندھ گئی تھی۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی بھی قدوسیت کا ایک اعلیٰ نمونہ تھی۔ اور نبوت سے پہلے زمانہ کی زندگی کے متعلق آپکے سخت سے سخت دشمنوں کی شہادتیں موجود ہیں کہ اس پر

کوئی عیب نہیں لگایا جا سکتا۔ چنانچہ مولوی محمد حسین بٹالوی جو دعویٰ کے بعد آپ کا سب سے بڑا دشمن ثابت ہوا۔ وُہ آپکی زندگی کے متعلق اپنے رسالہ اشاعۃ السنۃ میں لکھتا ہے:۔

"مؤلف براہین احمدیہ (یہ حضرت مسیح موعود کی ایک کتاب کا جو مسیحیت کے دعوے سے پہلے لکھی گئی تھی نام ہے) اسلام کی مالی وجانی وقلمی ولسانی وحالی نصرت میں ایسا ثابت قدم نکلا ہے جس کی نظیر پہلے مسلمانوں میں بہت کم پائی جاتی ہے۔"

اس رائے میں سے "حالی نصرت" کے الفاظ قابل غور ہیں۔ انکے یہ معنی ہیں۔ کہ جو نمونہ اخلاق اور اعلیٰ چال چلن کا آپؑ نے دکھایا ہے۔ وہ ایسا ہے۔ کہ اسکو دیکھکر لوگوں کو اسلام کی طرف رغبت پیدا ہوتی ہے۔ اور وُہ ایسا کامل نمونہ ہے۔ کہ پہلے مسلمانوں میں بھی اسکی نظیر بہت کم پائی جاتی ہے تمام مذاہب کے پیرووں کو پہلے لوگوں کی عزت کے قیام اور ان کے درجہ کو بڑھا کر دکھانیکا جسقدر شوق ہے۔ اسکو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات اچھی طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ ایک مولوی کے لئے یہ لکھنا کسقدر مشکل ہے کہ فلاں شخص پہلے مسلمانوں سے بھی بڑھ گیا۔ ان مولوی صاحب کی شہادت اسوجہ سے اور بھی زیادہ عظمت رکھتی ہے۔ کہ آپ قادیان کے پاس کے رہنے والے تھے۔ اور بچپن سے آپؑ کے واقف تھے۔ اور آپس میں برابر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

یہ تو ایک اشد مخالف کی تحریری رائے ہے۔ اس رائے کے علاوہ بھی ہر ایک شخص جو آپؑ کا جاننے والا ہے۔ وہ آپکی نیکی کا قائل اور معترف ہے۔ قادیان میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ ہندو بھی آریہ بھی سکھ بھی اور غیر احمدی مسلمان بھی۔ قادیان کے دروازہ بٹالہ میں مسیحیوں کا ایک بہت بڑا مرکز ہے۔ یہ سب لوگ آپکے سخت ترین دشمن ہیں۔ بلکہ جس قدر دشمنی ان لوگوں کو ہے۔ اور کسی کو شاید نہ ہوگی۔ کیونکہ نبی اپنے شہر اور اپنے علاقہ میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ مگر باوجود اس عداوت کے سب لوگ معترف ہیں۔ کہ بچپن سے لیکر آخر عمر تک آپکی نیکی اور تقویٰ ناقابل گرفت و اعتراض تھا۔ آپکی صداقت پر لوگوں کو ایسا یقین تھا۔ کہ آپکے خاندان کے ساتھ جن لوگوں کے دیوانی مقدمات ہوتے تھے۔ اگر وہ سمجھتے تھے کہ وہ حق پر

ہیں۔ تو ہمیشہ یہ تجویز پیش کر دیتے تھے۔ کہ جو کچھ آپؑ کہدینگے وہ انکو منظور ہوگا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے۔ کہ آپ کبھی خلاف حق بات نہیں کہینگے۔ خواہ اسمیں آپکا یا آپکے رشتہ داروں کا کتنا ہی نقصان کیوں نہو۔

ایک دفعہ آپؑ پر ایک مقدمہ ڈاکخانہ کی طرف سے چلایا گیا۔ جسمیں جرمانہ اور قید دونوں سزائیں مل سکتی تھیں۔ چونکہ ڈاکخانہ کے قواعد کی خلاف ورزی اس زمانہ میں کثرت سے ہوتی تھی۔ ڈاکخانہ والے چاہتے تھے۔ کہ ایک دو شخصوں کو سخت سزا ہو جائے۔ تو آئندہ لوگ احتیاط کرینگے۔ اس لئے ڈاکخانہ کا انگریز افسر خود پیروی کے لئے آتا اور پورا زور دیتا کہ آپکو سزا ہو جائے۔ اس مقدمہ کی بنا صرف اس شخص کی شہادت پر تھی۔ جس نے آپکا بھیجا ہوا پیکٹ کھولا تھا۔ جس میں ایک خط تھا۔ اور خط کا پیکٹ میں بھیجنا قوانین ڈاک کے مطابق جرم تھا۔ وکلاء نے کہا۔ کہ بچنے کی صرف یہ صورت ہے۔ کہ آپؑ کہیں کہ میں نے خط الگ بھیجا تھا۔ وہ شخص جس کے نام پیکٹ تھا چونکہ پادری تھا۔ اور آپ سے مباحثات کر چکا تھا۔ اور ایک رنگ میں آپ سے عداوت رکھتا تھا۔ یہ عذر آپؑ کا یقینی طور پر قابل قبول تھا۔ مگر آپؑ نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں جھوٹ کس طرح بول سکتا ہوں؟ میں نے واقع میں خط بھیجا ہے۔ گو یہ سمجھ کر اُسے پیکٹ میں ڈال دیا تھا۔ کہ وہ بھی مضمون پیکٹ کے متعلق تھا۔ مجسٹریٹ پر اس امر کا اسقدر اثر ہوا۔ کہ باوجود ڈاکخانہ کے افسروں کے اصرار کے اس نے آپکو بری کر دیا۔ اور کہا کہ جو شخص قید ہونے کے خطرہ میں ہے۔ اور منہ کے ایک فقرہ سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ لیکن کوئی پرواہ نہیں کرتا اور جھوٹ نہیں بولتا میں اُسے ہرگز سزا نہیں دے سکتا۔

مجھے سب سے زیادہ ایک بوڑھے شخص کی شہادت پسند آیا کرتی ہے یہ ایک سکھ ہے جو آپکا بچپن کا واقف ہے وہ آپ کا ذکر کر کے بے اختیار رو پڑتا ہے اور سنایا کرتا ہے کہ ہم کبھی آپکے پاس آکر بیٹھتے تھے۔ تو آپ ہمیں کہتے کہ جا کر میرے والد صاحب سے سفارش کرو۔ کہ مجھے خدا اور دین کی خدمت کرنے دیں۔ اور دنیوی کاموں سے معاف رکھیں۔ پھر وہ شخص یہ کہکر رو پڑتا کہ "وہ تو پیدائش سے ہی ولی تھے۔"

ایک غیر مذہب کا شخص جس نے آپکی زندگی کے سب دَور دیکھے ہیں۔ اور آپ کے راز سے

پوری طرح واقف ہے۔ اس کی یہ شہادت معمولی شہادت نہیں ہے۔ اور اسی پر منحصر نہیں ہر شخص جو جسقدر آپؑ کا زیادہ واقف ہے۔ اسیقدر آپؑ کے اخلاق اور آپکے تقوٰی اور آپؑ کی ہمدردی بنی نوع انسان کی تعریف کرتا ہے۔ اور یہی معیار اعلیٰ اخلاق کا ہوتا ہے کہ اپنے اور بیگانے جو کسی شخص کی تمام زندگی کے حالات سے واقف ہوں وہ اسکی دیانتداری اور تقدس کی تعریف کریں۔

آپ نے خود بھی اپنے مخالفوں کو مسیح ناصری کی طرح ان الفاظ میں چیلنج دیا ہے مگر کوئی مقابل پر نہیں آیا:۔

"میں چالیس برس تک تم میں ہی رہتا رہا ہوں۔ اور اس مدت دراز تک مجھے دیکھتے رہے ہو کہ میرا کام دروغ اور افترا کا نہیں ہے۔ اور خدا نے ناپاکی کی زندگی سے مجھے محفوظ رکھا۔ تو پھر جو شخص مدت دراز تک یعنی چالیس برس تک ہر ایک افتراء اور شرارت اور مکر اور خباثت سے محفوظ رہا۔ اور کبھی اس نے خلقت پر جھوٹ نہیں بولا۔ تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ برخلاف اپنی عادت قدیم کے اب وہ خدا تعالٰے پر افتراء کرنے لگا۔" (تریاق القلوب ایڈیشن دوم ص۱۵۷ و ص۱۵۸)

پھر فرماتے ہیں:۔

"کون تم میں ہے۔ جو میری سوانح زندگی میں نکتہ چینی کر سکتا ہے؟ پس یہ خدا کا فضل ہے۔ کہ جو اس نے ابتداء سے مجھے تقوے پر قائم رکھا۔" (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۶۲)

ان شہادتوں اور دعووں سے ظاہر ہے۔ کہ آپکی زندگی نہ صرف عیوب سے پاک تھی۔ بلکہ آپ کو ایسا تقوٰی نصیب تھا۔ کہ آپ کے دشمن بھی گو آپؑ کے دعوٰی میں آپکو غلطی پر قرار دیتے تھے مگر وہ آپکے ذاتی تقوٰی اور طہارت کے متعلق متفق اللسان ہو کر گواہی دیتے تھے۔ اور الفضل **ما شهدت به الاعداء**۔ پس آپ کے وجود میں اللہ تعالٰے کی صفت **قدوسیت** بھی ظاہر ہوئی۔ اور آپؑ کی حالت کو دیکھکر ہمیں یہ یقین ہوا۔ کہ جس خدا کا یہ بندہ ہے جس نے بچپن کے زمانہ سے آخر تک کوئی گناہ نہیں کیا۔ کوئی اخلاقی یا روحانی کوتاہی

نہیں دکھاتی۔ بلکہ سب اخلاق حسنہ پر کاربند رہا ہے اور تقویٰ کا زندہ نمونہ دکھایا ہے۔ وہ خود کیسا پاک ہے۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَتَعَالیٰ عَمَّا یَصِفُوْنَ ؛

ایک صفت اللہ تعالیٰ کی محی بھی ہے۔ یعنی مُردوں کو زندہ کرنے والا۔ انجیل میں اس قسم کے معجزات پر بہت زور دیا گیا ہے۔ کہ مسیح نے بہت سے مُردے زندہ کئے لیکن آج کون ہے جو مُردے زندہ کر کے دکھا سکتا ہے؟ پرانے قصے ہماری تسلی نہیں کر سکتے۔ ہم اس صفت پر تبھی یقین کر سکتے ہیں جب اس کا کوئی ثبوت اس دنیا میں بھی دیکھ لیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے مسیح موعود علیہ السّلام نے اس صفت کے متعلق عملی شہادت بہم پہونچا کر ہمارے ایمانوں کو تازہ کیا ہے۔

پیشتر اس کے کہ میں اس قسم کے نشانوں کی کوئی مثال بتاؤں پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن کا اس دنیا میں اپنے پورے جلال سے ظاہر ہونا بعض دوسری صفات کے مخالف پڑتا ہے۔ پس ایسی صفات کو اللہ تعالیٰ اس رنگ میں ظاہر نہیں کرتا جس رنگ میں کہ وہ مرنیکے بعد کی زندگی میں ظاہر ہونگی۔ مُردوں کے زندہ کرنے والی صفت بھی انہی میں سے ہے اگر فی الواقع مُردے زندہ ہو کر دنیا میں واپس آنے لگیں تو ایمان کا کوئی فائدہ ہی نہ رہے۔ کیونکہ ایمان تبھی تک نفع بخش ہے جبتک اسمیں کچھ اخفاء ہے۔ اور جب وہ مرئی چیزوں کی طرح ظاہر ہو جائے۔ تو اسکا کچھ فائدہ نہیں۔ کون ہے جو اس پر انعام دے کہ کوئی شخص سمندر کو سمندر اور سورج کو سورج سمجھتا ہے۔ جو باریک راز دریافت کرتے ہیں وہی انعامات کے بھی مستحق ہوتے ہیں۔ پس اصلی مُردے دنیا میں واپس نہیں لائے جاتے ہاں یہ مُردے زندہ کرنے کا نشان دو طرح ظاہر ہوتا ہے یا تو روحانی مُردوں کو زندہ کر کے یا پھر ایسے بیماروں کو زندہ کر کے جنکی حالت جان کندن تک پہونچ گئی ہو یا بظاہر مر گئے ہوں۔ مگر درحقیقت مرے نہ ہوں۔ جیسا کہ حضرت مسیحؑ نے اس عورت کی نسبت جس کا ذکر متی باب ۹ میں آتا ہے۔ کہا کہ:۔

"کنارے ہو کہ لڑکی مری نہیں بلکہ سوتی ہے۔ وہ اس پر ہنسے" آیت ۲۴؎

روحانی مُردے زندہ کرنیکے متعلق مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہم میں سے ہر ایک

اس کی زندہ مثال ہے۔ مگر میں دوسری قسم کے احیاء کی دو مثالیں اس جگہ بیان کرتا ہوں:۔

آپؑ کا چھوٹا لڑکا مبارک احمدؒ ایک دفعہ بیمار رہا۔ اور اس کی بیماری بہت سخت بڑھ گئی اور غش پر غش آنے لگے۔ آخر اس کی حالت موت کی سی ہو گئی۔ اور جو اوپر نگران تھے۔ انہوں نے سمجھ لیا۔ کہ وُہ بالکل مر چکا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السّلام پاس کے کمرے میں دُعا میں مشغول تھے۔ کہ کسی نے آواز دی کہ اب دعا بس کر دیں کیونکہ لڑکا فوت ہو گیا ہے آپؑ اُٹھ کر وہاں آئے جہاں وہ لڑکا تھا۔ اور آپؑ نے اس کے جسم پر ہاتھ رکھکر توجہ کی تو دو تین منٹ میں وُہ پھر سانس لینے لگ گیا۔

اسی طرح ایک دفعہ خان محمد علی خانصاحب جو نواب صاحب مالیر کوٹلہ کے ماموں ہیں۔ اور ہجرت کر کے قادیان میں ہی آ بسے ہیں۔ ان کے لڑکے میاں عبدالرحیم خانصاحب بیمار ہوئے۔ انکو ٹائیفائڈ کی بیماری تھی۔ دو ڈاکٹر اور حضرت خلیفہؓ اوّل مولوی نورالدین صاحبؓ جو دیسی طریق کے علاج کے بہت بڑے ماہر تھے۔ اور مہاراجہ صاحب جموں کے شاہی طبیب رہ چکے تھے۔ معالج تھے۔ آخر بیماری کی حالت یہانتک پہنچ گئی۔ کہ مولوی صاحب نے بھی اور دوسرے ڈاکٹروں نے بھی کہہ دیا۔ کہ اب اس مریض کی حالت بچنے والی نہیں۔ یہ چند گھنٹے کا مہمان ہے۔ علاج کی اب کچھ ضرورت نہیں۔ جب اس امر کی حضرت مسیح موعودؑ کو اطلاع ہوئی تو آپؑ نے اسی وقت اس لڑکے کیلئے دُعا کی۔ اور الہام ہوا۔ کہ اس لڑکے کی موت آ چکی ہے۔ تب آپؑ نے عرض کیا۔ کہ اے خدا اگر دعا کا وقت گذر چکا ہے۔ اور اس لڑکے کی موت آ چکی ہے۔ تو میں اس کے لئے شفاعت کرتا ہوں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ۔ کون ہے جو خدا تعالیٰ کے حضور سفارش کرے مگر اس کے حکم اور اس کی اجازت سے؟

آپؑ فرماتے ہیں کہ اس الہام پر میں نے دعا ترک کر دی۔ مگر معًا دوبارہ الہام ہوا۔ اِنَّکَ اَنْتَ الْمُجَازُ۔ ہم تجھ کو شفاعت کی اجازت دیتے ہیں۔ اس پر آپ نے شفاعت کی۔ . . . . اور اسی وقت باہر آ کر کہدیا۔ کہ یہ لڑکا بچ جائیگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے میری شفاعت سے اس کو موت سے بچا دیا ہے۔ چنانچہ وُہ فوراً ہی تندرستی کی طرف مائل

ہو گیا۔ اور کچھ دنوں میں اچھا ہو گیا۔ عبدالرحیم خانصاحب جن کے متعلق یہ معجزہ ظاہر ہوا خدا تعالےٰ کے فضل سے زندہ موجود ہیں۔ اور اس وقت انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آپکے والد اور دوسرے گواہوں میں سے بھی اکثر لوگ زندہ موجود ہیں۔ اور سب شہادت دے سکتے ہیں۔ کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے خدا تعالےٰ کی **صفتِ اِحیاء** کا مشاہدہ کیا ہے جب کہ وہ حضرت مسیح موعودؑ کے ذریعہ سے ظاہر ہوئی۔

اللہ تعالےٰ کی مشہور صفات میں سے ایک **صفتِ مالکیّت** کی بھی ہے۔ تمام مذاہب اس امر پر متفق ہیں۔ کہ وہ ذرّہ ذرّہ کا مالک ہے۔ مگر یہ کہ وہ کسطرح مالک ہے اسکا ثبوت ملنے کے بغیر ہمارے لئے بالکل ناممکن ہے کہ ہم اسکی مالکیّت پر یقین کریں کیونکہ ہم ظاہر میں تو دیکھتے ہیں کہ باقی سب مالکوں کے آثار ملکیت نظر آتے ہیں۔ مگر اللہ تعالےٰ کی مالکیت کے کوئی آثار دُنیا میں نظر نہیں آتے۔ بیشک یہ کہا جا سکتا ہے۔ اور واقع بھی یہی ہے۔ کہ خدا تعالیٰ نے ایک قانون بنایا ہے۔ اس کے ماتحت کارخانہ عالم چل رہا ہے لیکن پھر بھی اگر کوئی آدمی دنیا میں ایسا ہو سکتا ہے۔ کہ وُہ خدا کا مقرب ہو تو اسکے ہاتھ پر اس کی صفتِ مالکیت کا ظہور ہونا چاہئے۔ تا اس کے مقرب ہونیکی دلیل پیدا ہو۔ اور اس پر یقین آئے۔ کہ فی الواقع خدا دنیا کا مالک ہے۔ ورنہ موجودہ صورت میں تو اگر ایک عالم آدمی اُٹھ کر کہہ دے۔ کہ وہی سب دُنیا کا مالک ہے۔ اور جب اسے کہا جائے کہ پھر تجھ پر قوانین نیچر کیوں حکومت کرتے ہیں؟ تو وہ یہ کہدے کہ یہ میرا ازلی قانون ہے۔ کہ ایسا ہی ہو۔ تو ایسے شخص کا کوئی جواب خدا پرستوں کے پاس نہیں رہتا۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی لوگ ایسے دعوے کر دیتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو خدا کہدیتے ہیں۔ اور ان کو اس پر اس وجہ سے جرأت ہوتی ہے۔ کہ وہ جانتے ہیں۔ کہ خدا تعالےٰ کے مالک ہونیکا بھی کوئی زندہ ثبوت دُنیا میں موجود نہیں۔ اس لئے ہمارے دعوے کو کوئی ردّ نہیں کر سکتا۔ جو اعتراض وہ ہماری خدائی پر کرینگے۔ وہی دہرا کر ہم انکے خدا پر کر دینگے لیکن اگر فی الواقع خدا کی مالکیت کا کوئی ثبوت ہو۔ تو ایسے لوگوں کو ہرگز جرأت نہیں ہو سکتی۔ کہ خدا تعالےٰ کے ساتھ اس قسم کا تمسخر کریں۔ اور دُنیا کو اسطرح دھوکا دیں۔ کیونکہ اس صورت میں وہ بندے جو خدا کے مقرب ہو کر اور اس کے فضل کی چادر اُوڑھ کر آتے ہیں انکو انکے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ کہ انکے ذریعے سے خدا تعالےٰ

کی ملکیت ظاہر ہو رہی ہے۔ تم اگر خدا ہو۔ تو ان سے بڑھکر ملکیت کا ثبوت دو۔ کیونکہ یہ نائب ہیں اور تم اصل ہونیکے مدعی ہو یہ طریق تمام وساوس کے ردّ کرنیکا ایسا ہے۔ کہ اسکا جواب ایسے لوگوں سے کچھ نہیں بن سکتا۔

ہمارا دعویٰ ہے۔ کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اللہ تعالےٰ کے قرب کو حاصل کر کے اس کی صفت مالکیت کا بھی اسیطرح اظہار کیا جسطرح اور صفات کا۔ اور آپ نہ صرف اس امر پر شاہد ہوئے۔ کہ اسلام انسان کو خدا تعالیٰ سے ملا سکتا ہے۔ بلکہ دوسرے لوگوں کے لئے بھی خدا تعالےٰ پر کامل ایمان لانے کا آپ نے راستہ کھول دیا چنانچہ ایک مثال آپکے اس قسم کے نشانات میں سے یہ ہے۔ کہ جب ہندوستان میں طاعون پڑی اور اسکا سخت زور ہوا۔ تو جسطرح طاعون کے نمودار ہونے سے پہلے آپ نے خبر دی تھی۔ کہ اس ملک میں شدید طاعون (دبا) پڑیگی۔ اسی طرح آپنے اپنا ایک کشف یہ بھی لکھا۔ کہ میں نے دیکھا کہ طاعون ایک مہیب جانور کی شکل میں جس کا منہ ہاتھی سے ملتا ہے۔ چاروں طرف حملہ کرتی پھرتی ہے۔ اور جب وُہ ایک حملہ کر چکتی ہے۔ تو میرے سامنے آکر بیٹھ جاتی ہے۔ اور اسطرح بیٹھ جاتی ہے جسطرح کوئی غلام مؤدب ہو کر بیٹھتا ہے۔ اور اپنی فرمانبرداری کا اقرار کرتا ہے۔ پھر آپکو الہام ہوا "آگ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی بھی غلام ہے" یعنی طاعون نہ صرف ہماری بلکہ ہمارے غلاموں یعنے جو ہمارے ہی ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی مرضی کو ہمارے تابع کر دیتے ہیں۔ اُنکی بھی غلام ہے۔ وہ انکو کچھ نہیں کہیگی۔ اور وُہ اس سے محفوظ رہیں گے۔ پھر الہام ہوا۔ کہ اِنّی اُحَافِظُ کُلَّ مَنْ فِی الدَّارِ۔ میں تیرے گھر میں جسقدر لوگ ہیں انکو طاعون سے محفوظ رکھونگا۔

آپنے ان الہامات کو اسی وقت اخباروں اور کتابوں کے ذریعہ سے شائع کرا دیا۔ اور اپنے مخالفوں کو چیلنج دیا۔ کہ وُہ مجھے جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اور اپنے آپکو حق پر تو اپنے متعلق ایسی ہی خبر شائع کر کے دیکھیں کہ انکے گھر یا انکی ذات طاعون سے محفوظ رہیگی۔ مگر کوئی شخص مقابلہ پر نہ آیا۔

تمام لوگ جو دنیا کے حالات سے مطلع رہنے کی کوشش کرتے ہیں جانتے ہونگے کہ ہندوستان میں اٹھائیس سال سے سخت طاعون پھُوٹا ہوا ہے۔ اور ۱۹۰۲ء میں تو جبکہ یہ الہامات حضرت مسیح موعودؑ کو ہوئے تھے۔ اس کا زور نہایت ہی سخت تھا۔ اسوقت تک ستّر اسّی لاکھ آدمی طاعون

سے مرچکا ہے۔ اور ایک ایک سال میں تین تین لاکھ آدمی مرتا رہا ہے خصوصًا اس کا حملہ پنجاب پر سب سے زیادہ سخت پڑا ہے۔ اور تین چوتھائی بلکہ اس سے بھی زیادہ موتیں صرف پنجاب میں واقع ہوئی ہیں۔ ایسی سخت وبا کے ایام میں اور ایسے مبتلا علاقہ کے رہنے والے شخص کا اس قسم کا دعویٰ کیسا نازک ہے۔ اور خصوصًا جبکہ ایک شخص کے متعلق نہیں بلکہ ایک گھر کے متعلق ہو جس میں ستّر یا سو آدمی رہتا ہو۔ اور پھر ایک سال کے متعلق نہیں بلکہ ایک لمبے عرصہ تک کے لئے ہو۔ کونسا انسان ہے۔ جو اس قسم کی بات کا ذمہ لے سکے؟ اور کونسی انسانی طاقت ہے جو پھر اس ذمہ داری کو پورا کر سکے۔

پھر یہ بات بھی دیکھنے والی ہے۔ کہ قادیان ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ اور اس وجہ سے گورنمنٹ کو اس کی صفائی کا بالکل خیال نہیں۔ اسکی گلیوں کی بُری حالت کا اندازہ بھی یورپ و امریکہ کے رہنے والے نہیں کر سکتے۔ اس کی حالت ان شام کے قصبات سے ہرگز کم نہیں۔ جہاں کہ عرصۂ دراز سے طاعون اپنا گھر بنائے ہوئے ہے آپ کا گھر بھی شہر سے باہر نہیں بلکہ شہر کے اندر تھا۔ آپکے مکان کے چاروں طرف لوگوں کے مکانات تھے۔ پس خاص صفائی یا کھلی ہوا کیطرف بھی آپکے گھر کی حفاظت منسوب نہیں کیجا سکتی۔ آپ کا گھر باقی حصہ قصبہ سے نشیب میں ہے۔ اور نصف شہر کی گندی نالیاں آپکے مکان کے اردگرد سے گذرتی ہیں اور پاس ہی پچاس گز کے فاصلہ پر ایک تالاب تھا جس میں برسات کا پانی سال کے اکثر حصہ میں سڑتا رہتا تھا (میں تھا اس لئے کہتا ہوں۔ کہ اب تالاب کا بیشتر حصہ بھرتی ڈالکر پُر کر دیا گیا ہے۔ اور تالاب فاصلہ پر ہوگیا ہے) ایسے مقام اور ایسے گردوپیش میں رہنے والے شخص کا اس قدر بڑا دعوےٰ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ دعوےٰ اگر معمولی رنگ میں بھی پورا ہوتا تو یقینًا خداتعالےٰ کے **مالک** ہونیکی ایک زبردست دلیل ہوتا۔ مگر خداتعالےٰ نے اس نشان کو ایک زبردست نشان کرنیکے لئے ایسے سامان پیدا کر دیئے۔ کہ انہوں نے اس کی شان کو بہت ہی بڑھا دیا۔

اس الہام کے شائع ہونے سے پہلے قادیان میں طاعون نہ آئی تھی۔ اگر اسی طرح طاعون کا زمانہ گذر جاتا۔ تو لوگ کہہ سکتے تھے۔ کہ شاید اس علاقہ کی کوئی خصوصیت ہوگی۔ کہ وہاں طاعون کے جرم نشوونما نہ پاتے ہوں۔ اور اس امر کو دیکھکر آپنے دعویٰ کر دیا ہو۔ مگر ادھر اس

الہام کی اشاعت ہوئی ادھر خداتعالیٰ نے طاعون کو قادیان میں بھیجدیا۔ اور ایک سال نہیں دو سال نہیں متواتر چار پانچ سال قادیان پر طاعون کا حملہ ہوتا رہا۔ طاعون کے حملہ کی صورت میں بھی اگر طاعون دوسرے علاقہ میں رہتی لیکن آپکے محلہ میں نہ آتی۔ تو امر مشتبہ رہتا۔ کیونکہ پھر بھی یہ خیال ہو سکتا تھا۔ کہ شاید کوئی خاص انتظام صفائی کا کر لیا گیا ہو۔ مگر طاعون اس محلہ میں بھی آئی۔ جس میں آپؑ کا مکان تھا۔ پھر اور قریب ہوئی۔ اور آپکے مکان کے دائیں اور بائیں جو مکان تھے۔ ان میں بھی آئی۔ پہلو بہ پہلو دیوار بہ دیوار طاعون نے حملہ کیا دائیں کیا بائیں کیا۔ آگے کیا پیچھے کیا۔ مگر آپؑ کے گھر کو بالکل چھوڑ کر چلی گئی۔ اور آدمی تو الگ رہے۔ کوئی چوہا تک اسکی زد میں نہ آیا۔ گویا اس نظارہ کی مثال اس گھر کی سی تھی۔ جو چاروں طرف سے مکانوں میں گھرا ہوا ہو۔ اور ان کو آگ لگ جائے وہ تمام جل کر راکھ ہو جائیں۔ مگر وُہ مکان بیچ میں سے سلامت بچ جائے۔ اور شعلے جس وقت اسکے قریب پہنچیں خود بخود بجھ جائیں۔ اور یہ معلوم ہو۔ کہ کوئی طاقت بالا ان پر غیر مرئی چھینٹے ڈال کر انکو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ ایک سال نہیں دو سال نہیں متواتر پانچ سال تک قادیان میں طاعون پڑی۔ اور ان سالوں میں پڑی جبکہ وہ ہندوستان میں فی ہفتہ تیس تیس چالیس چالیس ہزار آدمی کو لقمۂ اجل بنا لیتی تھی۔ مگر آپکے مکان کے اردگرد گھوم کر چلی جاتی تھی کبھی اِس مکان کے کسی بسنے والے پر اس نے حملہ نہیں کیا۔ حالانکہ اس پیشگوئی کیوجہ سے آپکی جماعت کے کئی خاندان طاعون کے دنوں میں اس حفاظت سے حصہ لینے کے لئے آپکے گھر میں آکر بس جاتے تھے۔ اور اسکی آبادی اسقدر بڑھجاتی تھی۔ کہ غیر وبائی دنوں میں بھی اس قدر آبادی نقصان کا موجب ہوتی ہے۔ کجا یہ کہ وبا کے دن ہوں۔ یہ وُہ **نشان ملکیت** ہے جو آپنے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اور جس کے ذریعہ سے آپنے ہر اک شخص سے جو تعصب سے خالی ہو کر سوچے منوا لیا۔ کہ ایک **کامل الصّفات** خدا ہے۔ اور اس کا قرب بندے کو حاصل ہو سکتا ہے۔

ایک اور مثال ملکیت کی قسم کے نشان کی وُہ ہے جو خود مغربی ممالک میں ظاہر ہوئی ہے۔ امریکہ کا رہنے والا ایک شخص ڈوئی نام تھا۔ اس شخص نے دعوےٰ کیا تھا۔ کہ میں مسیح کی آمد ثانی کے لئے بطور ایلیا کے ہوں۔ اس کے دعوے کی مقبولیت اس قدر بڑھ گئی۔ کہ

کئی لاکھ آدمی اس کے ساتھ مل گیا۔ اور اس نے شکاگو کے پاس ایک الگ شہر بنایا جس کا نام اس نے زائن رکھا۔ اس میں سے اسکا خیال تھا۔ کہ نئے دین کی اشاعت ہوگی اس شخص کا یہ دعویٰ تھا۔ کہ اسکی دعا بلکہ صرف چھو دینے سے بیمار اچھے ہو جاتے ہیں۔ اور وہ لوگوں کو دواؤں کے استعمال سے روکتا تھا۔ جب اس شخص کا دعویٰ کسی قدر پھیلا۔ تو اس نے اعلان کیا۔ کہ خدا نے اسے اس امر کے لئے بھیجا ہے۔ کہ تا مسیح کے آنے سے پہلے مسلمانوں کو برباد کردے۔ جب اس کا لیکچر حضرت مسیح موعودؑ کو سنایا گیا تو آپ نے اسے چیلنج دیا کہ تجھ کو یہ دعویٰ ہے کہ تو اسلام کے برباد کرنے کے لئے کھڑا ہے۔ اور مجھے یہ دعویٰ ہے۔ کہ میں اسلام کی حمایت اور اسکو ترقی دینے کے لئے مبعوث ہوا ہوں پس چاہئے کہ مجھ سے دعا میں مقابلہ کر کے فیصلہ کرے کہ کون سچا اور کون جھوٹا ہے تا خدا کا عذاب جھوٹے کو پکڑ لے۔ اور دوسروں کے لئے حجت ہو۔

اب یہ ایک صاف بات ہے کہ اگر خدا واقع میں دُنیا کا مالک ہے، اور وُہ ایک شخص کو اس لئے نازل کرتا ہے۔ کہ تا وُہ اس کے باغ کی حفاظت کرے۔ اور ایک شخص اپنے طور پر آجاتا ہے۔ اور اس خادم سے بحث کرتا ہے کہ نہیں اس باغ کا رکھوالا تو اس نے مجھے مقرر کیا ہے۔ تو اس کی صفتِ مالکیت کا تقاضا ہونا چاہئے۔ کہ وہ اپنے بھیجے ہوئے خادم کی مدد کرے اور دُنیا کو بتائے کہ مالک کا نائب کون ہے؟ اور اس کی صفتِ مالکیّت کے ظہور کے لئے کس کو بھیجا گیا ہے؟

یہ چیلنج ڈاکٹر الگزنڈر ڈوئی کو بھیجنے کے علاوہ امریکہ اور انگلستان کے اکثر اخباروں کو بھی بھیجا گیا تھا۔ اس کا ایک فقرہ یہ تھا۔

"میں عمر میں ستّر برس کے قریب ہوں۔ اور ڈوئی جیسا کہ وہ بیان کرتا ہے پچپن برس کا ہے اور اس طرح میرے مقابلہ میں نسبتاً جوان ہے لیکن میں نے اپنی بڑی عمر کی کچھ پرواہ نہیں کی۔ کیونکہ اس مباہلہ کا فیصلہ عمروں کی حکومت سے نہیں ہوگا۔ بلکہ خدا جو زمین و آسمان کا بادشاہ اور احکم الحاکمین ہے۔ وہ اس کا فیصلہ کریگا۔ اور وُہ صرف سچے مدعی کے حق میں فیصلہ کریگا۔ .... خواہ وہ اس موت سے جو اسکا انتظار کر رہی ہے کتنا ہی بھاگنے کی کوشش کرے۔ مگر اسکا بھاگنا بھی اس کیلئے

موت سے کم نہیں۔ اور آفت اس کے زائن پر ضرور نازل ہوگی۔ کیونکہ اسے یا تو اس مقابلہ کے نتائج برداشت کرنے ہونگے۔ یا اس مقابلہ سے انکار کے نتائج بھگتنے ہونگے۔

اس مضمون کو کثرت سے امریکن اخبارات نے شائع کیا جنمیں سے تیس اخبارات کی کاپیاں ہمیں ملی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کے علاوہ اور اخبارات میں بھی اس کا ذکر ہو۔ ان میں سے بعض نے اپنی رائے بھی لکھی۔ کہ ہمارے نزدیک یہ طریق فیصلہ انصاف پر مبنی ہے اور معقول ہے۔ مؤخر الذکر اخبارات میں سے ایک سان فرانسسکو کا اخبار ارگونات بھی ہے۔ یہ چیلنج سنہ ۱۹۰۲ء کو دیا گیا تھا۔ مگر ڈاکٹر ڈوئی نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ پھر سنہ ۱۹۰۳ء میں اس چیلنج کو دُہرایا گیا۔ اور آخر امریکہ میں ہی اس کے خلاف یہ آواز اٹھائی گئی کہ وُہ جواب کیوں نہیں دیتا۔ وہ خود اپنے اخبار کے دسمبر سنہ ۱۹۰۳ء کے پرچہ میں اس امر کا یوں اقرار کرتا ہے۔

"ہندوستان میں ایک بیوقوف محمّدی مسیح ہے جو مجھے بار بار لکھتا ہے۔ کہ مسیح یسوع کی قبر کشمیر میں ہے۔ اور لوگ مجھے کہتے ہیں۔ کہ تو اس کا جواب کیوں نہیں دیتا؟ مگر کیا تم خیال کرتے ہو کہ میں ان مچھروں اور مکھیوں کا جواب دونگا اگر میں ان پر اپنا پاؤں رکھوں تو میں ان کو کچل کر مار ڈالونگا۔ میں انکو موقع دیتا ہوں۔ کہ وُہ اڑ جائیں اور زندہ رہیں۔"

مگر جیسا کہ لکھا گیا تھا۔ کہ اگر وُہ مقابلہ پر آئیگا۔ تو بہت جلد ہلاک ہوگا۔ مگر بھاگے گا۔ تو بھی وہ آفت سے نہیں بچیگا۔ اور اس کے صیحون پر جلد تر ایک آفت آئیگی۔ اور ایسا ہی ہوا۔ خدا نے اس شخص کو پکڑا۔ اور صیحون میں اس کے خلاف بغاوت ہوگئی۔ اس کی اپنی بیوی اور اس کا لڑکا اس کے مخالف ہو گئے۔ اور انہوں نے ثابت کیا۔ کہ جبکہ یہ شخص پبلک میں شراب کے خلاف لیکچر دیا کرتا تھا۔ علیحدگی میں خود شراب پیتا تھا۔ اور اور بہت سے اعتراض لوگوں نے اس پر کئے۔ اور آخر اسکو صیحون سے بے دخل کیا گیا۔ اور یا تو وہ شہزادوں کی سی زندگی بسر کرتا تھا یا کھانے پینے کو بھی محتاج ہو گیا۔ اور ایک مزدور کی سی مزدوری اسکے گذارے کے لئے مقرر ہوئی۔ آخر اس پر فالج گرا۔ اور وُہ پیر جس سے وُہ خدا کے مسیح کو مچھروں کی طرح مسلنا چاہتا تھا بے کار ہو گئے۔ اور آخر مصائب کی برداشت نہ لا کر دیوانہ ہو گیا۔ اور چند دن

میں مرگیا۔

اس کی اس طرح کی موت پر بھی بہت سے امریکن اخبارات نے نوٹ لکھے اور اس پیشگوئی کا بھی ذکر کیا جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس کے متعلق کی تھی۔ ان میں سے ایک اخبار ڈنول گزٹ، ۷ رجون ۱۹۰۷ء کے پرچہ میں لکھتا ہے:۔

"اگر احمد اور ان کے پیرو اس پیشگوئی کے جو چند ماہ ہوئے پوری ہو گئی۔ نہایت صحت کے ساتھ پورے ہونے پر فخر کریں۔ تو ان پر کوئی الزام نہیں"

اب میں سب سے آخر میں مثال کے طور پر اللہ تعالےٰ کی **صفتِ باعث** کو بیان کرتا ہوں۔ اس صفت کا مطلب یہ ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ مخلوق کی اندرونی طاقتوں کو اُبھار کر انکو ایسا نشوونما دیتا ہے۔ کہ وُہ کچھ کی کچھ ہو جاتی ہیں اور اسقدر فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ جس طرح ایک مُردے اور زندے میں فرق ہے۔ یہ صفت اس شکل میں صرف اسلام نے ہی بیان کی ہے۔ گو ایک مخلوط سا خیال اس کے متعلق تمام اقوام میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہ صفت بھی کبھی ثابت نہیں ہو سکتی اگر اس کا زندہ نمونہ ہمیں کسی انسان میں نظر نہ آوے اور نہ ہم سمجھ سکتے ہیں۔ کہ کوئی شخص خدا تعالیٰ کا کامل قرب حاصل کر چکا ہے۔ جبتک اس صفت کا ظہور اسمیں نہ ہو۔ بلکہ حق یہ ہے کہ چونکہ انبیاء دوسروں کی ہدایت کے لئے مبعُوث ہوتے ہیں۔ اس لئے اس صفت کا ظہُور سب سے زیادہ ضروری ہے۔ جبتک وہ ایک ایسی جماعت پیدا نہیں کرتے جو صفتِ باعث کے ماتحت اپنی پہلی مردنی کو ترک کر کے زندہ نہیں ہو جاتی۔ اور ایک چھوٹے حشر کا نمونہ ہم اس دُنیا میں نہیں دیکھ لیتے نہ ہمارے دلوں کو اطمینان ہو سکتا ہے۔ اور نہ انبیاء کی بعثت کی غرض پُوری ہوتی ہے۔

اسی نکتہ پر زور دینے کے لئے قرآن کریم نے انبیا کی کامیابی کا نام قرآن کریم میں بار بار قیامت اور ساعت رکھا ہے جس سے بعض لوگوں نے نادانی سے یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ شاید قرآن کریم بعث مابعد الموت کا قائل ہی نہیں۔ یہ دھوکا ویسا ہی ہے جیسے کہ بعض اور لوگوں نے یہ سمجھ چھوڑا ہے کہ جہاں ساعت کا لفظ آئے۔ اس کے معنے ضرور قیامت کے ہوتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کے ذریعہ سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ کس جگہ اس سے بعث مابعد الموت مراد ہے اور کس جگہ

نبی کا اپنی غرض میں کامیاب ہو جانا اور ایک زندہ جماعت کے پیدا کرنے میں فلاح کا منہ دیکھنا مراد ہے۔

حضرت مسیح موعودؑ نے اس صفت کا نمونہ بھی نہایت عمدگی اور کامیابی کے ساتھ دکھایا ہے۔ اور اس زبردست معیار پر جو حضرت مسیحؑ ناصری نے بیان فرمایا تھا۔ خوب کامیابی کے ساتھ آپ پورے اترے ہیں۔ حضرت مسیح فرماتے ہیں:۔

"جھوٹے نبیوں سے خبردار ہو۔ جو تمہارے پاس بھیڑوں کے بھیس میں آتے پر باطن میں پھاڑنے والے بھیڑیئے ہیں تم انہیں انکے پھلوں سے پہچانو گے کیا کانٹوں سے انگور یا اُونٹ کٹاروں سے انجیر توڑتے ہیں؟ اسی طرح ہر ایک اچھا درخت اچھا پھل لاتا اور بُرا درخت بُرے پھل لاتا ہے۔ اچھا درخت بُرے پھل نہیں لا سکتا۔ نہ بُرا درخت اچھے پھل لا سکتا ہے۔ ہر ایک درخت جو اچھا پھل نہیں لاتا کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے پس انکے پھلوں سے تم انکو پہچانو گے" متی باب ۷۔ ۱۵ تا ۲۰۔

اس معیار کے یہی معنے ہیں۔ کہ ہر اک درخت اپنے مطابق پھل لاتا ہے پس نبی وہی ہے۔ جو نبوت کا رنگ علیٰ قدرِ مراتب اپنے متبعین میں پیدا کر دے۔ اور خدا رسیدہ وہی ہے جو ہر اک کی استعداد فطری کے مطابق اس کو خدا تک پہونچا دے۔

اس معیار کے یہ معنے نہیں کہ کسی جماعت میں اخلاص اور قربانی ہو۔ تو سمجھا جائے گا۔ کہ مدعی سچا ہے۔ اور خدا رسیدہ ہے۔ کیونکہ قربانی کے صرف یہی معنے ہوتے ہیں۔ کہ متبعین کو اپنے مقتدا کی زندگی میں کوئی ایسی بات نہیں معلوم ہوئی۔ جس کی وجہ سے وہ اسے جھوٹا خیال کریں۔ اب لوگوں کا کسی کو بااخلاق یا راستباز سمجھ لینا صرف دو باتیں ثابت کر سکتا ہے۔ یا تو یہ کہ ان کو اس کے حالات سے پوری طرح واقفیت نہیں یا اگر وُہ لوگ ایسے ہیں کہ انکو اس کی زندگی کا ہر شعبہ دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ تو پھر صرف اس قدر ثابت ہوگا۔ کہ وُہ مقتدا مفتری نہیں ہے۔ بلکہ وُہ یہ خیال کرتا ہے۔ کہ وہ راستباز ہے۔ لیکن ہر شخص جو اپنے آپ کو راستباز سمجھتا ہے۔ راستباز نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے۔ کہ اس شخص کے دماغ میں کچھ نقص ہو۔ اور ہو سکتا ہے۔ کہ کسی ایسے

[illegible] جو اس جماعت میں پایا جاتا ہو جس سے وہ تعلق رکھتا تھا۔ اسکو یہ خیال ہو گیا ہو کہ میں [illegible] کی طرف سے کہتا ہوں۔ اور یہ دھوکا ان قوموں میں جو لفظی الہام کے قائل نہیں ہیں بہت آسانی سے لگ سکتا ہے کیونکہ اگر انمیں سے کوئی شخص کسی موعود کے متعلق غور کر رہا ہو کہ وہ کب آئیگا۔ اور بعض علامات مشابہتیں جو سینکڑوں آدمیوں میں پائی جاسکتی ہیں اسکو اپنے اندر معلوم ہوں۔ اور یہ خیال پیدا ہو جائے۔ کہ شاید میں ہی وہ شخص ہوں۔ تو بالکل قرین قیاس ہے بلکہ اغلب ہے۔ کہ اگر ذرا بھی اسے کسی نہ کسی سبب سے رسوخ حاصل ہے۔ تو وہ دیانتداری سے یہ خیال کر بیٹھے کہ جو مجھے خیال پیدا ہوا ہے۔ یہ الہامی ہی تھا۔ اور اس کے بعد جب وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ میں ہی وہ موعود ہوں۔ تو چونکہ لفظاً الہام کی تو ضرورت ہی نہیں راستہ بالکل کھل جاتا ہے۔ اپنے ہر خیال کو یہ شخص الہام اور خدا کا کلام سمجھ لیگا۔

پس صرف جماعت میں قربانی اور ایثار کا پیدا ہونا جو صرف نیک نیتی پر دلالت کرنے ہیں نہ کہ خدا کی طرف سے ہونے پر کافی نہیں بلکہ صفاتِ الٰہیہ کا جماعت میں پیدا ہونا ضروری ہے یعنی جس طرح وہ کامل انسان جو خدا تعالےٰ کی طرف سے آیا ہے۔ خدا تعالےٰ کی صفتِ حلم اور خلق اور احیاء اور [illegible] اور رزق اور ملک وغیرہا کا مظہر تھا۔ اسی طرح اسکی جماعت میں ایسے افراد پیدا ہو جائیں۔ جو اس کی صحبت سے ایسی ہی صفات اپنے ظرف کے مطابق حاصل کرلیں۔ اور گویا اس شخص کے ذریعہ سے مردہ روحوں کا ایک حشر ہو جائے۔ اور اسی دُنیا میں قیامت آکر قیامت کے منکروں پر ایک حجت ہو۔

حضرت مسیح موعودؑ کی جماعت اللہ تعالےٰ کے فضل سے اس صفت کو اپنے وجود سے ثابت کر رہی ہے ہم یہ نہیں کہتے۔ کہ حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کے ساتھ خدا کا جلال رخصت ہو گیا۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ السّلام نے ایک نئی رُوح دُنیا میں پیدا کر دی ہے۔ اور آپ کی جماعت میں سے ہزاروں انسان ایسے ہیں۔ جنہوں نے آپ کی زندگی سے زندگی پائی ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کا عرفان حاصل کر کے اور اس سے ایک [illegible] حاصل کر کے یقین اور وثوق کا مقام پایا ہے۔ اور پھر اس کی صفات ان کے اندر بھی پیدا ہو گئی ہیں۔ اور وہ خدا تعالےٰ کی صفات کے مظہر ہو گئے ہیں۔ بلکہ میں کہونگا۔ کہ بیشتر حصہ احمدی جماعت

کا ایسا ہے جس نے اپنے نفس میں معجزات کو دیکھا ہے۔ کسی نے کم اور کسی نے زیادہ۔ اور حضرتؑ کا فیض آپکے ساتھ ہی ختم نہیں ہو گیا بلکہ جاری ہے۔ اور جبتک خدا چاہیگا۔ اور لوگ آپکی تعلیم پر چلنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ جاری رہے گا۔ اِنْشَاءَ اللّٰہُ وَھُوَ الْبَرُّ الرَّحِیْمُ۔

مثال کے طور پر میں دو واقعات اپنی ذات کے ہی پیش کر دیتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ چار سال کا عرصہ ہوا۔ کہ مجھے ایک احمدی ڈاکٹر کی نسبت اطلاع ملی۔ کہ وہ عراق میں مارا گیا ہے۔ اس ڈاکٹر کے والدین نہایت بوڑھے تھے۔ اور چند دن پہلے ہی میرے پاس ملاقات کے لئے آئے تھے۔ گو اس کے چند ساتھیوں نے خط بھی لکھ دیئے تھے کہ فلاں جگہ عربوں نے حملہ کیا۔ اور وہ مارا گیا۔ مگر میرے دل میں اس کا اسقدر اثر ہوا۔ کہ بار بار میرے دل سے یہ خواہش اُٹھے کہ کاش وہ نہ مرا ہو۔ اور بار بار دل سے دعا نکلے۔ گو میں دل کو سمجھاؤں کہ کیا کبھی مردے بھی زندہ ہوتے ہیں۔ اب وہ کہاں سے زندہ ہو سکتا ہے۔ تمام دن میری یہی کیفیت رہی۔ اور پھر رات کو میں نے خواب میں دیکھا۔ کہ وہ ڈاکٹر زندہ ہے۔ اس خواب پر مجھے سخت تعجب ہوا لیکن خواب میں ایسی کیفیت تھی۔ کہ میں جانتا تھا۔ کہ یہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہے۔ گو میں یہ سمجھتا تھا۔ کہ جب وہ مر چکا ہے۔ تو اس کی تعبیر کچھ اَور ہوگی۔ وہ خواب اسی ڈاکٹر کے ایک رشتہ دار کو جو قادیان میں رہتا ہے۔ میرے چھوٹے بھائی نے جا کر سُنا دی۔ اور اس نے گھر خط لکھا۔ کہ اس طرح انکو خواب آئی ہے۔ اس کے چند دنوں کے بعد ڈاکٹر موصوف کے ایک رشتہ دار کا خط آیا۔ کہ اسکی تار آگئی ہے۔ کہ گھبراؤ نہیں میں زندہ ہوں۔ آخر معلوم ہوا۔ کہ اس کو عرب لوگ قید کر کے لے گئے تھے۔ چونکہ اس پارٹی کے قریبًا تمام آدمیوں کو عربوں نے قتل کر دیا تھا۔ اس لئے اس کو بھی مردہ سمجھ لیا گیا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ادھر مجھکو رؤیا میں اس کی زندگی کی خبر دی اور ادھر یہ سامان کر دیئے کہ انگریزی فوج کا ایک دستہ اس گاؤں کے قریب جا پہنچا جسمیں اسکو عربوں نے قید کر رکھا تھا۔ اور گاؤں والے ڈر کر بھاگ گئے اور ڈاکٹر کو بچ نکلنے کا موقعہ ملگیا اور خدا تعالےٰ نے اس طرح اسے دوبارہ زندگی عطا کر دی۔

دوسری مثال بالکل تازہ ہے۔ پچھلے پانچ یا چھ سالوں [illegible] جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پیشگوئی کے [illegible] اور آپ کی صداقت [illegible] کے طور پر ملک

میں پھیلائی گئی تھی کم ہونے لگی۔ اور دو تین سال پہلے تو اسمیں اس قدر کمی آگئی۔ کہ گورنمنٹ کی طرف سے امید ظاہر کیگئی۔ کہ اب طاعون شاید اگلے سال تک ملک سے بالکل ہی نکل جائے۔ مگر مجھے اسوقت رؤیا میں ایک طاعون کا مریض اور کچھ بھینسیں گلیوں میں دوڑتی ہوئی دکھائی گئیں۔ اور بھینسوں کی تعبیر خواب میں وبا ہوتی ہے۔ میں نے اسی وقت اس خواب کا اعلان کر دیا۔ اور بتایا کہ معلوم ہوتا ہے۔ پھر طاعون کی وبا سخت صورت میں ملک میں پڑنے والی ہے۔ اور میرا یہ اعلان اخبار الفضل کے ۱۴ نومبر کے پرچہ میں شائع کر دیا گیا۔ اس خواب کو شائع کئے ابھی ایک ماہ ہی گزرا تھا۔ کہ ملک میں طاعون کا حملہ شروع ہوگیا۔ اور فروری سے تو خوب زور ہوگیا۔ اور مارچ اپریل اور مئی میں ایسی شدت ہوئی۔ کہ ایک ایک ہفتہ میں آٹھ ہزار سے تیرہ ہزار تک موتیں ہوئیں۔ اور اس وقت تک ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ آدمی ہلاک ہو چکا ہے۔ حالانکہ پچھلے پانچ سالوں کی مجموعی ہلاکت بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

یہ مثالیں میں نے بطور نمونہ کے دی ہیں۔ ورنہ سینکڑوں دفعہ مجھ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے غیب کو ظاہر فرمایا ہے۔ اور اسی طرح ہزاروں احمدی ہیں۔ جن سے خدا تعالیٰ یہ معاملہ کرتا ہے۔ اور وہ معاملہ اس کی مختلف صفات کے ماتحت ہوتا ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ یہ معاملات کسبی نہیں ہوتے۔ خدا تعالیٰ الحکیم ہے۔ اور اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ اس لئے انسان کے منشاء پر ان امور کو نہیں چھوڑا کہ جب چاہے۔ انسان خدا تعالیٰ کے علم یا اسکی قدرت یا اسکی شفا یا اس کے احیاء یا خلق یا ملک یا رزق کے خزانہ کو کھول لے۔ یہ غیر معمولی سلوک اس کی خاص حکمت کے ماتحت ظاہر ہوتے ہیں۔ اور محض اس کے فضل سے ہوتے ہیں۔ ہاں وہ اپنے فضل سے اپنے بندوں کا علم اور یقین اور عرفان بڑھانے کے لئے ان کے ساتھ ایسا معاملہ کرتا رہتا ہے۔ جو ان کو دوسرے لوگوں اور دوسری قوموں سے ممتاز کر کے دکھاتا ہے اور ہم لوگ یقین کرتے ہیں۔ کہ اگر کوئی جماعت ہدایت کی طرف سچے طور پر مائل ہو تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی تسلی کے لئے اب بھی اپنی حکمت کاملہ کے ماتحت اپنی کسی صفت کا اظہار کر دیگا۔ کیونکہ وہ اپنے بندوں کی ہدایت کو محبوب رکھتا ہے۔ اور ان کی گمراہی اور اس سے دوری کو ناپسند رکھتا ہے۔

اس امر کے ثابت کر دینے کے بعد کہ اسلام خدا تعالیٰ کے متعلق کامل تعلیم دیتا ہے۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ خدا تعالیٰ سے اسی دُنیا میں ملا دیتا ہے۔ اور یقین اور وثوق کے ایسے دروازے انسان کیلئے کھول دیتا ہے۔ کہ شک اور شبہ کی اس کو گنجائش ہی نہیں رہتی اور وہ نہایت خوشی سے موت کا منتظر رہتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے۔ کہ میں نے حق پا لیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کا ایک ایک کر کے اسی دُنیا میں مشاہدہ کر لیا ہے۔ اور اب میرے لئے موت کے بعد کچھ نہیں۔ مگر خیر۔ اور بے انتہا ترقیات۔

اب میں دوسرے مقاصد کی نسبت اسلام کی تعلیم لکھتا ہوں :-

مقصدِ دوم

اخلاق

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ مقصد بھی پہلے مقصد کے تابع ہے۔ کیونکہ جس شخص کو خدا تعالیٰ کی کامل معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ بدی کے قریب بھی نہیں جاتا۔ اور جسقدر کوئی شخص بدی میں ملوث ہوتا ہے۔ اسیقدر وہ حجاب میں ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ اَلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ (نساء ع ۳) وہ لوگ جو گناہ کرتے ہیں بوجہ قلت معرفت کے یعنی گناہ کا اصل باعث معرفت کی کمی ہے۔ عقلِ انسانی بھی قرآن کریم کے اس دعویٰ کی تائید کرتی ہے۔ کوئی شخص دانا سمجھتے بوجھتے ہوئے آگ میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔ جسے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کھانے میں زہر ہے۔ وہ اُسے کبھی نہیں کھاتا۔ جسے یہ معلوم ہو جائے۔ کہ فلاں مکان کی چھت یقیناً اسوقت گر جائیگی۔ جب وہ اندر داخل ہونے لگیگا۔ وہ کبھی اس میں داخل نہیں ہوگا۔ جسے معلوم ہو۔ کہ فلاں سوراخ میں سانپ ہے۔ وہ کبھی اس میں ہاتھ نہیں ڈالیگا۔ جو جانتا ہوگا۔ کہ فلاں غار میں شیر بیٹھا ہے۔ وہ اسمیں بلا ہتھیار

کے کبھی داخل نہ ہوگا۔ پس جب لوگ آگ اور سانپوں اور شیروں اور زہروں سے اس قدر ڈرتے ہیں۔ تو کس طرح ممکن ہے۔ کہ اگر انکو خدا تعالےٰ کا کامل عرفان ہو۔ اور معلوم ہو۔ کہ سب بدیاں اور بد اخلاقیاں زہروں کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے بڑھکر۔ اور شیروں اور سانپوں کی مانند ہیں۔ بلکہ ان سے خطرناک۔ تو وُہ انکے ارتکاب پر اسقدر دلیری کرینگے۔ کہ گویا وہ ایک لذیذ طعام ہے۔ کہ جن کے کھانے پر انکی زندگی کا انحصار ہے؟

پس صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ ارتکاب بدی بوجہ جہالت اور کمی عرفان کے ہے۔ اور جو مذہب عرفان پیدا کر دیگا۔ وہ گویا اپنے ماننے والوں کے لئے اخلاق کامل کے حصول کا دروازہ بھی کھول دیگا۔ مگر چونکہ اس مضمون کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اور اکثر لوگ اس سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور چونکہ بہت سے لوگ اجمالی نکتہ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے بلکہ کسی قدر تشریح کے محتاج ہوتے ہیں۔ میں اختصار کے ساتھ اس مقصد کے متعلق جو اسلام کی تعلیم ہے۔ اس کو بھی بیان کرتا ہوں۔

میں نے ذات باری کے متعلق اسلامی تعلیم بیان کرتے ہوئے توجہ دلائی تھی۔ کہ خدا تعالےٰ کی صفات کے متعلق اجمالی بیانات میں مختلف مذاہب کا اتفاق ہمیں کوئی علمی نفع نہیں دیتا۔ جس امر کی دُنیا کو ضرورت ہے وہ اسمائے الٰہیہ کی تفصیل ہے۔ پس صرف تفصیل میں اتفاق اتفاق کہلا سکتا ہے۔ اور جبتک کسی مذہب کی تفصیلی تعلیم اجمالی تعلیم کے مطابق نہ ہو۔ یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ وُہ خدا تعالےٰ کے متعلق صحیح تعلیم دیتا ہے کیونکہ اجمالی تعلیم میں راستی پر قائم رہنے پر وُہ اس لئے مجبور ہے۔ کہ فطرتِ انسانی اس امر کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں کہ خدا تعالےٰ کی طرف کوئی نقص منسوب کیا جائے۔ مگر اس صورت میں کہ اس کو فلسفیانہ اور پیچ در پیچ تشریحات کے اندر چھپا کر پیش کیا جائے۔ پس جبتک کہ کسی مذہب کی تفصیلات ان اسماء کے مطابق نہیں ہیں۔ جو وہ خدا تعالےٰ کی طرف منسوب کرتا ہے اسوقت تک نہ اس مذہب کا حق ہے۔ کہ یہ دعویٰ کرے۔ کہ وہ ان صفات کو واقع میں تسلیم کرتا ہے جنکو وُہ اجمالاً پیش کرتا ہے۔ اور نہ اس اجمال سے کوئی دوسرا شخص یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ سب مذاہب میں اس امر میں اشتراک ہے۔ کوئی شخص پانی کا نام دودھ رکھ لے۔ تو وُہ دودھ نہیں

بن سکتا۔ جبتک کہ اسمیں دودھ کی خاصیتیں بھی نہ پائی جائیں۔ بعینہٖ اسی طرح اخلاق کا حال ہے۔ مذاہب کی اخلاقی تعلیم کا مقابلہ کرتے ہوئے ہمیں یہ نہیں دیکھنا چاہئے۔ کہ مختلف مذاہب اجمالاً اخلاق کی نسبت کیا کہتے ہیں۔ کیونکہ میں نہیں سمجھتا۔ کہ کوئی مذہب دنیا میں ایسا ہوگا کہ جو اپنے پیرؤوں کو یوں کہیگا۔ کہ تو اگر خدا کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ تو جھوٹ بول اور چوری کر اور ظلم کر اور لوگوں کا مال چھین۔ اور جب کوئی شخص تیرے پاس امانت رکھے تو کبھی واپس نہ کیجیو۔ اور فحش اور بدگوئی کی عادت ڈال۔ اور جھگڑے اور فساد اور اختلاف کا اپنے آپکو خوگر بنا۔ اور نہ میں خیال کرتا ہوں۔ کہ کوئی مذہب ایسا ہوگا۔ جو یہ کہیگا کہ تو سچ نہ بول اور نرمی نہ کر اور محبت سے کام نہ لے۔ اور اصلاح سے نفرت کر اور امانت نہ رکھ اور شرافت کو اپنے پاس نہ آنے دے اور وقار اور سکینت سے دُور بھاگ اور شکر اور احسان کا مادہ اپنے دل میں پیدا نہ ہونے دے۔

جو مذہب بھی دُنیا میں قبولیت حاصل کرنیکی خواہش رکھتا ہے۔ اور اپنے ہم چشموں میں اعزاز حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسے یقیناً ان تمام اخلاق کے متعلق وہی تعلیم دینی پڑیگی جو سب مذاہب میں مشترک ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کریگا۔ تو فطرتِ انسانی اسکا مقابلہ کریگی۔ اور چند دن میں وہ دُنیا کے پردہ سے اٹھا دیا جائیگا۔ پس اس قسم کی تعلیم اگر کسی مذہب کیطرف سے پیش ہو۔ تو اس کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ تعلیم سب مذاہب میں مشترک ہے اور کسی مذہب کو اس پر فخر کرنیکا حق نہیں کہ وُہ اسمیں دوسرے مذاہب سے اشتراک رکھتا ہے۔ اور نہ اس اشتراک سے ہم علمی طور پر کوئی فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ اشتراک بوجہ مجبوری کے ہے نہ کہ کسی سچی کوشش اور محنت کے نتیجہ میں۔ مجھے بعض مذاہب کے پیرؤوں پر جب وہ اپنے مذہب کی اخلاقی تعلیموں کو ایک جگہ جمع کرکے لوگوں میں پھیلاتے اور اس پر فخر کرتے ہیں اور انکو اپنے مذہب کی سچائی کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ نہایت ہی تعجب ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ واقع یہ ہے۔ کہ ان کو ان تعلیموں میں کوئی امتیاز حاصل نہیں۔ تمام مذاہب خواہ وُہ کیسے ہی پرانے ہوں اور خواہ کیسے ہی غیر تعلیم یافتہ علاقوں میں اور زمانوں میں انہوں نے نشوونما پایا ہو۔ ان مسائل میں ان سے اشتراک رکھتے ہیں۔ بلکہ حق یہ ہے۔ کہ جو قومیں مذہب کو سمجھ بھی نہیں سکتیں اور تعلیم سے بالکل کوری ہیں۔ اور وحشیوں میں گنی جاتی ہیں۔ اگر ان کا عمل نظر انداز نہ کر دیا جائے اور

آرام سے بٹھاکر اور آہستگی سے ان سے اخلاق کے متعلق پوچھا جائے۔ تا وہ گھبرا نہ جائیں۔ تو وہ بھی اخلاق کے متعلق وہی امور بتائیں گی۔ جو متمدن مذاہب پیش کرتے ہیں۔ پس اس امر پر اپنے مذاہب کی سچائی کی بنیاد رکھنا جو مذاہب علیہ تو الگ رہے وحشی اقوام میں بھی مشترک ہے بالکل غیر معقول بات ہے۔ اخلاقی تعلیم کا مقابلہ کرنے کے لئے جن امور کو مدنظر رکھنا ضروری ہے وہ اخلاق کی تفاصیل۔ اخلاق کے اسباب۔ اخلاق کے حصول کے ذرائع۔ بدیوں سے بچنے کے ذرائع۔ اور اس قسم کے اور امور ہیں۔

اس کے بعد میں اس امر کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ کہ اخلاق کی تعریف سمجھنے میں لوگوں کو بہت کچھ دھوکا لگا ہوا ہے۔ اور اس کی وجہ سے بھی صحیح موازنہ اخلاقی تعلیم کا نہیں ہو سکتا۔ عام طور پر لوگوں میں یہ احساس ہے کہ محبت اور عفو اور دلیری وغیرہ اچھے اخلاق ہیں۔ اور غضب اور نفرت اور سختی اور خوف وغیرہ بُرے اخلاق ہیں۔ حالانکہ یہ بات نہیں۔ یہ تمام امور طبعی ہیں اس لئے ان کو اچھا یا بُرا کہنا درست نہیں نہ محبت کوئی خلق ہے نہ عفو کوئی خلق ہے نہ دلیری کوئی خلق ہے۔ نہ سختی نہ خوف نہ نفرت کوئی خلق ہیں۔ یہ سب انسان کے طبعی تقاضے ہیں۔ بلکہ حیوان کے طبعی تقاضے ہیں۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سب تقاضے جانوروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ جانور بھی محبت کرتے ہیں۔ عفو کرتے ہیں۔ دلیری دکھاتے ہیں۔ سختی کرتے ہیں۔ خوف کھاتے ہیں۔ نفرت کرتے ہیں۔ مگر کوئی شخص نہیں جو یہ کہے۔ کہ یہ گائے بہت اعلےٰ اخلاق کی ہے۔ یا یہ بکری بہت ہی اچھے اخلاق رکھتی ہے۔ یا یہ گھوڑا بہت ہی وسیع الاخلاق ہے۔ جانوروں کی تعریف کرتے ہوئے ہم انہی امور کو جو انسان میں پائے جائیں۔ تو ہم انہیں اخلاق فاضلہ قرار دیتے ہیں انکی طبعی عادات قرار دیتے ہیں۔ پس غور کا مقام ہے۔ کہ یہ فرق کیوں ہے؟ جو باتیں انسان میں اخلاق فاضلہ ہیں کیوں وہی حیوانوں میں اخلاق فاضلہ نہیں کہلاتیں؟ اس کی وجہ صاف ہے۔ کہ ہم فطرتاً جانتے ہیں۔ کہ ان طبعی امور کا نام اخلاق نہیں ہے۔ بلکہ اخلاق کچھ اور شے ہیں۔ اس وجہ سے ہم انسانوں کو بااخلاق کہتے ہیں۔ اور جانوروں کو نہیں۔

اب یہ سوال ہے۔ کہ وہ کونسا فرق ہے۔ جس کی وجہ سے ایک انسان میں جب وہ امور پائے جائیں تو اخلاق فاضلہ کہلاتے ہیں۔ اور جانوروں میں پائے جائیں۔ تو اخلاق فاضلہ نہیں

بلکہ طبعی تقاضے کہلاتے ہیں؟

سو یاد رکھنا چاہئے۔ کہ طبعی تقاضے جب عقل اور مصلحت کے ماتحت آئیں تب ان کو اخلاق کہتے ہیں ورنہ نہیں۔ اور چونکہ انسان سے امید کیجاتی ہے۔ کہ اسکے تمام کام عقل اور مصلحت کے ماتحت ہونگے۔ کیونکہ یہی خاصیتیں اس کو دوسرے حیوانوں سے ممتاز کرنیوالی ہیں۔ اس لئے جب انسان ان تقاضوں کو استعمال کرتا ہے۔ تو بطور حسن ظنی اس کو اخلاق کہا جاتا ہے۔ ورنہ بسا اوقات ہو سکتا ہے۔ کہ ایک انسان کا فعل بھی طبعی تقاضے کے ماتحت ہو اور اس وجہ سے اخلاق میں شامل نہ ہو۔ اور یہ امر کہ لوگوں میں مشہور اخلاق طبعی تقاضے ہیں۔ اس بات سے بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ ایسے نرم ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے کوئی کچھ کرے وہ بالکل کچھ نہیں بولتے۔ اور بعض لوگ بالطبع ایسے ہوتے ہیں۔ کہ ہر اک امر جس کا ارادہ کرلیں۔ اس سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ اب ان دو شخصوں کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ وہ نہایت ہی اعلیٰ اخلاق کے ہیں۔ کیونکہ ان دونوں سے یہ فعل کسی ارادے کے ماتحت سرزد نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک شخص مثلاً جس کی زبان نہیں۔ وہ کسی کو گالی نہیں دیتا۔ یا مثلاً جس شخص کے ہاتھ نہیں وہ کسی کو مارتا نہیں۔ تو اس کو نہایت اعلےٰ اخلاق کا آدمی نہیں کہا جائیگا۔ غرض اخلاق کی تعریف یہ ہے کہ طبعی تقاضوں کو برمحل استعمال کیا جائے نہ یہ کہ طبعی تقاضوں کو استعمال کیا جائے۔

پس جب اخلاق کی تعریف ہمیں معلوم ہو گئی تو ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ کہ جو مذہب ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے۔ کہ تم نرمی کرو یا یہ کہ دلیری کرو یا عفو کرو یا یہ کہ محبت کرو وہ ہمیں اخلاق نہیں سکھاتا بلکہ وہی باتیں سکھاتا ہے۔ جو ہماری طبیعت میں پیدائش سے موجود ہیں۔ کیا جانور نرمی نہیں کرتے؟ کیا وہ دلیری نہیں دکھاتے۔ کیا وہ عفو سے کام نہیں لیتے؟ کیا وہ محبت نہیں کرتے؟ کیا وہ ہمدردی نہیں کرتے۔ ہم نے تو بارہا دیکھا ہے۔ کہ ایک زخمی جانور کے پاس دوسرا جانور آبیٹھتا ہے۔ اور اس کو ایسے عجیب انداز سے دیکھتا ہے کہ صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس سے ہمدردی کا اظہار کر رہا ہے۔ اور پھر بعض دفعہ اسے محبت

سے چاٹنے لگتا ہے پس اس قسم کی تعلیم ایسی ہی ہے۔ جیسے کسی مذہب کا یہ تعلیم دینا کہ اے لوگو کھانا کھایا کرو پانی پیا کرو۔ نیند آئے تو سو جایا کرو۔ ان طبعی تقاضوں کے پورا کرنے کیلئے کوئی شخص کسی مذہب کا محتاج نہیں ہے۔ ان تقاضوں کو اسکی فطرت خود پورا کرواتی ہے اور جو مذہب اس میں دخل دیتا ہے۔ وہ گویا اپنی کمزوری کا اظہار کرتا ہے کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اخلاق کی حقیقت سے واقف نہیں۔

کیا کوئی شخص کوئی ایسا ملک بتا سکتا ہے۔ جہاں لوگ محبت نہ کرتے ہوں یا ہمدردی کا مادہ نہ رکھتے ہوں۔ یا عفو کا انمیں رواج نہ ہو۔ یا غربا کو کچھ نہ دیتے ہوں؟ یا کوئی شخص ایسا بھی دنیا میں ہے۔ کہ جو ان صفات کا اظہار نہ کرتا ہو۔ اور ان سے خالی ہو؟ اگر نہیں تو مذہب کو اس میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے؟

اور اگر نرمی کرو عفو کرو۔ دلیری کرو سے مذہب کی یہ مراد ہو۔ کہ سختی نہ کرو۔ سزا نہ دو۔ خوف کا اظہار کسی صورت میں نہ کرو۔ تو بیشک یہ ایک نئی بات ہوگی۔ مگر یہ امر بھی فطرت کے مخالف ہوگا۔ فطرت نے یہ باتیں انسان کے اندر رکھی ہیں اور انکو کسی صورت میں چھڑوایا نہیں جا سکتا اور نہ انکو چھوڑنا انسان کو نفع دے سکتا ہے۔ کیونکہ جو باتیں فطرت میں پائی جاتی ہیں۔ وہ ہمیشہ انسان کے لئے کارآمد ہوتی ہیں انکو چھڑوانا اس کی اخلاقی حالت کو گرا دیتا ہے نہ کہ اس میں خوبی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ نرمی ہی کرو سختی نہ کرو۔ اسکے یہ معنے ہونگے کہ طالب علم کو استاد کبھی نہ ڈانٹے۔ ماں باپ بچوں کو کبھی تنبیہ نہ کریں۔ حکومت اپنے باغیوں کا کبھی مقابلہ نہ کرے۔ اور خوف نہ کھاؤ کے یہ معنے ہونگے۔ کہ خواہ غلط طریق پر چلے جا رہے ہو۔ اس سے پیچھے نہ ہٹو۔ اور انجام سے نہ ڈرو۔ اور کسی نقصان کی خواہ دین یا مذہب کا ہی کیوں نہ ہو۔ پرواہ نہ کرو۔ مگر کوئی عقلمند نہیں کہہ سکتا کہ یہ اخلاق فاضلہ ہیں۔

غرض کہ اخلاق یہ ہیں۔ کہ طبعی حالتوں کو انکے محل اور وقوع پر استعمال کیا جائے۔ اور صرف طبعی حالتوں پر زور دینا عبث فعل ہے۔ اور بعض طبعی حالتوں سے روکنا فطرت کے خلاف اور فساد اور خرابی پیدا کرنیکا موجب ہے۔ پس وہی مذہب اخلاق کی حقیقت کو سمجھتا ہے اور وہی مذہب اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ جو اس حقیقت کے ماتحت اپنے احکام کو رکھتا ہے۔ نہ وہ جو صرف

طبعی حالتوں کو دہراتا جاتا ہے۔ اور جہانتک میرا علم جاتا ہے۔ صرف اسلام ہی ہے۔ کہ جس نے اس حقیقت کو سمجھا اور اخلاق کو انکی اصلی شکل میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (شوریٰ ع ۴) اور بدی کا بدلہ اتنا ہی ہے۔ جتنا کہ جرم تھا۔ پھر جب کوئی کسی کو نقصان پہونچائے اور وہ اس کے گناہ کو معاف کردے اس طرح کہ اس سے اصلاح پیدا ہوتی ہو۔ اسکا نتیجہ فساد نہ ہو۔ تو ایسے شخص کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی جو جرم سے زیادہ سزا دے یا باوجود اس کے کہ عقلاً معلوم ہوتا ہو کہ مجرم کو سزا دی گئی۔ تو اس کے اخلاق اور بھی بگڑ جائیں گے۔ اور وہ اور بھی نیکی سے محروم ہو جائے گا۔ محض دکھ دینے کے لئے اس کو سزا دیدے۔ یا یہ کہ معلوم ہوتا ہو۔ کہ اس شخص کو اگر معاف کیا تو گناہ پر اور بھی دلیر ہو جائیگا اور لوگوں کو نقصان پہونچائیگا معاف کردے۔ تو ایسا شخص ظالم ہوگا۔ اور خدا اس کے اس فعل کو پسند نہیں کرے گا۔

اب دیکھو کہ اسلام نے کس طرح اخلاق کی حقیقت کو پیش کیا ہے۔ پہلے بتایا ہے۔ کہ جرم کی اسی قدر سزا دینا اصل حکم ہے۔ گویہ ایک طبعی تقاضا ہے کہ جس سے نقصان پہونچے۔ اس کو اسی قدر نقصان پہنچایا جائے۔ مگر فرمایا کہ انسان جو با اخلاق بننا چاہتا ہے انکو اس بات پر غور کرنا ہوگا۔ کہ آیا سزا سے مجرم کی اصلاح ہوتی ہے یا عفو سے۔ پھر اگر عفو سے اصلاح کا احتمال ہو تو چاہئے کہ عفو سے کام لے اور انتقام نہ لے۔ اور اگر سزا سے اصلاح ہوتی ہو۔ تو محض اپنے دل کی کمزوری کی وجہ سے اسے معاف نہ کردے۔ کیونکہ اس طرح وہ شخص اصلاح سے محروم رہ جائیگا اور یہ رحم نہیں ہوگا۔ بلکہ ظلم ہوگا۔ اور جو شخص باوجود جاننے کے کہ سزا سے یا عفو سے زید کی اصلاح ہوتی ہے اس کے خلاف کام کرے گا۔ تو وہ خدا تعالےٰ کے نزدیک ظالم ہوگا خواہ اس نے معاف ہی کیوں نہ کیا ہو۔ کیونکہ یہ معافی معافی نہیں بلکہ اپنے ایک بھائی کے اخلاق کو دیدہ دانستہ تباہ کرنا ہے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس مضمون کو اور الفاظ میں ادا کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں اَلْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ یعنی انسانی اعمال تو وہ ہیں۔ جو ارادے اور نیت کے ماتحت کئے جاویں۔ یعنی جو کام محض طبعی جوش کے ماتحت کیا جاتا ہے۔ وہ ہرگز انسانی عمل نہیں کہلا سکتا

بلکہ وہ تو ایک حیوانی جذبہ ہوگا۔ اگر گھوڑا یا گدھا ان حالات میں ہوتا۔ تو وہ بھی اسی طرح کرتا۔ پس جتبک فکر اور غور کے بعد کام کے تمام پہلوؤں کو دیکھکر کوئی رائے نہ قائم کی جائے اور اس کے مطابق عمل نہ کیا جائے وہ خلق یعنے انسانی فعل نہیں کہلا سکتا۔

مذکورہ بالا بیان سے اچھی طرح معلوم ہوسکتا ہے۔ کہ اسلام نے اخلاق کی حقیقت کو سمجھا ہے اور اس کے مطابق تعلیم دی ہے۔ پس وہی مذہب اخلاقی تعلیم میں اس کے مقابلہ پر آسکتا ہے۔ جو پہلے یہ ثابت کرے کہ اس نے بھی اخلاق کو سمجھا ہے۔ اور اس کے مطابق تعلیم دی ہے۔ ورنہ طبعی تقاضوں کا ذکر کر کے ان کا نام اخلاقی تعلیم رکھنا ظلم اور زبردستی ہے۔

یہ بیان کرنیکے بعد کہ اسلام کے نزدیک اچھے اخلاق کے معنے یہ ہیں۔ کہ انسان طبعی تقاضوں کو عقل اور مصلحت کے ماتحت استعمال کرے۔ اور بُرے اخلاق کے یہ معنے ہیں۔ کہ بلا سوچے سمجھے بے محل اور بے موقع طبعی تقاضوں کو استعمال کرے۔ میں چند احکام کے متعلق بطور مثال اسلامی تعلیم پیش کرتا ہوں جس سے معلوم ہوگا۔ کہ کس طرح ہر ایک طبعی تقاضے کو اسلام نے حد بندی کے نیچے رکھا ہے اور اس سے بہترین نتائج پیدا کئے ہیں۔

یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام نے اخلاق کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی **اخلاق قلب** اور **اخلاق جوارح**۔ اور اس طرح اخلاق کے معیار کو بہت بلند کر دیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (انعام ع ۱۹) تم بدیوں کے قریب بھی نہ جاؤ۔ نہ ان بدیوں کے جو لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں یا ہوسکتی ہیں۔ اور نہ انکے جو بالکل مخفی ہیں اور لوگوں کی نظروں میں آہی نہیں سکتیں یعنی جن کا مرتکب دل ہوتا ہے۔ انکے معلوم کرنے کا کوئی ظاہری سامان لوگوں کے پاس نہیں سوائے اسکے کہ کرنیوالا خود ہی بتائے۔

اسی طرح فرماتا ہے۔ وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ (بقرہ ع ۴۰) اگر تم ظاہر کرو جو تمہارے دلوں میں ہے یعنی اسکے مطابق عمل کرو۔ تو بھی اور اگر تم اس کو جو تمہارے دلوں میں ہے چھپاؤ یعنی صرف دل کے خیالات تک ہی محدود رکھو جوارح اس کے مطابق کوئی عمل نہ کریں۔ تو بھی اللہ تعالےٰ اس کے متعلق تم سے سوال کریگا یعنی دریافت کریگا کہ تم نے کیوں دل میں بدی کو جگہ دی یا بدی پر عمل کیا؟

اعمالِ انسانی کو ظاہر و باطن کی دو قسموں میں تقسیم کرنے کے بعد اسلام نے ان کو پھر دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی انمیں سے بعض کو اچھا قرار دیا ہے اور بعض کو بُرا۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (ہود ع ۱۰) خلق دو قسم کے ہیں۔ ایک اچھے اور ایک بُرے۔ اور اچھے خلق بُرے خلقوں پر غالب آجاتے ہیں۔ یعنی جو شخص اچھے اخلاق کو اختیار کرتا ہے وہ آہستہ آہستہ بُرے اخلاق پر غالب آجاتا ہے۔ پھر اچھے اور بُرے خلقوں کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے یعنی وُہ خلق جنکا اثر صرف اسکی ذات پر پڑتا ہے۔ اور ایک وُہ جنکا اثر دوسرے کی ذات پر ڈالنے کا ارادہ کیا جاتا ہے یا دوسرے کی ذات پر اُنکا اثر ڈال دیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تقسیموں سے آپ لوگوں نے اچھی طرح معلوم کر لیا ہوگا۔ کہ اسلام نے اخلاق کو دوسرے مذاہب کی نسبت وسیع کر دیا ہے۔ یعنی اخلاق کا دائرہ صرف دوسروں تک محدود نہیں رکھا بلکہ خود انسان کے نفس کو بھی اس کے اندر شامل رکھا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم صاف طور پر اس مسئلہ کیطرف اِن الفاظ میں اشارہ فرماتا ہے کہ يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ (مائدہ ع ۱۴) اپنی جانوں کی خبر رکھو اور ان کے رُوحانی حقوق ادا کرو۔ حتیٰ کہ اگر کسی شخص کی نجات اس طرح ممکن سمجھی جاتی ہو کہ تم اپنے آپ کو گناہ میں ڈال لو تو ہرگز ایسا نہ کرو۔ کیونکہ اگر کوئی شخص تمہاری ہدایت پر قائم رہنے اور نیکی کے اختیار کرنے پر گمراہ ہوتا ہو تو اللہ تعالےٰ تم پر اسوجہ سے ناراض نہیں ہوگا اور یہ ہرگز نہیں کہیگا کہ تم نے کیوں بدی کو اختیار کر کے اس شخص کو گناہ سے نہ بچا لیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وَلِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقٌّ تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے۔ یعنی صرف دوسرے لوگوں کا خیال ہی ضروری نہیں بلکہ اپنے نفس سے باطنی اور ظاہری نیکی کرنی یعنی اس کی رُوحانی اور جسمانی ربوبیت کا خیال رکھنا بھی تیرے لئے ضروری ہے۔

اس تعلیم اسلام کے ماتحت جو شخص ظاہری تکبر کرتا ہے اُسی کو بد اخلاق نہیں کہا جائیگا بلکہ جو شخص ظاہری تواضع اور انکسار کا طریق برتتا ہے لیکن اپنے دل کے مخفی کونوں میں تکبر کا خیال چُھپائے ہوئے ہے وہ بھی اسلام کے نزدیک بد اخلاق ہوگا۔ کیونکہ گو اُس نے

دوسرے شخص کو دُکھ نہیں دیا مگر اپنے نفس کو اُسنے بگاڑ دیا اور ناپاک کیا۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس فرق کو مفصلہ ذیل آیت میں بیان فرمایا ہے۔ وَلَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيْرًا ط (فرقان ع ۳) ان لوگوں نے اپنے دل میں بھی تکبر کیا اور ظاہر میں بھی لوگوں پر اپنی بڑائی کو ظاہر کیا۔ اسیطرح اگر کوئی شخص اپنے دلمیں کسی کی نسبت بدخیال رکھتا ہے تو اسکو بھی اسلام ایک بداخلاقی قرار دیگا خواہ وہ اس خیال کو ظاہر کرے یا نہ کرے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (حجرات ع ۲) بعض دلی گمان بھی گناہ ہوتا ہے۔ یعنی جب وہ بدظنی پر مبنی ہو۔ اسی طرح ظلم و فساد۔ خیانت وغیرہ کے خیالات یہ سب بداخلاقیاں ہیں۔ اور ایسے شخص کو جو اُن کا مرتکب ہے گو جرأت کی کمی اور سامان کے میسر نہ آنیکے سبب سے ظاہر میں ان کے مطابق عمل نہیں کرسکتا وہ اسلام کیمطابق بدخلق ہے۔ اور ہرگز اس کے ظاہر عمل کی بناء پر اسے نیک اخلاق والا نہیں سمجھا جائے گا۔ اسی طرح جو شخص دل میں لوگوں کے متعلق نیک خیالات رکھتا ہے انکی بھلائی چاہتا ہے اور انکو فائدہ پہنچانا چاہتا ہے اگر وجہ سامان کی کمی یا موقع کے میسر نہ آنیکے ان خیالات کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا تو نیک اخلاق والا سمجھا جائے گا۔

مگر اس قاعدہ میں ایک استثناء ہے اور وہ یہ کہ جس شخص کے دل میں بداخلاقی کے خیالات آتے ہیں۔ مثلاً اپنے بھائیوں کی نسبت بدظنی کا خیال پیدا ہوتا ہے یا تکبر کا یا حسد کا یا نفرت کا لیکن یہ شخص اس خیال کو دبا لیتا ہے تو یہ بداخلاقی نہیں سمجھی جائیگی۔ کیونکہ ایسا شخص درحقیقت بداخلاقی کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور تعریف کا مستحق ہے۔ اسی طرح جس شخص کے دل میں ایک آنی خیال نیکی کا آئے یا آنی طور پر حسن سلوک کیطرف اسکی طبیعت مائل ہو لیکن وہ اسکو بڑھنے نہ دے تو ایسا شخص بھی نیک اخلاق والا نہیں سمجھا جائیگا۔ کیونکہ جیسا کہ ثابت کیا جاچکا ہے اخلاق وہ ہیں جو ارادے کا نتیجہ ہوں۔ لیکن مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں اچھے یا بُرے خیالات ارادہ کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ بیرونی اثرات کے نتیجہ میں بلا ارادے کے پیدا ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم اس نکتہ کو ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے۔ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (بقرہ ع ۲۸) لیکن اللہ تعالیٰ

تم کو صرف ان خیالات پر پکڑتا ہے جو ارادے اور فکر کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں نہ ان پر جو اچانک پیدا ہوجاتے ہیں اور تم ان کو فوراً دل سے نکال دیتے ہو۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس کی تشریح یوں فرماتے ہیں کہ بدخیال اچانک پیدا ہوجانے پر جو شخص اس خیال کو نکال دیتا ہے اور اسپر عمل نہیں کرتا ایسا شخص نیکی کا کام کرتا ہے اور اجر کا مستحق ہے۔ آپ فرماتے ہیں وَاِنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً (بخاری) اور اگر کسی شخص کے دل میں بُرا خیال پیدا ہُوا ہو اور وُہ اس کو دبا لے اور اس کے مطابق عمل نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے حق میں ایک پوری نیکی لکھے گا۔ یعنی بدخیالات کے دبانے کیوجہ سے اسکو نیک بدلہ ملے گا۔

اس قسم کا امتیاز اللہ تعالیٰ نے ظاہری اعمال میں بھی مدنظر رکھا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ۔ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ط (نجم ع ۲) اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کو اچھے بدلے دے گا جو کہ تمام بڑی بدیوں اور چھوٹی بدیوں سے بچتے ہیں گو ایسا ہوتا ہو کہ وہ کسی آنی جوش میں کسی گناہ کی طرف مائل ہوجاتے ہوں مگر فوراً ہی سنبھل کر اپنے قدم پیچھے کی طرف ہٹا لیتے ہوں۔ مطلب یہ کہ آنی یا فوری جوش کے ماتحت یا غفلت سے اگر کوئی شخص ٹھوکر کھاتا ہے۔ لیکن جونہی کہ اسکا نفس اس امر کو محسوس کرتا ہے اور وہ سمجھ لیتا ہے کہ میں فلاں کام کرنے لگا ہوں تو جھٹ اس سے رک جاتا ہے اور اپنے نفس کو سلامتی کے کنارے کیطرف کھینچ لاتا ہے تو وہ بداخلاق نہیں سمجھا جائیگا بلکہ اس کا یہ فعل مستحسن ہوگا۔ اور وہ شخص اس سپاہی کیطرح ہوگا جو اپنے ملک کیلئے لڑ رہا ہے مگر ابھی فتح کا منہ اس نے نہیں دیکھا۔

اخلاق کے متعلق عملی طور پر اسلام کی تعلیم بتانے کے بعد میں چند اخلاق بطور مثال بیان کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ مضمون اسقدر وسیع ہے کہ اگر اسے بالاستیعاب بیان کیا جائے۔ تو بہت ہی لمبا وقت چاہتا ہے اور اپنے اس بیان میں دوسری ترتیبوں کو نظر انداز کرکے میں صرف اس امر کو مدنظر رکھونگا جو اخلاق کی تعریف میں میں نے بیان کیا تھا یعنی اخلاق طبعی تقاضوں کے برمحل اور مناسب موقع پر استعمال کا نام ہے۔ اور گو اس وجہ سے مجھے

دوسری ترتیبوں کو نظر انداز کرنا پڑیگا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ تقسیم زیادہ مؤثر اور مفید ہوگی۔

سب سے پہلے میں انسان کے طبعی تقاضوں میں سے **رأفت** اور **نقم** کو لیتا ہوں۔

انسان کے اندر اور جانوروں کے اندر بھی یہ مادہ پایا جاتا ہے کہ وہ عام طور پر دوسرے کو تکلیف پہنچانے سے احتراز کرتے ہیں۔ اور دوسروں کی تکلیف انکے قلب پر ایک عجیب اثر پیدا کر دیتی ہے جس کی وجہ سے وہ اسکی تکلیف کو خود محسوس کرنے لگ جاتے ہیں۔ ایک مریض بازار میں پڑا نظر آتا ہے تو قریباً تمام افراد کے دل میں اس کی نسبت ایک کشش اور درد محسوس ہونے لگتا ہے سوائے اُن لوگوں کے جنکو کوئی سخت شغل اپنی طرف مشغول کئے ہوئے ہو یا جنکو اس شخص سے کوئی تکلیف پہنچی ہوئی ہو مؤخر الذکر حالت میں دیکھا گیا ہے کہ بعض دفعہ ایسا شخص اس مصیبت زدہ کی حالت پر خوش ہوتا ہے اور یہ حالت نقم کی کہلاتی ہے۔ یہ حالت بھی ایک الگ جذبہ ہے اور ایسے وقت میں ظاہر ہوتا ہے جب کسی کو کسی سے کوئی تکلیف پہنچے۔ اور اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اسوقت انسان کا دل چاہتا ہے کہ میں اس تکلیف پہنچانیوالے کو ایذا پہنچاؤں۔ اس جذبہ کے غالب آجانے کی وجہ سے رأفت کا جذبہ دب جاتا ہے اور بجائے اس کے کہ یہ شخص یہ خیال کرے کہ میرے ایذا دینے سے اسے تکلیف ہوگی اور اسکو سوچ کر اسکے دل کو تکلیف محسوس ہو اور دوسرے کی نسبت رأفت محسوس ہو یہ اس خیال میں کہ دُوسرے کو تکلیف ہو بعض دفعہ لذّت محسوس کرنے لگتا ہے۔

یہ صورت نقم کی جبتک کسی قانون کے ماتحت نہیں آتی کئی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے کبھی تو جسے تکلیف پہنچی ہوتی ہے وہ اس شخص کو سزا دینے پر جس سے اسے تکلیف پہنچی ہے قادر ہوتا ہے۔ یا سمجھتا ہے کہ میں قادر ہوں۔ اُسوقت تو وہ اُسے کسی قسم کی تکلیف پہنچاتا ہے یا پہنچانی چاہتا ہے جس سے اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ تکلیف دینے والے کے دل کو بھی اسیطرح صدمہ پہنچے جس طرح کہ مجھے پہنچا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جس نے تکلیف دی تھی وہ زیادہ طاقتور ہوتا ہے یا اس کے عزیز رشتہ دار زیادہ طاقتور ہوتے ہیں یا مصیبت زدہ شخص سمجھتا ہے کہ حقیقی تکلیف پہنچانے کا اثر لوگوں پر اچھا نہیں پڑیگا وہ اُسے بُرا سمجھیں گے یا اور کوئی وجہ ایسی پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ اسکو حقیقی ضرر نہیں پہنچا سکتا یا نہیں پہنچانا چاہتا۔ تو یہ

اسوقت اپنی زبان سے اسکے خلاف بدکلامی یا عیب چینی کا حربہ استعمال کرتا ہے۔ لیکن بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جس شخص سے اسکی مخالفت ہے وہ ایسا طاقتور ہے کہ زبان سے بھی اسکے خلاف کچھ نہیں کہنا چاہتا تو یہ اس سے کلام اور ملاقات ترک کر دیتا ہے۔ اور بعض دفعہ اسقدر سزا کی جرأت بھی نہیں رکھتا تو دل میں اس کی نسبت کینہ رکھتا اور اس کی تکلیف پر خوش ہوتا اور اس کی کامیابیوں پر ناراض ہوتا ہے۔

پس نقم جو طبعی جذبہ ہے اس سے کئی اقسام کے افعال کراتا ہے۔ ان افعال پر عقل کو قابو دیدینا اور آزادی سے اپنا کام کرنیکی اجازت نہ دینی اس کا نام **اخلاق** ہے۔ اور اسکو عقل کی قید سے آزاد کر دینے اور بے محل استعمال کرنیکا نام **بداخلاقی** ہے۔ اِس تقاضائے فطرتی کو اخلاق میں تبدیل کرنے کے لئے اسلام مندرجہ ذیل قیود بیان فرماتا ہے۔

اوّل قید یہ لگاتا ہے کہ فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ (بقرہ ع ۲۴) جو شخص تم پر ظلم کرتا ہے تم اسکے بدلے میں اتنی ہی سزا اسکو دے سکتے ہو۔ یہ حکم عام ہے اور ایسے لوگوں کے لئے ہے جو علم اور عقل کے ایسے اعلیٰ درجہ کے مقام پر نہیں پہنچے کہ احکام کی باریکیوں کو سمجھ سکیں۔ جو لوگ ان سے زیادہ سمجھدار ہیں۔ انکی نسبت مندرجہ ذیل قیود مقرر فرماتا ہے فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ۔ جو لوگ دوسرے کا گناہ معاف کر دیں درآنحالیکہ اس سے اصلاح مدنظر ہو۔ ان لوگوں کو خداتعالےٰ کیطرف سے اجر ملیگا۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی جو لوگ اُسوقت معاف کریں جبکہ معافی سے گناہ بڑھتا ہو یا اسوقت سزا دیں جبکہ سزا سے گناہ بڑھتا ہو۔ وہ دونو ظالم ہوں گے اور خداتعالےٰ کو ظلم پسند نہیں۔ گویا رأفت جسکا ظاہری نتیجہ عفو ہے اور نقم جسکا ظاہری نتیجہ سزا ہے دونو کے لئے یہ قید لگادی۔ کہ جب عفو کا نتیجہ اس شخص کے لئے اچھا ہو جس سے قصور ہوگیا ہے تو اُسوقت اس سے درگذر کرنا چاہیئے۔ اور رأفت کے جذبہ کو اپنا کام کرنے دینا چاہیئے۔ اور جب سزا سے فائدہ ہو اور ظالم کی اصلاح ہو تو اسوقت سزا دینی چاہیئے۔ اور نقم کے جذبہ کو اپنا کام کرنے دینا چاہیئے۔

دُوسری صورت یہ تھی کہ ظالم طاقتور ہو اور مظلوم اس سے بدلہ نہ لے سکتا ہو۔ یا کسی مصلحت کیوجہ سے بدلہ نہ لینا چاہتا ہو۔ پس وہ زبان سے اسکی بدگوئی اور عیب چینی کر کے اپنا دل ٹھنڈا کرنا چاہے تو اسکی نسبت فرمایا کہ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (حجرات ع ۲) تم کو ایک دوسرے کی عیب چینی کرنی جائز نہیں اور نہ گالیاں دینی جائز ہیں۔ پس گویا عیب چینی اور گالیاں دینی بالکل منع کر دیں اور فرما دیا کہ غصہ کے وقت میں اور بدلہ کے طور پر عیب چینی اور گالیاں بالکل منع ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں منع ہے؟ جو شخص اپنے نقصان کا بدلہ نہیں لے سکتا وہ کیوں عیب چینی کر کے اس شخص سے بدلہ نہ لے اور گالیاں دیکر دل خوش نہ کرے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ گالیاں اس لئے منع ہیں کہ وہ جھوٹ ہیں اور جھوٹ اسلام پسند نہیں کرتا۔ اور وہ فحش ہیں اور فحش کو اسلام پسند نہیں کرتا۔ اور عیب چینی اس لئے منع ہے کہ یہ سزا بجائے اصلاح کے فساد کا موجب ہوتی ہے۔ کیونکہ جس کی بدیوں کو علی الاعلان بیان کیا جاتا ہے اس کی شرم اڑ جاتی ہے اور وہ بیحیائی کا مرتکب ہونے لگتا ہے۔

تیسری صورت نقم کی یہ تھی کہ یہ شخص اس سے مقاطعہ کر لیتا ہے۔ اور اس سے کلام ترک کر دیتا ہے۔ اس صورتِ نقم کو بھی اسلام نے ناپسند کیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَّهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ (متفق علیہ) کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن تک کلام ترک کر دے۔ یعنی تین دن کے اندر اسکو چاہیئے کہ اس سے کلام شروع کر دے۔

چوتھی صورتِ نقم یہ تھی کہ یہ دل میں کینہ یا بغض رکھے۔ اسکے متعلق اللہ تعالے فرماتا ہے وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (حجر ع ۴) اور ہم نے مومنوں کے دلوں سے کینہ نکال دیا ہے یعنی مومن کا کام نہیں کہ کسی کی نسبت دل میں کینہ رکھے اسکے متعلق رسُول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں المؤمن لیس بحقود (کنوز الحقایق للمناوی برحاشیہ جامع صغیر السیوطی جلد دوم صفحہ ۱۸۱) مومن کینہ توز نہیں ہوتا۔ وہ اپنے دل میں کسی کی نسبت کینہ نہیں رکھتا۔

اِن تمام قیود کے ذریعہ سے اسلام نے نقم کا ایک ہی ظہور جائز رکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی شخص سے اسقدر بدلہ لے جسقدر کہ اس نے اسکو نقصان پہنچایا ہے۔ مگر اس کیلئے بھی یہ شرط ہے کہ اگر اُس جگہ حکومت ہے تو حکومت کے ذریعہ سے بدلہ لے خود ہی بدلہ نہ لے ہاں اگر حکومت اسجگہ پر نہ ہو تو اسیقدر بدلہ لے سکتا ہے۔ لیکن اصلاح اگر عفو سے ہو تو عفو مقدم ہوگا۔ باقی طریقِ انتقام یعنی گالیاں دینا۔ عیب چینی کرنا۔ ترکِ کلام کر دینا۔ دل میں کینہ رکھنا ان سب کو اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے کیونکہ ان کے ذریعہ سے گناہ ترقی کرتا ہے اور فساد بڑھتا ہے۔ اور اصلاح جو انتقام کی اصل غرض ہے مفقود ہو جاتی ہے۔

دوسرا طبعی تقاضا جو انسان کے اندر پایا جاتا ہے وہ **محبّت** ہے۔ تمام حیوانوں میں بھی اور انسانوں میں بھی ہم اس مادہ کو پاتے ہیں۔ اور اس کے مقابلہ پر ایک طبعی تقاضا **نفرت** کا ہے۔ یہ دونو طبعی تقاضے ہیں اور اپنے استعمال کے ذریعہ سے اخلاق بنتے ہیں۔ ہم نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم ہر اک شئے سے محبّت کرو۔ اور نہ یہ کہ ہر اک سے نفرت کرو۔ بلکہ ان کو حدود میں مقید رکھنے کے لئے قواعد کی ضرورت ہوگی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ محبت فطرتاً اسی سے پیدا ہوتی ہے جو ہمارے لئے کار آمد ہوتی ہے یا ہمارے حواس میں سے کسی حس کو آرام اور لذّت پہنچاتی ہے۔ اس وجہ سے طبعی طور پر محبّت انہی اشیاء سے ہوگی جو اس غرض کو پورا کریں۔ مگر یہ خلق نہ ہوگا کیونکہ اس قسم کی محبت سب جانور بھی کرتے ہیں۔ محبت خلق تبھی ہوگی جبکہ ایک تو اس میں مدارج کا لحاظ رکھا جائے۔ یعنی جس سے زیادہ تعلق ہے اس سے زیادہ محبت کیجائے اور جس سے کم ہے اس سے پہلے کی نسبت کم محبت کیجائے۔ دُوسرے محبت تب خلق ہوگی جب کہ اس میں احسان سابق کا خیال زیادہ مدنظر رکھا جائے بہ نسبت آئندہ کی امید کے کیونکہ سابق احسان کا خیال ایک ذمہ داری ہے اور آیندہ کی امید طمع۔ تیسرے یہ کہ صرف قریب کے نفع کو یا لذت کو مدنظر نہ رکھا جائے بلکہ دُور کے فائدے یا نقصان کا بھی خیال کیا جائے۔

اِن تین پابندیوں کے ساتھ محبت ایک خلق ہے ورنہ نہیں۔ چنانچہ اسلام

نے اِن تینوں پابندیوں کا ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ؑ (التوبہ ع ۳) کہہ دے کہ اگر تمہارے باپ۔ ماں اور اولاد اور بھائی بہنیں اور میاں یا بیوی اور تمہارا قبیلہ۔ اور وُہ مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے خراب ہونے سے تم ڈرتے ہو۔ اور رہائش کی جگہیں یا وطن جنکو تم پسند کرتے ہو۔ خدا اور اسکے رسول اور دین کیلئے کوشش کرنیکی نسبت تم کو زیادہ پسند ہیں ؟ تو تم اسوقت تک انتظار کرو جبتک کہ اللہ تعالےٰ تمہارے متعلق کوئی فیصلہ کرے۔ اور اللہ تعالےٰ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنی ذمہ داریوں کو بھول جاتے ہیں۔

کِس لطیف پیرایہ میں اس محبت کی جو خُلق ہے حقیقت بیان کی ہے۔ جس کا جسقدر درجہ ہے اسیقدر اس سے محبت کیجائے۔ خدا تعالیٰ سے خدا کی شان کے مطابق۔ رسول سے رسول کی شان کیمطابق۔ دین سے اسکے رتبہ اور اہمیت کے مطابق۔ والدین سے انکے درجہ کیمطابق اولاد سے انکے تعلق کے مطابق۔ غرض ہر ایک کے درجہ کو مدنظر رکھا جائے۔ اگر ایسا نہیں تو وہ محبت نیک خلق نہیں کہلائیگی۔ بلکہ ایک طبعی جوش اور حیوانیت کہلائیگی۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے والدین کو ایک عورت کیوجہ سے چھوڑتا ہے۔ یا اپنے وطن کی آواز پر اپنے مال کی محبت کیوجہ سے کان نہیں دھرتا تو اس شخص کو ہم ہرگز اس وجہ سے کہ وہ محبت کرتا ہے نیک نہیں کہیں گے۔ اس نے بیشک محبت کی مگر عقل اور فکر کی حکومت سے آزاد ہو کر کی۔ اس لئے کوئی اچھا خلق نہیں دکھایا۔

دوسری شرط محبت کیلئے یہ ہے کہ اسمیں سابق احسان کو زیادہ مدنظر رکھا جائے بہ نسبت موجودہ لذت یا آیندہ کی امید کے۔ اس شرط کے ماتحت وہ محبت جو نیک خلق کہلائے گی وہ والدین کی محبّت ہوگی نہ کہ اولاد کی۔ اولاد کی محبت یعنے خالی ان سے پیار

کوئی نیک خلق نہیں بلکہ محض ایک طبعی تقاضا ہے۔ کسی ماں کو کہکر دیکھو کہ وہ اپنے بچہ کی خاطر تکلیف نہ اٹھائے۔ دیکھو وہ اس پر خوش ہوتی ہے یا ناراض۔ درحقیقت وہ جو کچھ کر رہی ہوتی ہے محض بقائے نسل کے طبعی تقاضے کے ماتحت کر رہی ہوتی ہے۔ اس کی محبت صرف ایک طبعی تقاضا ہے۔ لیکن بچہ کا والدین سے پیار کرنا ایک خلق ہے کیونکہ طبعی طور پر والدین اپنا کام کر چکے ہیں۔ نیچر ان سے جو فائدہ اٹھانا چاہتی تھی وہ حاصل کر چکی ہے اب وہ انکو نکما وجود سمجھتی ہے۔ پس جو شخص ان سے محبت کرتا ہے وہ ایک نیک خلق کی پیروی کر رہا ہے۔ کیونکہ ان کے احسانات اس کے سامنے آجاتے ہیں۔ اور وہ جانتا ہے کہ انہوں نے میرے ساتھ جب میں بے بس تھا نیک سلوک کیا تھا۔ آج میرا فرض ہے کہ میں خواہ کوئی بھی تکلیف اٹھاؤں انکو آرام پہنچاؤں۔ اسلام نے اس امر کو مدنظر رکھ کر فرمایا ہے کہ جنت والدہ کے قدموں کے نیچے ہے۔ (مشکوٰۃ مطبوعہ مجتبائی صد ۴۲۱) مگر یہ نہیں فرمایا کہ اولاد کے قدموں کے نیچے ہے۔ کیونکہ ہر شخص طبعاً اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے۔ سوائے اس کے کہ جس کے دماغ میں فرق ہو۔ مگر ہر شخص اپنے ماں باپ سے اسقدر محبت نہیں کرتا جسقدر محبت کے وہ مستحق ہیں۔ بلکہ بہت سے لوگ دیکھے جاتے ہیں۔ جو اپنے بوڑھے ماں باپ کو تکلیف میں دیکھنا پسند کرلیں گے لیکن اپنی اولاد کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کے پورا کرنے کی فکر میں رہیں گے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اُن کا فعل نیک خلق کہلائیگا؟

تیسری قید محبت کے طبعی جذبے کیلئے یہ ہے کہ قریبی نفع اور فائدہ کو نہ دیکھا جائے بلکہ دُور کے فائدے یا نقصان کو بھی دیکھا جائے۔ مثلاً ایک شخص ایک چیز کو پیار کرتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے۔ مگر اس سے تعلق اور محبت اسکے دین یا خلق کو نقصان پہنچاتی ہے تو اسوقت اس سے محبت کرنا ایک طبعی جذبہ تو کہلائیگا مگر نیک خلق نہیں کہلائیگا۔ کیونکہ اس محبت کا نتیجہ نیک نہیں بلکہ بد ہے۔ یا مثلاً ایک ماں اپنے بچہ کی بدعادات کو دیکھتے ہوئے اسے کچھ نہیں کہتی کیونکہ اس کی محبت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اسے سزا نہ دے۔ تو یہ محبت صرف طبعی جذبہ کہلائیگی۔ اخلاق کے ماتحت محبت تبھی آئیگی جبکہ وُہ اسکو تنبیہ کرے اور اسے نیکی کیطرف لائے۔ کیونکہ اصل فائدہ اس کا اس موقع پر سزا پانے میں ہے۔ چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (تحریم ع ۱)

اے مومنو! اصل محبت یہ ہے کہ اپنے آپکو اور اپنی بیویوں اور بچوں کو ہلاکت سے بچاؤ۔

نفرت بھی محبت کے مقابلہ کا جذبہ ہے اور طبعی جذبہ ہے۔ اور اس کا محل طبعی یہ ہے کہ جو چیز اپنے حواس کو ناپسند ہو یا جس کا نفع نہو یا جو نقصان دینی ہو اُس سے دُور رہنا یا اُسکو اپنے سامنے سے ہٹانیکی کوشش کرنا۔ مختلف مذاہب اس جذبہ کو بُرا قرار دیتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی لیکن یہ بات درست نہیں۔ یہ ایک طبعی جذبہ ہے۔ اور اسکا محل اور موقع پر استعمال ناپسند نہیں بلکہ اچھا ہے۔ ہاں جب یہ حد سے زیادہ ہو یا حد سے کم ہو تب یہ جذبہ بُرا ہو جاتا ہے۔ اگر حد سے زیادہ ہو جائے تو اسے **عداوت** کہتے ہیں۔ یعنی بوجہ نفرت اور انقباض ظلم پر آمادہ ہو جانا۔ اور جب کم ہو تو اسے **بے غیرتی** کہتے ہیں۔ یعنی باوجود اس کے کہ ایک چیز حیاء یا اکرام کے خلاف ہو پھر بھی اسکو دیکھکر دل میں اس کے لئے نفرت یا انقباض محسوس نہ کرنا۔

پس نفرت بُری چیز نہیں۔ نفرت تو ایک طبعی جذبہ ہے۔ ہاں اس کا غیر محل استعمال بُرا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں بار بار عداوت کو بُرا قرار دیا گیا ہے۔ ہمیشہ عداوت کو کفّار اور سرکش لوگوں کی صفت بتایا ہے۔ ایک جگہ بھی مومن کی نسبت نہیں کہا گیا کہ وُہ دوسروں سے عداوت کرتا ہے۔ صرف دو تین جگہوں پر اللہ تعالےٰ اور مومنوں کی نسبت یہ لفظ استعمال ہوُا ہے۔ اور ان تمام مقامات پر عربی محاورہ کے مطابق اس سے مراد دشمن کی عداوت کا بدلہ دینے کے ہیں نہ کہ خود عداوت کرنیکے۔ مگر اسلام جس طرح عداوت کو ناپسند کرتا ہے اسی طرح نفرت کے بالکل مٹا دینے کو بھی ناپسند کرتا ہے کیونکہ غیرت بھی مومن کے اخلاق میں سے ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک بات کو ہم ناپسند کریں اور اس کے متعلق ہمارے دل میں انقباض پیدا نہ ہو۔ بدی کے معنے رُوحانی غلاظت کے ہیں۔ جب ہم ظاہری غلاظت سے کسی کو ملوّث دیکھتے ہیں تو ہمیں اسکے اس فعل سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور طبیعت میں اس کیطرف دیکھنے سے انقباض ہوتا ہے مثلاً کسی کے چہرے پر کوئی گندی چیز لگی ہوئی ہو۔ یا مثلاً اس نے ناک صاف نہ کیا ہو۔ یا اس کے کپڑوں پر ناپاک چیزیں لگی ہوئی ہوں تو ایسا شخص جب ہمارے سامنے آتا ہے تو کیا ہم اسکو دیکھکر اپنے دل میں ایک گھن محسوس نہیں کرتے؟ خواہ وہ ہمارا بیٹا ہی کیوں نہو۔ اور

کیا ہمارے اس فعل کو بُرا سمجھا جاتا ہے یا دِلی پاکیزگی کی علامت سمجھا جاتا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ اگر کسی کے بدفعل کو دیکھکر ہمارے دلمیں اس فعل سے نفرت پیدا ہو اور ہمارا دل منقبض ہو تو اسے بُرا کہا جائے؟ یہ تو ایک مستحسن فعل ہوگا اور تعریف کے قابل اور اس نفرت کو جو صحیح طور پر اور برمحل استعمال ہوگی ہم غیرت کے نام سے موسوم کریں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ نفرت کو بُرا قرار دینے والے لوگوں نے ایک حقیقت کو نہیں سمجھا اور وہ یہ کہ بد اور بدی میں فرق ہے انہوں نے اس امر پر تو غور کیا کہ بد کی بھی ہمیں خیرخواہی کرنی چاہیئے لیکن یہ نہ سوچا کہ بد کی خیرخواہی کیساتھ ہمیں بدی سے نفرت چاہیئے۔ اگر ہم بد کی بدی سے نفرت نہیں کرینگے تو اسکی اصلاح کا جوش بھی ہمارے دل میں نہیں پیدا ہوگا۔ اسلام نے اس فرق کو بیان کیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (مائدہ ع ۲) یعنی کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس امر پر نہ اُکسائے کہ تم عدل چھوڑ دو۔ نہیں بلکہ باوجود اس کی دشمنی کے تم اس سے عدل کا معاملہ کرتے رہو۔ گویا دوسرے لفظوں میں اسکے یہ معنی ہونگے کہ تو اپنے دشمن سے بھی دشمنی نہ کر۔

اسی طرح فرماتا ہے لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ (ممتحنہ ع ۲) اللہ تعالےٰ تم کو ان لوگوں سے جو تمہارے دین میں مخالف تو ہیں لیکن تم سے اس غرض سے کہ تم کو جبراً تمہارے دین سے پھرا دیں لڑتے نہیں۔ اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالتے نہیں نیکی کرنے اور انکے ساتھ عدل کرنے سے نہیں روکتا یعنی تو ان لوگوں سے بھی نیک سلوک کر گو وہ تیرے مذہبی دشمن ہیں لیکن دُوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (ہود ع ۱۰) تم ان لوگوں کی طرف مت جھکو جو ظالم ہیں یعنی اسلام پر قائم نہیں۔ اب ایک طرف تو اللہ تعالےٰ فرماتا ہے تم کفار سے نیک سلوک کرو۔ دوسری طرف فرماتا ہے کہ تم انکی طرف جھکو نہیں۔ اس کے یہی معنے ہیں کہ دنیوی معاملات میں تو ان سے نیک سلوک کرو لیکن انکے وُہ اعمال جو تقویٰ اور طہارت کے خلاف ہیں ان سے نفرت کرو۔

ایک دوسری جگہ پر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ (حجرات ع ۱) لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایمان کی محبت دی ہے اور اسکو تمہارے دلوںمیں خوبصورت کرکے دکھایا ہے اور کفر اور نافرمانی اور حد سے گزر جانیکے متعلق تمہارے دلوںمیں کراہت کے جذبات پیدا کئے ہیں۔

مگر ساتھ ہی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرماتا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (شعراء ع ۱) شاید تو اس غم میں کہ خدا کے دین کے منکر صداقت کو قبول نہیں کرتے اپنے آپکو ہلاک کردیگا یعنی انکی گمراہی کو دیکھکر تیرے دل کو اسقدر صدمہ پہنچتا ہے کہ تو انکی محبت کیوجہ سے خود ہلاکت کے قریب پہنچ جاتا ہے۔

اِن آیات سے ظاہر ہے کہ اسلام کے نزدیک بدکی تو بیشک خیرخواہی کرنی چاہئیے مگر اُس کی بدی کیحالت سے نفرت کرنی چاہیئے۔ تبھی اخلاق کامل ہوتے ہیں۔

اب مَیں ایک اور طبعی جذبہ کو لیتا ہوں اور یہ خواہش **ترقی** کا جذبہ ہے۔ انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں سے آگے نکل جائے بلکہ یہ جذبہ جانوروں تک میں بھی پایا جاتا ہے۔ دو گھوڑے آگے پیچھے سے آرہے ہوں فوراً اگلا گھوڑا جو پہلے آہستہ جارہا تھا پچھلے گھوڑے کے قدموں کی آہٹ سُنکر اپنے قدم تیز کردیگا۔ اور پھر پچھلا بھی دوڑ پڑیگا۔ یہ ایک طبعی جذبہ ہے۔ لیکن اس کی زیادتی اور کمی کئی قسم کی بداخلاقیاں پیدا کردیتی ہے۔ اور اسکا صحیح استعمال کئی نیک اخلاق پیدا کردیتا ہے۔ مثلاً جب اس ترقی کی خواہش کو انسان نیکیوں میں مقابلہ کرنے کے لئے صرف کرتا ہے تو یہ خواہش اسکو بہت کچھ فائدہ پہنچاتی ہے طالب علم اسی کے ذریعہ سے علم میں ترقی کرتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (بقرہ ع ۱۸) اے مُسلمانو! ایک دوسرے سے نیکی میں بڑھنے کی کوشش کرو۔ گویا اس طبعی جذبہ کو ایک قید کیساتھ استعمال کرکے ایک نیک خلق پیدا کردیا کہ نیک اخلاق میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی خواہش کرنا خود ایک نیک خلق ہے۔

مگر یہ جذبہ جب بدطور سے استعمال کیا جائے تو ایک تو اس سے حسد پیدا ہوتا ہے یعنی جب یہ خواہش حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوجاتا

ہے کہ صرف میں آگے بڑھوں اور کوئی نہ بڑھے اسکو اسلام نے ناپسند کیا ہے۔ قرآن کریم میں دعا سکھائی ہے مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (فلق ع ۱) مَیں خدا تعالےٰ کی پناہ مانگتا ہوں حاسد کی شرارت سے جب وہ حسد کرے۔

اسی طرح ایک نقص اس خواہش کیوجہ سے یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ انسان اس کیوجہ سے لوگوں کی خوبیوں کو عیب سمجھنے لگتا ہے۔ یعنی کبھی تو اسکو یہ خواہش ہوجاتی ہے کہ دوسرے لوگوں کی اچھی چیزیں مجھے مل جائیں تاکہ مَیں بڑھا رہوں اور کبھی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے کہ مَیں بڑھیا رہوں وہ دوسروں کے کمالات کو عیب دیکھنے لگتا ہے اور اسے عربی میں **احتقار** کہتے ہیں۔ اسکو بھی اسلام نے ناپسند کیا ہے قرآن کریم فرماتا ہے يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ (حجرات۔ ع ۲) اے مومنو! تم میں سے کوئی جماعت دوسری جماعت کو حقیر نہ سمجھے شاید وہ تم سے اچھی ہو۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کو حقیر جانیں شاید وہ ان سے اچھی ہوں۔ یہی خواہش جب اور زیادہ بڑھ جاتی ہے تو انسان ظاہر میں دوسرے کو گالیاں دیتا ہے اور اسکی نسب یا حسب میں طعن کرتا ہے اِن سب امور کو اسلام نے روکا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَا يَرْمِيْ رَجُلٌ رَجُلًا بِالْفِسْقِ اَوِ الْكُفْرِ اِلَّا ارْتَدَّتْ عَلَيْهِ اِنْ لَّمْ يَكُنْ صَاحِبُهٗ كَذٰلِكَ یعنی اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی نسبت کوئی اخلاقی عیب یا دینی نقص منسوب کریگا۔ تو اگر اس شخص میں جسپر وہ عیب لگایا ہے وہ عیب نہ ہوگا یعنی بطور گالی کے اسکو ذلیل کرنے کے لئے اس نے ایسی بات کہی ہوگی تو آخر گالی دینے والے میں وہی عیب پیدا ہو جائیگا۔

ایک اور نقص اس طبعی جذبہ کو حد میں نہ رکھنے سے یہ ہوتا ہے کہ انسان میں **افتخار** کی عادت پیدا ہو جاتی ہے یعنی اس خواہش کی ترقی کا اسکے دماغ پر ایسا . . . اثر پیدا ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ اسکو اپنے عیوب اور اپنی کمزوریاں بھولجاتی ہیں اور یہ دوسروں سے اپنے آپ کو اچھا سمجھ لیتا ہے اور اسپر ناز کرتا ہے اسکے متعلق قرآن کریم فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا۔ (نساء ع ۶) اللہ تعالےٰ پسند نہیں کرتا تکبر کرنیوالے

اترانے والے کو۔

اسی طرح ایک طبعی تقاضا **بقائے نسل** کا ہے۔ اس کے متعلق بھی اسلام نے حد بندیاں قائم کی ہیں اور فرمایا ہے کہ اسکو بھی سوچ اور سمجھ کر استعمال کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس کے متعلق مندرجہ ذیل احکام دیئے ہیں:۔

اوّل یہ کہ یَآاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَکَ اَزْوَاجَکَ الّٰتِیْٓ اٰتَیْتَ اُجُوْرَھُنَّ۔ (احزاب ع ۶) نکاح کرنے تمہارے لئے جائز ہیں۔

دوم یہ کہ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی (بنی اسرائیل ع ۴) زنا کے قریب نہ جاؤ۔ یعنی اپنی بیویوں کے سوا دوسروں پر اپنی شہوت کو پورا نہ کرو۔ کیونکہ اس سے بھی طبعی تقاضے کی اصل غرض فوت ہو جائے گی۔

اب ایک یہ سوال تھا کہ جنکے لئے شادی کا انتظام نہو سکتا ہو وہ کیا کریں؟ تو ان کے لئے فرمایا وَلْیَسْتَعْفِفِ الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ نِکَاحًا (نور ع ۴) چاہیئے کہ وہ لوگ جنکو نکاح کا موقع میسر نہیں اپنی طاقتوں کو دبادیں یعنی ایسی احتیاطوں سے جو شہوات کو کم کرتی ہیں اپنے جوشوں کو کم کریں مگر زنا نہ کریں اور نہ یہ کریں کہ اپنی طاقتوں کو بالکل ضائع کر دیں جن کے ذریعہ سے بقائے نسل کا تقاضا پورا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ گویا اپنی فطرت مسخ کرینگے اور اللہ تعالےٰ اسکو ناپسند کرتا ہے کہ فطرتی تقاضوں کو بالکل مٹا دیا جائے۔ اسی طرح فرمایا وَرَھْبَانِیَّۃَ نِ ابْتَدَعُوْھَا مَا کَتَبْنٰھَا عَلَیْھِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰہِ فَمَا رَعَوْھَا حَقَّ رِعَایَتِھَا (حدید ع ۴) یعنی بعض قوموں نے رہبانیت کا طریق ایجاد کیا کہ اس طرح وہ اپنے نفس کو بالکل پاک رکھینگے مگر ہم نے انکو اس کام کے لئے ہرگز نہیں کہا تھا بلکہ انہوں نے اپنے پاس سے یہ مسئلہ ایجاد کر لیا تھا۔ پس چونکہ یہ عہد انکا غیر طبعی تھا اور فطرت کے تقاضوں کے خلاف تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس کی حفاظت نہ کر سکے اور نام ہی کی رہبانیت رہی۔

دیکھو کس خوبی سے اس جذبہ کی حد بندی کی ہے۔ ایک طرف اسکو نکاح کے ذریعہ سے استعمال کرنیکی اجازت دی ہے۔ پھر نکاح کے باہر اس کے استعمال سے روکا ہے نکاح

نہ کرنیکے عہد کو بھی ناپسند کیا ہے کہ اس سے اس تقاضے کو گویا ہمیشہ کے لئے دبا دینا ہے۔ اور اس غرض کو مفقود کر دینا ہے جس کے لئے یہ تقاضا یعنی بقائے نسل کی خواہش پیدا کی گئی تھی۔ اگر سب لوگ اس پر عمل کرنے لگیں تو کچھ ہی دنوں میں دنیا مفقود ہو جائے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ طبعی تقاضوں کا مٹانا ناممکن ہے کیونکہ حقیقت کو خیال اور ارادے سے نہیں مٹایا جا سکتا۔ اسکے ساتھ ہی یہ سوال تھا کہ پھر جنکو نکاح کی توفیق نہیں وہ کیا کریں؟ تو فرمایا کہ ان کو عارضی طور پر اپنی خواہشات کو دبانا چاہیئے مگر یہ جائز نہیں کہ اس خواہش کو بالکل مٹا دیں کیونکہ اس سے پیدائش کی غرض باطل ہوتی ہے۔

اب دیکھو اسلام کے سوا کونسا مذہب ہے جس نے اس تقاضے کو ایک طبعی تقاضے سے جو ادنے سے ادنے جانور میں بھی پایا جاتا ہے خواہ وہ خورد بینی کیڑا ہی کیوں نہو ایسے اعلےٰ درجہ کے اخلاق تک جن کی بنا ر باریک فلسفیانہ مسائل پر ہے پہنچا دیا ہے۔

ایک طبعی تقاضا انسان کے اندر **اظہار ملکیّت یا تصرّف** کا ہے۔

اس تقاضے کے ماتحت وہ اپنے اموال کو خرچ کرتا یا بند کرتا ہے۔ اس کے لئے بھی اسلام نے قیود لگائی ہیں مثلاً اوّل قید یہ لگائی ہے کہ اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ (بقرہ ع ۳۷) جو مال تمہارا کمایا ہوا ہے اور اچھا مال ہے اس میں سے خرچ کرو۔ یہ نہیں کہ دوسروں کے اموال پر تصرف کرکے انکو خرچ کرنے لگ جاؤ۔ دوسری قیود یہ لگائی ہیں۔ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا (بنی اسرائیل ع ۳) (۱) اپنے مال میں سے اُن قریبیوں اور رشتہ داروں کو جنکی کفالت تیرے سپرد ہے انکا حق دے۔ اسجگہ اس امر کا بھی اشارہ کیا ہے کہ اسلام کے نزدیک قریبی رشتہ داروں کی کفالت بڑے رشتہ داروں پر فرض ہے۔

(۲) دوسرا حکم یہ دیا ہے کہ غریبوں اور مسکینوں پر بھی اس مال میں سے خرچ کرنا چاہیئے یعنی ایک حصہ انکو بھی دے۔

(۳) تیسرا حکم یہ دیا کہ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا۔ تبذیر کے معنے عربی زبان میں دانہ ڈالنے کے یا پراگندہ کرنے کے یا امتحان لینے کے ہوتے ہیں۔ پس اسکا مطلب یہ ہوا کہ

خرچ کرتے وقت یہ نیت نہ رکھ کہ اس کے بدلے میں یہ لوگ بھی مجھ سے کوئی سلوک کریں گے جس طرح زمیندار دانہ ڈالتے ہوئے امید رکھتا ہے کہ یہ بڑھ جائیگا اور میں کاٹونگا۔ اور نہ اپنے مال کو پراگندہ کر یعنی یہ نہ کر کہ سب مال لُٹاکر خالی ہاتھ ہو کر بیٹھ جا۔ یا یہ کہ سب مال اپنے پر خرچ کرے اور دوسروں کو نہ دے۔ اور نہ مال اپنے رشتہ داروں یا غرباء کو اس طرح دے کہ وہ امتحان میں پڑیں۔ یعنی بجائے فائدہ کے اُن کو نقصان ہو۔ وہ کاہل یا سُست ہو جائیں۔ یا سوال کی عادت انمیں پیدا ہو جائے۔ یا عیاش ہو جائیں اسیطرح اموال کے خرچ کرنیکے متعلق یہ ہدایت بھی دی ہے کہ فِيٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ (ذاریات ع ۱) مُسلمانوں کے اموال میں ان لوگوں کے لئے حق ہے جو بولنے سے محروم ہیں یعنی انمیں قوتِ گویائی نہیں اور اپنی تکالیف کو بیان نہیں کر سکتے جیسے کہ جانور ہیں وہ اپنی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ پس چاہیئے کہ اپنے صدقات میں سے ایک حصہ جانوروں کو بھی دیا جائے۔ یا جو جانور بیمار اور ضعیف ہوں ان کی خبر گیری کیجائے۔ یا جو جانور گھر میں ہوں اُن کے آرام کا خاص خیال رکھا جائے۔

اِسی طرح اسلام نے صبر اور شکر اور احسان اور سچائی اور اعتماد اور میانہ روی اور وفاداری اور رازداری۔ اور لوگوں کی حاجتوں کے پورا کرنے۔ اور اصلاح بین الناس۔ اور خوف اور رجا۔ قناعت اور ایثار۔ اور مواسات اور حلم۔ اور افادت اور حیاء۔ اور وعدہ کا پورا کرنا۔ اور خوش چہرہ سے لوگوں سے ملنا اور وقار اور مہمان نوازی اور عیادتِ مریض۔ اور امانت اور دیانت۔ غم اور غیبت اور چغلی اور جھوٹ۔ اور ایذا رسانی اور تجسّس۔ اور لوگوں کی باتیں سننی اور لوگوں کے خطوط پڑھنے اور عیب ظاہر کرنے۔ اور دھوکا اور احسان جتانے اور بغاوت اور جسمانی عذاب دینے۔ اور ریاء اور سمعت اور بیہودہ بکواس اور لغو قسموں کے کھانے۔ اور خوشامد کرنے۔ اور چوری اور قتل اور ظلم۔ اور تجارت میں دھوکا کرنے اور ایسے امور میں دخل دینے جن سے اسکا تعلق نہیں ہے۔ اور یتامیٰ اور بیواؤں کی خبر گیری۔ اور بزدلی وغیرہ تمام اخلاقی امور کے متعلق وہ صحیح تعلیم دی ہے جو افراط اور تفریط سے پاک ہے اور سچی پاکیزگی پیدا کرنے کا موجب ہے مگر اسجگہ اسکو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

خلاصہ یہ کہ تمام طبعی عادات کو اسلام نے قیود کے ساتھ اخلاقِ فاضلہ میں بدل دیا ہے۔ اور اس نکتہ کو سوائے اسلام کے اور کوئی مذہب نہیں سمجھا اور نہ اسنے پیش کیا ہے نہ کسی پہلے مذہب نے نہ بعد میں بننے والے مذاہب نے جن کی بنیاد گو قرآن کریم کی موجودگی میں رکھی گئی ہے مگر وُہ ان خوبیوں سے محروم ہیں جو قرآن کریم میں پائی جاتی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تفصیل سے اس مضمون کو بیان نہیں کر سکتا ورنہ ایک ایک طبعی تقاضے کو اسلام نے انسانی ارادے اور عقل کے ماتحت لاکر اس سے اخلاقی تعلیم پیدا کر دی ہے اور دوسرے مذاہب کی طرح صرف طبعی تقاضوں یا انکے کسی پہلو کا نام اخلاق رکھکر اسپر زور نہیں دیا۔ اسلام نے درحقیقت اس پیچیدہ سوال کو حل کر دیا ہے جو اخلاق فاضلہ کے متعلق طبائع میں اُٹھتا ہے اور ابتک اُٹھ رہا ہے۔ یعنی یہ کہ اخلاق کی تعریف کیا ہے؟ کیونکہ اسلام یہ بتاتا ہے کہ اخلاق تمام طبعی تقاضوں کے درمیان صلح کرانیکا نام ہے۔ جس طرح تمدن تمام بنی نوع انسان کے درمیان صلح کرانے کا نام ہے۔ وہی تعلیم اخلاق کہلا سکتی ہے جو تمام طبعی تقاضوں کے لئے کام کرنے کا راستہ نکالتی ہے اور ایسی قیود مقرر کرتی ہے کہ کوئی طبعی تقاضا دوسرے تقاضے کے علاقے میں نہ گھُس جائے۔ نقم۔ رأفت کی حدود میں نہ جائے اور رأفت نقم کی حدود میں نہ جائے۔ محبت نفرت کے علاقہ میں نہ گھُسے اور نفرت محبت کے علاقہ میں نہ گھُسے۔

غرض یہ کہ سب طبعی تقاضے اپنے اپنے دائرہ میں باقاعدہ چکر لگائیں جسطرح کہ ستارے اپنے راستوں میں چکر لگاتے ہیں اور کوئی دوسرے کے لئے مانع نہ بنے۔ بلکہ جسوقت اُسکا علاقہ شروع ہو وہیں رُک کر کھڑا ہو جائے۔ گویا انسانی دماغ کو ایک حکومت فرض کیا جائے تو طبعی تقاضے اسمیں بسنے والے لوگ ہیں اور اخلاق وہ قانون ہے جس کے ذریعہ سے اُنمیں امن قائم رکھا جاتا ہے۔ کیا ہی لطیف تعریف اور کیسا واضح بیان ہے!

اخلاق کے مدارج

اب میں مقصدِ ثانی کے سوال ثانی کو لیتا ہوں یعنی اس امر کو بیان کرتا ہوں کہ اسلام

نے اخلاق کے مختلف مدارج کیا بیان کئے ہیں ؟

یہ سوال جیسا کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے اخلاق کی پابندی کے لئے نہایت ضروری ہے اور ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ ظاہری تعلیم کے لئے کلاس بندی کی ضرورت ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اگر مدارس اور کالجوں کی تعلیم کو اس طرح درجوں میں تقسیم نہ کیا جاتا تو بہت سے لوگ تعلیم سے محروم رہجاتے۔ کیونکہ بہت سے لوگ اس امر کا اندازہ نہ کر سکتے کہ انہوں نے کہانتک تعلیم حاصل کرنی ہے اور بہت سے لوگ ہمت ہار بیٹھتے اور اس قدر کورس کو پڑھنا ناممکن خیال کر لیتے۔ پس جماعتوں میں پڑھائی کو تقسیم کرنا نہ صرف معلّموں اور تعلیم کے منتظموں کے لئے مفید ہوتا ہے بلکہ خود تعلیم حاصل کرنے والوں کے لئے بھی اسمیں بہت سے فائدے ہوتے ہیں۔ اخلاق کی حالت بھی بعینہٖ ایسی ہی ہے بلکہ ہر تعلیم جو تمام بنی نوع انسان کے لئے ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے مدارج میں تقسیم کیا جائے تا مختلف استعدادوں کی طبائع اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر تعلیم ایسی ہوگی کہ صرف اعلیٰ درجے کے لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں تو ادنیٰ اور اوسط درجے کے لوگ اس سے محروم رہجائیں گے۔ اور اگر ایسی ہوگی کہ صرف اوسط درجہ کے لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں تو ادنیٰ درجے کے لوگ اس سے محروم رہجائیں گے اور اعلےٰ درجے کے لوگوں کے لئے اسمیں کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ اور اگر ادنےٰ درجے کے لوگوں کو اس میں مدنظر رکھا جائیگا تو اوسط و اعلیٰ کے لوگوں کے لئے اس میں کوئی نفع نہ ہوگا۔ اور اگر اس میں کوئی ترتیب مدنظر نہ ہوگی تو بھی اعلیٰ درجے کے لوگ تو شاید ایک حد تک اس سے فائدہ اٹھا سکیں مگر باقی لوگ اس سے محروم رہ جائینگے اور ہمتیں ہار بیٹھیں گے۔ اور اگر صرف خیالی اور نمائشی تعلیم ہوگی تو بھی اس کا کوئی فائدہ نہوگا۔ لیکچروں کی زینت اور سٹیجوں کی رونق کے لئے یہ تعلیم اچھی ہوگی مگر اس سے عملی فائدہ دنیا کو نہیں پہنچیگا۔

اِس امر کی ضرورت ثابت کرنے کے بعد کہ دنیا کو صرف اخلاقی تعلیم کی ضرورت نہیں بلکہ عملی اور تدریجی اخلاقی تعلیم کی ضرورت ہے جو انسان کو کمال تک پہنچا سکے۔ اب میں اُن مدارج کا ذکر کرتا ہوں جو اسلام نے اخلاق کے متعلق جو خواہ اچھے ہوں خواہ بُرے بیان فرمائے ہیں۔

سو یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام نے اخلاق کے متعلق دو قسم کی تعلیم دی ہے۔ ایک اجمالی اور ایک تفصیلی۔ اجمالی تعلیم میں تو نیک اور بد اخلاق کو ایسے مدارج میں تقسیم کر دیا ہے جنمیں کہ تمام اخلاق داخل ہو جاتے ہیں۔ اور اس تقسیم کے ذریعہ ہر ایک انسان اپنے لئے ایک راستہ بنا سکتا ہے اور بدیوں سے بچنے اور نیکیوں کے حصول کیلئے کوشش کر سکتا ہے۔ اس اصولی تعلیم کے علاوہ ایک تفصیلی تعلیم ہے جسمیں تفصیل سے ہر ایک امر کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے اور ہر ایک قسم کے خلقوں کی ترتیب بیان کی ہے۔

اصولی تعلیم اخلاق کے مدارج کے متعلق قرآن کریم کی اس آیت میں مذکور ہے
اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ۔
(نحل ع ۱۳) اللہ تعالےٰ تم کو عدل اور احسان اور عزیزوں جیسے سلوک کا حکم دیتا ہے۔ اور تم کو اُن بدیوں سے جو انسان کے نفس سے تعلق رکھتی ہیں اور اُن سے جو ظاہر ہوتی ہیں۔ اور لوگوں کو بُری لگتی ہیں اور اُن سے جن سے لوگوں کو عملی تکلیف پہنچتی ہے روکتا ہے۔ اور تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم دنیا میں نیک نام چھوڑو۔

اِس آیت میں نیکیوں کے بھی تین مدارج بیان کئے ہیں اور بدیوں کے بھی تین مدارج بیان کئے ہیں۔ کل نیکیاں اور بدیاں انہی تین تین قسموں کے نیچے آجاتی ہے نیکیوں کا پہلا درجہ عدل ہے یعنی برابری کا معاملہ جیسا کہ کوئی اس سے معاملہ کرے اور ویسا ہی یہ اس سے کرے یا جسقدر حسن سلوک کوئی اس سے کرے اتنا ہی حسن سلوک یہ اس سے کرے۔ اور یہ بھی کہ خیالات میں عدل رکھے۔ جس قسم کے خیالات یہ چاہتا ہے کہ لوگ میرے متعلق رکھیں ویسے ہی خیال یہ انکی نسبت دل میں رکھے۔ غرض کہ ہر اک معاملہ میں برابری کو ملحوظ رکھے اور یہ نہ کرے کہ لوگ تو اس سے اچھا معاملہ رکھیں اور یہ اُن سے بُرا معاملہ رکھے۔ اور نہ یہ کرے کہ خود تو لوگوں سے اچھے معاملہ کی امید رکھے اور آپ اُن سے بُرا معاملہ کرنا چاہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ لفظ عدل سے اس قسم کے بدلے بھی خارج ہیں جو ایسے امور پر مشتمل ہوں جو قطعی طور پر ناپسند ہوں۔ مثلاً فحش کلامی یا بدکاری یا جھوٹ

وغیرہ۔ عدل کے ماتحت اسکو یہ توحق ہے کہ جرم کی اسیقدر سزا دے جسقدر کہ اس سے کسی نے معاملہ کیا ہے مگر اسے یہ جائز نہیں کہ اگر جرم کسی فحش قسم کا ہے جس کا ارتکاب کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہوتا تو یہ بھی اسیقدر فحش کا مرتکب ہو جائے کیونکہ فحش زہر ہے اور زہر کے مقابلہ میں زہر کھالینا گویا اپنا دُہرا نقصان کر لینا ہے اور ایسا بدلہ بدلہ نہیں بلکہ عملی جہالت ہے۔

دوسرا درجہ نیکیوں کا اسلام احسان بتاتا ہے یعنی یہ کوشش کرے کہ جسقدر کوئی سلوک کرے خواہ مالی معاملات میں خواہ جسمانی میں خواہ علمی میں اس سے بڑھکر یہ اس سے سلوک کرنے کی کوشش کرے۔ اور اگر کوئی اس سے بدسلوکی کرے تو حتی الوسع یہ اس کو معاف کرے سوائے اس صورت کے کہ معافی فساد کا موجب ہو۔ یہ درجہ پہلے درجہ سے اعلیٰ ہے۔ اور وہی شخص اس درجہ تک نیکی میں ترقی کر سکتا ہے جو پہلے عدل کے درجہ کو طے کر چکے اور اپنے نفس کو اسکا عادی بنالے ورنہ ایک سطحی تغیر اس کی طبیعت میں ہوگا اور تھوڑی سی غفلت سے پھر نیچے گر جائیگا۔

تیسرا درجہ نیکیوں کا ایتای ذی القربیٰ ہے۔ یعنی ایسے رنگ میں دنیا سے معاملہ کرے کہ اسے یہ بالکل خیال ہی نہ رہے کہ یہ لوگ مجھ سے کوئی نیک معاملہ کرینگے جس طرح ماں اپنے بچہ سے یا باپ یا بھائی اپنے بچہ یا بھائی سے سلوک کرتے ہیں کہ وہ اسے ایک طبعی فرض سمجھتے ہیں۔ یا بھائی سے اس امر کی امید نہیں رکھتے کہ یہ ہمارے سلوک کا کوئی بدلہ دیگا۔ اگر ماں باپ ساٹھ ستر سال کے ہوں اور بچہ دو تین سال کا ہو تو بھی وہ اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ خدمت کرتے جس طرح کہ اگر وہ جوان ہوتے تو کرتے۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ بچہ ہماری خدمت نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے جوان اور کام کرنے کے قابل ہونے تک ہم مر چکے ہونگے۔ اور یہ ان کا فعل صرف اسوجہ سے ہوتا ہے کہ ان کو اس بچہ سے طبعی محبت ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ اس سلوک کو جو وہ بچہ سے کرتے ہیں احسان بھی نہیں سمجھتے بلکہ اپنا فرض خیال کرتے ہیں۔ بلکہ اگر کوئی شخص ان کے سامنے کہے کہ اس بچہ پر اسقدر احسان کرتے ہو؟ تو شاید وہ حیران ہو جائیں کہ احسان کیسا؟ ہم تو اپنے بچہ کو پالتے ہیں۔ تو یہ حالت جو ماں باپ یا قریبی رشتہ داروں کے

سلوک کی ہوتی ہے یہ احسان سے بہت بڑھ کر ہوتی ہے۔ احسان میں پھر بھی انسان کو حِس ہوتی ہے کہ وہ ایک نیک کام کر رہا ہے۔ اور قریبیوں کے سلوک میں اس امر کا بالکل خیال بھی نہیں ہوتا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہے ہیں بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سلوک سے وہ خود اپنے نفس کو آرام پہنچا رہے ہیں اور اس میں انکو لذت محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ تیسرا درجہ نیکیوں کا سب سے اعلیٰ ہے اس درجہ میں انسان اسقدر ترقی کر جاتا ہے کہ اسے نیک اخلاق میں لذت آنے لگتی ہے اور وہ اپنے اوپر احسان سمجھتا ہے کہ مجھے لوگوں سے نیک سلوک کرنیکا موقع ملا جس طرح کہ وہ لوگ جن کے ہاں اولاد ہوتی ہے یہ نہیں خیال کرتے کہ انہیں ایک بوجھ پڑ گیا ہے بلکہ خوش ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل کو یاد کرتے ہیں۔ ایسے لوگ گویا دنیا کے لئے اپنے آپکو وقف کر دیتے ہیں۔ اور لوگوں کی تکلیف میں تکلیف پاتے ہیں اور انکے سکھ میں سُکھ۔ اور باوجود اس کے وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ دنیا پر انہوں نے احسان کیا بلکہ خود ممنون ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم پر فضل ہوا کہ ہمیں یہ کام کرنے کا موقعہ ملا۔ بلکہ خواہش کرتے رہتے ہیں کہ کاش اس سے زیادہ کام کا موقعہ ملتا۔ جس طرح ماں باپ خواہش کرتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس زیادہ ہوتا تو بچوں کی اور بھی خاطر کرتے۔

بدیوں کے تین مدارج نیکیوں کے تین مدارج کے مقابل پر ہیں یعنے عدل کے مقابلہ پر فحش۔ جس کے معنے ہیں بدی کے۔ جب یہ لفظ منکر کیساتھ آئے تو اسکے معنے اس بدی کے ہوتے ہیں جو پوشیدہ ہو اور ظاہر پر اس کا اثر نہ ہو۔ جیسے دلی ناپاکی اور بدارادے وغیرہ۔ یہ پہلا درجہ بدی کا ہے جس طرح عدل پہلا درجہ نیکی کا ہے جب انسان کے اندر صحبت کے اثر سے یا بد تعلیمات کے پڑھنے سے۔ یا بہیمی صفات کے ترقی کر جانے سے خرابی پیدا ہوتی ہے۔ تو اسکا پہلا اثر دل پر ہی ہوتا ہے۔ دل میں بُرے بُرے خیال اٹھنے لگتے ہیں۔ بدی کی طرف رغبت ہوتی ہے مگر فطرت اسکو دبا لیتی ہے۔ اگر یہ خیالات مضبوط ہو چکے ہوں تو آخر وہ غالب آجاتے ہیں اور دل میں بدی کی گرہ مضبوط طور پر پڑ جاتی ہے۔ اس پر پھر دوسرا درجہ بدی کا شروع ہوتا ہے اور یہ اعمال بد

کرنے لگتا ہے جنہیں لوگ نیک سمجھتے ہیں۔ اور ناپسند کرتے ہیں اور انکی طبائع پر اس کے یہ افعال گراں گزرتے ہیں مگر یہ افعال زیادہ تر ایسے ہی ہوتے ہیں جو اس کی ذاتی ناپاکی پر دلالت کرتے ہیں جیسے جھوٹ بولنا۔ بیہودہ بکواس کرنا اور اسی قسم کے اور اعمال اور ساتھ ہی یہ بھی بات ہوتی ہے کہ ابھی چند ہی بدیاں اسمیں پائی جاتی ہیں۔ بہت سی بدیوں کے ارتکاب سے یہ ڈرتا ہے اور اسکا دل ان پر جرأت نہیں کرتا۔ اور گو بعض بدیاں یہ لوگوں کے سامنے کرتا ہے مگر پھر بھی اپنے دل میں حجاب محسوس کرتا ہے اور اپنی غلطیوں کے یاد دلانے پر انکا اعتراف کر لیتا ہے۔

جب اس حالت پر خوش ہو جاتا ہے اور اس کی اصلاح کی فکر نہیں کرتا تو پھر یہ تیسرے درجہ پر جا پہنچتا ہے جسے بغی کہتے ہیں۔ یعنی لوگوں کو نقصان پہنچانا اور قوانینِ اخلاق کا کھلا کھلا مقابلہ۔

بغی کے معنے بغاوت کے ہیں اور اس درجہ سے یہی مراد ہے کہ اس موقع پر پہنچکر انسان گویا قوانینِ اخلاق سے بغاوت کرنے لگتا ہے۔ اور ان کی اطاعت کے جُوئے کو بالکل گردن پر سے اتار کر پھینک دیتا ہے۔ اور اپنی حالت پر فخر کرنے لگتا ہے۔ اور اسمیں اسکو لذت محسوس ہونے لگتی ہے اور اس کے دل پر ملامت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

اِن مدارج کے بیان کرنے سے اسلام نے طالبانِ اصلاح کے لئے کسقدر سہولت بہم پہنچا دی ہے۔ ہر اک شخص آسانی سے ان کے ذریعہ سے اپنی اخلاقی حالت کا موازنہ کر سکتا ہے۔ نیک حالت کا بھی اور بد حالت کا بھی اور پھر اسکی اصلاح کی فکر کر سکتا ہے یا ترقی کی طرف قدم بڑھا سکتا ہے۔ اور ہر حالت کا آدمی اپنے سامنے ایک مقصد پاتا ہے جسکو حاصل کرنے کے لئے کوشش کرنا اسپر گراں نہیں گزرتا اور وہ اس سے مایوس نہیں ہوتا مثلاً اگر کسی شخص کو جو گناہ میں اسقدر بڑھا ہوا ہو کہ اخلاق کے قوانین کا احساس بھی اسکے دل میں نہ رہا ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ تو ایسا نیک بن کہ نیکی تیرا جزو ہو جائے اور رات دن لوگوں کی بہتری کی فکر میں لگا رہ تو یہ بات اس کے لئے کیسی اجنبی اور پھر کیسی مایوس کن ہوگی۔ وہ تو اس مقصد کو سُنکر ہی گھبرا جائیگا اور مایوس ہو بیٹھیگا۔ لیکن اگر ہم اسے یہ کہیں کہ ہر ایک شخص جو نیکی کی طرف قدم

اٹھاتا ہے گویا نیکوں میں شامل ہوتا ہے۔ تُو اگر بدی کو چھوڑ نہیں سکتا تو کم سے کم اس امر کو محسوس کر کہ تُو بدی کر رہا ہے اور اس پر فخر نہ کر۔ تو یہ بات اس کے لئے زیادہ سہل الحصول ہوگی اور وہ بہت مستعدی سے اس کام پر لگ جائیگا۔ اور جب اسکے دل میں گناہوں پر شرم اور ندامت محسوس ہونے لگے تو ہم اسے کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ایک درجہ نیکی کا پالیا کیونکہ بڑی بدیوں کو چھوڑنا بھی ایک نیکی ہے۔ اور اس کی ہمت جو اس تبدیلی سے بہت بڑھ جائیگی اس کی مدد سے ہم اسے آگے بڑھانے کی کوشش کرینگے۔ اور کہیں گے کہ اگر تُو ابھی نیکی نہیں کر سکتا تو کم سے کم اپنے اعمال کو بدی سے بچا اور گو دل میں بُرے خیالات پیدا ہوں مگر اُن پر کاربند نہ ہو اور کم سے کم یہ کوشش کر کہ لوگوں کے سامنے تجھ سے افعال بد نہ ہوں تاکہ لوگوں کو تیرے بد اعمال دیکھ کر جو تکلیف ہوتی ہے وہ نہ ہو اور یہ کام اس کے لئے پہلے کام سے آسان ہوگا اور جب وہ اس کام کو بھی پورا کر لیگا تو اس کا حوصلہ اور بھی بڑھ جائیگا۔ اور گو اُس کا دل ابھی گندے خیالات کی آماجگاہ ہوگا۔ مگر کیا اسمیں کوئی شک ہے کہ ہم اسے بھی نیکی کے ایک درجہ پر قایم کہیں گے کیونکہ وہ نیکی کیطرف قدم مار رہا ہے اور اس نے بدیوں کا بہت سا حصہ چھوڑ دیا ہے تب ہم اسے اگلا قدم اٹھانے کی نصیحت کرینگے اور اسے کہیں گے کہ چاہیئے کہ اب تُو اپنے دل کو بھی پاک کر اور اس نجاست سے بھی بچ۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ اب اس کے لئے یہ قدم اٹھانا پہلے سے بھی زیادہ آسان ہوگا اور وہ اس کام کو کر لیگا۔ اور اسکا دل اس بچہ کی طرح صاف ہو جائے گا جس نے ابھی ہوش سنبھالا ہے۔ یا اس تصویری آئینہ کی طرح ہوگا جس پر ابھی کوئی نقش نہیں لیا گیا۔ تب ہم اسے عدل کا مقام حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائینگے۔ اور اسی طرح آہستگی کے ساتھ وہ اس مقام پر جا پہنچیگا جو اسکی استعداد اور ہمت کے مطابق ہے۔ مگر اس طریق کو چھوڑ دو اور تمہاری اصلاح کی ساری سکیم بالکل ملیا میٹ ہو جاتی ہے بلا ترتیب اور بلا خیال مدارج جو وعظ کیا جائیگا وہ کبھی بھی نیک نتیجہ نہیں نکالے گا۔ اس کی مثال یہ ہوگی کہ ہم ایک طالب علم کو جو ابھی الف بے بھی نہیں جانتا ایم اے کا کورس رٹوانا شروع کر دیں یا وبسٹر کی ڈکشنری اسکو حفظ کرانے لگیں۔ اور یہ خیال کریں کہ جب اسکو پڑ لیگا تو سب ہی کچھ پڑھ لیگا۔ حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ

وُہ اس طریق تعلیم کیوجہ سے کچھ بھی نہیں بڑھیگا۔ کچھ اصطلاحات اسکو یاد ہو جائیں گی مگر وہ صرف طوطے کی طرح رٹی ہوئی ہونگی اُن کا اثر اسکے دل پر کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اور اس کے اخلاق اس کی تعلیم کا نہیں بلکہ اس کے گرد و پیش کا نتیجہ ہونگے۔ جس میں وہ پرورش پایا ہے۔

قرآن کریم ترتیبی اور تدریجی تعلیم پر خاص طور پر زور دیتا ہے حتیٰ کہ فرماتا ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں ہوسکتا جس کی یہ تعلیم نہ ہو کہ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ ہو جاؤ ربانی۔ ربّانی کہتے ہیں اس شخص کو جو تعلیم دیتے وقت پہلے چھوٹے علوم سکھاتا ہے پھر بڑے۔ اور تدریج اور ترتیب کو مدِنظر رکھتا ہے۔ پس نبی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی امت کو اس امر کی تعلیم دے کہ وہ علاج روحانی کرتے وقت لوگوں کے مزاجوں اور لوگوں کی حالتوں کو دیکھ لیں اور انکی عادتوں اور ایسی سومات کو جو انمیں راسخ ہو چکی ہیں عمدگی سے چھڑائیں۔ اور ایسے علوم جن سے وہ کورے ہیں آہستگی سے سکھائیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یوں مختلف مسائل کا سمجھنا ہر اک شخص کے لئے آسان ہے پس سکھانے سے یہ مراد نہیں کہ بعض لوگوں سے بعض علوم کو مخفی رکھے بلکہ سکھانے سے مراد عمل کرانا ہے تاکہ ہر دفعہ ایک قریب کا مقصد سامنے ہو اور ہمت قایم رہے اور ایکدفعہ کی کامیابی دوسری اصلاح کے لئے اور بھی تیار کردے جس طرح کہ سب طالب علم جانتے ہیں کہ تعلیم کا کل زمانہ کتنا ہے مگر کورسوں اور تدریج اور جماعتوں کی ترتیب کیوجہ سے اور تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد نتیجہ نکلتے رہنے سے انکی ہمت بڑھتی رہتی ہے اور بوجھ کم معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ یہ محسوس کرتے رہتے ہیں کہ ہم ترقی کر رہے ہیں۔

مَیں بتا چکا ہوں کہ اسلام علاوہ اجمالی تعلیم کے اخلاق کے متعلق ایک تفصیلی تعلیم بھی دیتا ہے۔ اور ہر بُرے یا نیک خلق یا اقسام خلق کی تقسیم بتاتا ہے جس سے انکو اختیار کرنے یا چھوڑنے میں آسانی ہو لیکن چونکہ گنجایش اجازت نہیں دیتی میں اس اجمالی ترتیب پر ہی کفایت کرتا ہوں۔ کہ عقلمند کے لئے اسلام کی خصوصیات سے واقف ہونیکے لئے اِسقدر بھی کافی ہے۔

نیک اخلاق کو نیک یا بداخلاق کو بد کہنے کی وجہ

اِس مسئلہ کے متعلق بھی اسلام کی تعلیم اجمالی اور تفصیلی ہے۔ اجمالی تعلیم تو یہ ہے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ (ذاریات ع ۳) مَیں نے بڑوں اور چھوٹوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس غرض سے کہ وہ میری صفات کو اپنے اندر پیدا کریں پس اخلاق فاضلہ کے حصول کی پہلی غرض تو یہ ہے کہ اس کے بغیر اس منبع تقدیس سے انسان کو تعلق نہیں ہوسکتا جس کے بغیر انسان کی زندگی زندگی ہی نہیں ہے وہ شریر اور بدخلق کو پسند نہیں کرتا بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کی صفات پاکیزہ کو اپنے اندر پیدا کر کے اس کے سے ہو جائیں تا اس کا قرب حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝ (کہف ع ۱) ہم نے دنیا میں اعلیٰ سے اعلیٰ چیزیں پیدا کر کے انسان کو اسمیں مقرر کیا۔ تاکہ ہم دیکھیں کہ انسانوں میں سے کون زیادہ خوبصورت عمل کرتا ہے۔ یعنی کون کس قدر خدا تعالےٰ کی صفات کو اپنے اندر پیدا کرتا ہے پس اصل وجہ تو بعض اخلاق کو نیک کہنے کی یہی ہے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ کا پرتو اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اور بعض اخلاق کو بد کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ کے مخالف ہیں۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ جو روشنی سے حصہ نہ لیگا وہ تاریک ہوگا۔ اور جس جسقدر نور سے دُور ہوگا اسیقدر ظلمت اسپر طاری ہوگی۔ مگر اس اجمالی تعلیم کے علاوہ اسلام نے مختلف اخلاق کے متعلق تفصیلی وجُوہ بھی بیان کی ہیں جن سے لوگوں پر ان کے اچھے یا بُرے ہونیکی حالت کو منکشف کیا ہے تا لوگوں کو نیک اخلاق کی طرف رغبت پیدا ہو اور بداخلاق کی طرف سے نفرت ہو جنمیں سے بعض احکام کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

اعلیٰ اخلاق میں سے مَیں بیان کر چکا ہوں کہ ایک خلق رأفت کا برمحل استعمال ہے

جسے عفو کہتے ہیں۔ اس خلق کی وجہ علاوہ اوپر بیان کردہ وجہ کے قرآن کریم یہ بیان فرماتا ہے۔ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۞ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ (حٰم سجدہ ع ۵) جب کوئی شخص تیرے ساتھ بدی کرے اور تجھ پر ظلم کرے اور دکھ دے تو تو اس کے ساتھ نرمی اور عفو کا برتاؤ کر۔ کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لڑائی کی جڑ کٹ جائیگی اور وہ شخص تیرا گہرا دوست ہو جائیگا۔

کیا ہی لطیف اور جوش پیدا کرنے والی وجہ ہے۔ انسان سزا اس لئے دیتا ہے کہ اگر سزا نہ دونگا تو یہ شخص مجھے اور نقصان پہنچائیگا۔ گویا ضرر سے بچنے کے لئے یا دوسرے لوگوں کو ضرر سے بچانے کے لئے انسان سزا دیتا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے جو تعلیم ہم تجھے دیتے ہیں یعنی اگر عفو سے کسی انسان کی اصلاح ہوتی ہو تو اس وقت عفو کرنا چاہیئے۔ اگر تو اس پر عمل کریگا تو اس فائدہ سے جو تجھے سزا میں مدنظر رہتا ہے تجھے زیادہ فائدہ ہوگا۔ کیونکہ سزا دینے میں ضرر سے بچنے کی توقع ہے۔ تو برمحل عفو کے نتیجہ میں نفع کی امید ہے کیونکہ اغلب گمان ہے کہ وہ شخص اس سلوک سے متاثر ہو کر تیرا دوست اور مددگار بن جائے گا۔

اسی طرح احسان اور نیک سلوک اور لوگوں کی مدد کرنیکے متعلق فرماتا ہے اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (قصص ع ۸) تو لوگوں سے نیک سلوک کر اور ان کو اپنے مال اپنے علم اور اپنے رسوخ میں شریک کر۔ کیونکہ تجھ پر اللہ تعالےٰ نے احسان کیا ہے۔ یعنی جن قوتوں اور طاقتوں سے تو نے کمایا ہے۔ اور جن چیزوں کے ذریعہ سے تو نے کمایا ہے وہ اللہ تعالےٰ کی پیدا کردہ ہیں اور تجھے بطور احسان ملی ہیں۔ پس جس طرح تجھ پر احسان کیا گیا ہے تو بھی احسان سے کام لے۔ مطلب یہ ہے کہ زمین یا کانیں یا اور جو چیزیں انسان کے لئے مال یا علم حاصل کرنے میں ممد ہوتی ہیں وہ سب اس کی پیدائش سے پہلے کی موجود ہیں اور سب ہی بنی نوع انسان اس میں حق رکھتے ہیں۔ پس اگر کسی انسان کو اللہ تعالےٰ خاص موقع دے تو اسکے بدلہ میں اسکا فرض ہے کہ اس نعمت میں دوسرے بنی نوع انسان کو بھی شریک کرے۔

اسی طرح مثلاً ظلم سے روکنے کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ ظلم سے ظلم پیدا ہوتا ہے اور آخر سب ہی برباد ہوتے ہیں چنانچہ فرماتا ہے اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۞ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (اعراف ع ۷) ظلم نہ کرو کیونکہ اللہ تعالےٰ ظلم کو پسند نہیں کرتا۔ اور اس ذریعہ سے بعد اس کے کہ زمین میں امن قائم ہو چکا ہو فساد نہ کرو یعنی ظلم کا نتیجہ کبھی امن اور استحکام نہیں ہوگا۔ تم اگر ظلم اپنی طاقت کو بڑھانے کے لئے کرتے ہو تو یہ نتیجہ کبھی پیدا نہیں ہوگا کیونکہ ظلم طبائع میں جوش پیدا کرتا ہے اور لوگ اس کا مقابلہ کرنیکے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اگر ظاہر میں نہیں تو باطن میں اسکے خلاف تدبیریں کرتے ہیں۔ اور امن جو ساری طاقت کا منبع ہے وہ جاتا رہتا ہے۔

حسد کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ایاکم والحسد فانّ الحسد یأکل الحسنات کما تأکل النّار الحطب (ابوداؤد) حسد نہ کرو کیونکہ حسد انسان کے آرام کے سامان کو اسطرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے یعنی تم حسد تو اس لئے کرتے ہو کہ فلاں شخص کو مجھ سے زیادہ سکھ کیوں ہے؟ لیکن اس ذریعہ سے تم اپنے پہلے سکھ کو بھی برباد کر لیتے ہو اور اپنے آپکو اور دکھ میں ڈالتے ہو۔ پھر اس کام کا فائدہ کیا جو تم کو اور تکلیف میں ڈال دیتا ہے۔

لوگوں کو حقیر جاننے کے متعلق فرماتا ہے لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ (حجرات ع ۲) ایک قوم دوسری قوم کو حقیر نہ جانے کیونکہ زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ آج ایک قوم بڑی ہوتی ہے تو کل دوسری بڑھ جاتی ہے۔ آج ایک خاندان ترقی پر ہوتا ہے تو کل دوسرا ترقی کر جاتا ہے۔ اگر اس طرح ایک قوم دوسری کو حقیر جانے گی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جب وہ برسر حکومت آئیگی بوجہ پچھلے اشتعال کے پہلی قوم کو ذلیل کرنے کی کوشش کریگی۔ اور یہ ایک عجیب سلسلہ فساد کا پیدا ہوتا چلا جائیگا۔ حالانکہ جس فعل کا یہ نتیجہ نکلیگا وہ بالکل بیفائدہ ہے کیونکہ جب ترقی کا میدان بدلتا رہتا ہے تو ایک قوم کو کیا حق ہے کہ دوسروں کو حقیر سمجھے۔

زنا کے متعلق فرماتا ہے اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا وَسَآءَ سَبِيْلًا ۞ (نساء ع ۴)

اوّل تو یہ فعل فحش ہے یعنی اس سے دل میں ناپاکی پیدا ہوتی ہے کیونکہ جرم کا احساس اور چوری کا خیال دل میں پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے یہ اُس مقصود کے حصول کے لئے جس کے واسطے عورت اور مرد کے تعلقات قایم کئے جاتے ہیں غلط راستہ ہے کیونکہ شہوت کی اصل غرض تو بقائے نسل کی غرض کو پورا کرنا ہے۔ چونکہ نسل کو محفوظ رکھنا ضروری ہے اس لئے یہ خواہش انسان میں پیدا کی گئی ہے جو اسے اصل مقصود کیطرف مائل کرتی رہتی ہے اور ناجائز تعلقات سے تو اصل غرض برباد ہو جائیگی کیونکہ نسل محفوظ نہیں رہیگی یا مشتبہ ہو جائے گی پس اس راستہ سے تو اصل مقصد مل نہیں سکتا۔ اور اگر کبھی مل بھی جائے تو سیدھے راستہ کو ترک کر کے ٹیڑھا راستہ انسان کیوں اختیار کرے۔

بخل کے متعلق فرماتا ہے۔ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ (محمد ع ۴) یعنی بعض لوگ تم میں بخل کے مرتکب ہوتے ہیں حالانکہ بخل کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ جو بخل کرتا ہے اسکا ضرر اور نقصان اسی کی جان کو پہنچتا ہے یعنی نہ وہ اچھی غذا کھاتا ہے نہ اچھا لباس پہنتا ہے نہ عمدہ مکان میں رہتا ہے۔ روپیہ جمع کرتا چلا جاتا ہے جس سے سوائے روپیہ کی حفاظت کی فکر کے اسے فائدہ کوئی نہیں ہوتا واقع میں اگر غور کیا جائے تو جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ ہمیشہ اپنی جان کو ہی دکھ میں ڈالتے ہیں اور ان کا روپیہ خود انہی کے لئے وبال ہوتا ہے۔

اسی طرح اسلام نے تمام احکام کی علتیں بتائی ہیں اور لوگوں کے لئے اخلاق پر عمل کرنیکا دروازہ کھولدیا ہے مگر سب احکام کے متعلق تفصیلاً اسجگہ بیان کرنا ناممکن ہے یہی مثالیں کافی ہیں اور انکے بیان کرنیکے بعد میں سوال چہارم کو لیتا ہوں ٭

اخلاقِ حسنہ کے حصول اور اخلاقِ سیئہ سے بچنے کے ذرائع

یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ مذہب کا صرف یہ ہی کام نہیں کہ وہ اُن اخلاق کو بتائے جن سے انسان کو بچنا چاہیئے یا جن اخلاق کو اسے اختیار کرنا چاہیئے بلکہ اس کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ ایسے ذرائع مہیا کرے یا بتائے جن کی مدد سے انسان بداخلاق کو چھوڑ سکے اور نیک اخلاق اختیار کر سکے۔ کیونکہ بغیر اس مقصد کے حصول کے ہماری سب کوششیں رائگاں جاتی ہیں اور ہماری تحقیق ادھوری رہ جاتی ہے۔ دوسرے مذاہب کے لوگ اس سوال کا جو جواب دینگے سو دینگے۔ میں اسلام یا دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ احمدیت کی طرف سے نہایت خوشی کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ اسلام نے اس غرض کو خوب عمدگی کے ساتھ پورا کیا ہے۔

پہلا ذریعہ جو اسلام اخلاق کی درستی کے لئے تجویز کرتا ہے وہ صفاتِ الٰہیہ کا ظہور ہے جس کے بغیر انسان کامل اخلاق کو حاصل کر ہی نہیں سکتا کیونکہ انسان اپنے کاموں کی درستی کے لئے نمونہ کا محتاج ہے۔ نمونہ کے ذریعہ سے وہ اچھی طرح سیکھ سکتا ہے۔ خالی کتابی علم اسکو نفع نہیں دے سکتا۔ اگر نمونے دنیا میں موجود نہوں تو کل علوم دنیا سے مفقود ہو جائیں۔ کوئی شخص طب۔ انجینئرنگ۔ کمسٹری وغیرہ علوم کو محض کتابوں سے نہیں سیکھ سکتا۔ ایسے علم حاصل کرنے کے لئے ایسے نمونوں اور تشریح کرنیوالے آدمیوں کی ضرورت ہے جنکو دیکھکر یا جن سے پُوچھکر وہ اِن علوم کی باریکیوں کو دریافت کرے۔ جو حال باقی علوم کا ہے وہی اخلاق کا ہے۔ اخلاق بھی انسان کامل طور پر نہیں سیکھ سکتا جبتک کامل نمونہ اس کے سامنے موجود نہ ہو۔ اور جبتک ایسے نمونے بار بار

پیدا نہ ہوتے رہیں اور یہ نمونے ہوں بھی انسانوں میں سے۔ کیونکہ جو شخص انسانوں میں سے نہیں ہے وہ ہمارے لئے نمونہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انسان کا دل غیر انسان کے عمل پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ ایک درخت ایک پتھر کا کام نہیں کر سکتا۔ اسیطرح ایک انسان ایک غیر انسان کے نمونہ سے ہمت اور جرأت نہیں حاصل کر سکتا۔ پس ہمارا نمونہ انسانوں میں سے ہونا چاہیئے۔ اور بار بار ایسے نمونے آنے چاہئیں تاکہ تمام نسلوں کو ان کے اعمال اُن کے اعمال پر ڈھلنے کا موقع ملے۔ اسلام ان نمونوں کے بار بار آنیکا دعویٰ کرتا ہے چنانچہ فرماتا ہے یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (اعراف ع۴)
اے لوگو! جب تم میں سے میں رسول بھیجوں جو تمہیں میرے نشانات اور تائیدات سنائے تو جو شخص اسکو دیکھکر تقویٰ حاصل کریگا اور اسکے ساتھ مل کر دنیا میں اصلاح کرے گا اسپر نہ کوئی خوف ہوگا نہ غم۔

اسیطرح ان نمونوں کے علاوہ ایک اور نمونے جو ان سے درجہ میں کم ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی ایک پاک نمونہ ہوتے ہیں۔ انکی نسبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اسلام میں ہر صدی پر ایک ایسا نمونہ آتا رہیگا۔ آپؐ فرماتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِأَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا۔ (ابوداؤد جلد اول صفحہ ۲۴۲ مطبوعہ مجتبائی) اللہ تعالیٰ اِس اُمّت میں ہر صدی کے سر پر ایسے شخص بھیجتا رہیگا۔ جو دین کو نیا کرتے رہینگے۔ یعنی جو تعلیمات باطل انسانوں کی طرف سے شامل ہوتی رہینگی انکو دُور کرتے رہینگے۔ چنانچہ ایسے مجددین اسلام میں ہمیشہ ہوتے رہے ہیں۔ اور اسوقت جب کہ تاریکی بہت ہی بڑھ گئی ہے اسلام کی حفاظت اور رسول کریمؐ کے نمونے کے قیام کے لئے ایک **نبی مبعوث ہوا ہے** جس نے اپنے **نمونہ** سے ہزاروں لاکھوں کو **زندہ** کر دیا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو اصل میں یہی **ذریعہ** سب سے **اعلیٰ** اور **اکمل** ہے۔ اور دوسرے ذرائع اسکے مُمِد اور معاون تو ہو سکتے ہیں مگر اس کے قائم مقام نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ

اسکا اثر قطعی اور یقینی ہے اور ان کے اثرات بوجہ اس کے کہ ان کو استعمال کرنے میں ایسے لوگوں کا دخل ہے جو خود کامل استاد نہیں غلطی کا احتمال ہے مگر چونکہ اس ذریعہ کا مہیا کرنا انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہے اسلام نے اور ذرائع بھی بیان کئے ہیں جن سے اعلیٰ اخلاق پیدا کئے جا سکتے ہیں اور بُرے اخلاق کو دُور کیا جا سکتا ہے انہیں سے بعض ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

دوسرا ذریعہ جو اسلام نے انسان کو اخلاق پر قایم کرنے کے لئے تجویز کیا ہے وہ یہ ہے کہ اخلاق کو ان کی حقیقی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے جس کی وجہ سے اخلاق پر ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگ عمل کر سکتے ہیں چونکہ اس امر کو بھی ایک حد تک تشریح سے بیان کیا جا چکا ہے اس لئے اسجگہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

تیسرا ذریعہ اسلام نے یہ اختیار کیا ہے کہ اخلاق نیک کے اختیار کرنے اور بد اخلاق کے ترک کرنے کی عقلی اور علمی وجوہ بیان کی ہیں تاکہ علم کامل ہو اور اخلاق کے حصول کی کوشش کے لئے سچا جوش پیدا ہو سکے۔ اس کو بھی اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔

چوتھا ذریعہ جو اسلام نے اخلاق کی درستی کے لئے تجویز کیا ہے وہ اس کے نقطۂ نگاہ کا بدلنا اور اس کی مایوسی کو امید سے بدلنا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی بدیاں انسان سے اس لئے سرزد ہوتی ہیں کہ اس کے ذہن میں یہ بات جم جاتی ہے کہ وہ گناہ سے بچ ہی نہیں سکتا۔ جو قوم اس خیال کو اپنی نسل کے سامنے پیش کرتی ہے وہ اسے ہلاک کرتی ہے وہ اپنی آیندہ نسل کی دشمن ہے۔ جبتک کوئی شخص یہ یقین نہیں رکھتا کہ وہ ایک مقصد کو حاصل کر سکتا ہے وہ اس کے لئے پوری کوشش نہیں کر سکتا۔ جن قوموں میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ ہمارے باپ دادے سب کچھ دریافت کر چکے وہ قومیں ایجادیں نہیں کر سکتیں۔ اور جس قوم کو یہ خیال پیدا ہو جائے کہ اس میں ترقی کا مادّہ ہی نہیں وہ ترقی کی طرف قدم ہی نہیں اٹھا سکتی۔ اسی طرح جن لوگوں کے ذہن میں یہ خیال مستحکم ہو کہ ہم کمزور ہیں اور اخلاق نیک حاصل نہیں کر سکتے اور بدیاں ہماری گھُٹّی میں پڑی ہوئی ہیں اور پیدائش سے ہمارے ساتھ ہیں ہم کبھی ان پر فتح نہیں پا سکتے وہ قوم

گویا اپنے ہاتھوں سے خود ہلاک ہوئی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ پر خوب زور دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ کبھی کسی شخص کو مایوس نہیں کرنا چاہیئے چنانچہ آپ فرماتے ہیں اذا قال الرجل ھلک الناس فھو اھلکھم (رواہ مسلم مشکوٰۃ مطبوعہ مجتبائی صفحہ ۴۱۲) یعنی جب کوئی شخص کسی قوم کی نسبت کہتا ہے کہ وہ تو اب تباہ ہوگئی تو اس قوم کا ہلاک کرنیوالا وہی ہے۔ یعنی کوئی مادی مصیبت اور تباہی ایسی سخت نہیں جسقدر کہ کسی شخص کے دل میں اس خیال کا بیٹھ جانا کہ ترقی کا دروازہ اس کے لئے بند ہوگیا ہو اور وہ اب دوسروں کے سہارے پر جا پڑا ہے۔ یہ کیسی عظیم الشان صداقت ہے اور کسقدر وسیع اثر رکھنے والی ہے۔

خلاصہ یہ کہ طبیعت میں مایوسی اور نا امیدی انسان کو مقابلہ سے باز رکھتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے انسان ناکام اور نامراد ہو جاتا ہے۔ اسلام نے اس خیال کو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیا ہے اور اسطرح اخلاق میں ترقی کرنیکا راستہ انسان کیلئے کھولدیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (والتین ع ۱) یعنی ہم نے انسان کو اعلیٰ سے اعلیٰ طاقتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ نہایت ہی عمدہ اور قابل نشو و نما قوتوں کو لیکر دنیا میں آتا ہے۔ اسیطرح فرماتا ہے وَنَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىھَا فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰىھَا (سورۃ الشمس ع ۱) یعنی ہم نفس انسانی کو بطور شہادت کے پیدا کرتے ہیں۔ اور اسکی اعلےٰ درجہ کی اور بے عیب پیدائش کو بھی جس میں یہ خاص خوبی پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اسمیں ایسے مادے پیدا کر دیئے ہیں کہ وہ بدی اور نیکی میں تمیز کرنیکی توفیق رکھتی ہے۔

دیکھو کیسی اعلیٰ درجہ کی اور مطابق فطرت تعلیم ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ انسان ایک نہایت ہی پاکیزہ فطرت لیکر دنیا میں آتا ہے۔ جو کسقدر بھی ملوث ہو جائے پھر بھی اسکی اصل پاک ہے اسلئے اگر وہ نیکی کیطرف متوجہ ہو تو یقیناً اپنے عیوب کو دور کرنے میں اور نیکی کے حصول میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس تعلیم سے اسلام نے انسان کا نقطۂ نگاہ ہی بالکل بدل دیا ہے اور اسکی ہمت کو بلند کر دیا ہے۔ اسلام کے سوا باقی مذاہب

یا اس مسئلہ میں بالکل خاموش ہیں یا پھر انسان کو ایسے بوجھوں کے ساتھ اس دنیا میں پہنچاتے ہیں کہ وہ اپنے اعمال کے بغیر انہی کے بوجھ سے ڈوب جاتا ہے۔ مگر اخلاق کی درستی میں اگر کوئی تعلیم کامیاب ہو سکتی ہے تو وہی جو اسلام نے پیش کی ہے۔ اسی تعلیم سے انسان کے دل سے مایوسی کا اثر دور ہوتا ہے۔ اور یہی تعلیم اس کے حوصلے کو بڑھاتی ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں ایک بے داغ فطرت لیکر آیا ہوں اور اسکو مجھے پاک رکھنا چاہیئے نہ کہ ایک غلاظت آمیز طبیعت جس پر کچھ اور گند بھی لگ گیا تو کوئی پروا نہیں۔

مگر یہ تعلیم بھی کافی نہ تھی۔ پیدائش کا سوال ہی انسان کے راستہ میں روک نہیں ہے وہ پیدائش کے بعد عقل اور ہوش کے آنے تک کئی غلطیوں میں سے گزرتا ہے اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ راستہ کی لالچوں اور رذیل خواہشوں سے اپنی پاک فطرت کو ملوث کر لیتا ہے اگر ایسے شخص کے لئے کوئی علاج مقرر نہیں ہے تو پھر بھی ایک معقول حصہ دنیا کا ایسا رہیگا جو نیکی سے محروم رہجائیگا۔ کیونکہ وہ خیال کر لیگا کہ جب ایک دفعہ ہمیں ناپاکی لگ گئی تو اب ہمیں پاکیزگی کے لئے کوشش کرنے کی کیا ضرورت ہے پس جبتک یہ روک بھی دور نہو مذہب اخلاق حسنہ کو قائم کرنے اور بدی کے مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسلام دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اس روک کو دور کرتا ہے۔ اور ہمیں کوئی شک نہیں کہ وہ اس روک کو بہترین طور پر دور کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اُن خطاؤں کے اثر کو دور کرنے کے لئے جو انسان سے پہلے ہو چکی ہیں توبہ کا دروازہ کھولتا ہے جسے دوسرے مذاہب بند کرتے ہیں۔ اور اسے مایوسی کے پنجے سے بالکل چھڑا لیتا ہے کیونکہ جب انسان کو معلوم ہو جائے کہ اس کے لئے ترقی کا دروازہ کھلا ہے۔ اور یہ کہ اگر وہ اپنی اصلاح کرے تو پھر بھی اس پاکیزگی کو حاصل کر سکتا ہے جس پاکیزگی کو حاصل کرنا اسکا فرض مقرر کیا گیا ہے تو وہ ہمت کبھی نہیں ہارتا اور ہمیشہ اپنی اصلاح کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ اور جوئندہ یابندہ کی مشہور مثل کے ماتحت آخر کامیاب ہو ہی جاتا ہے۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ توبہ کا دروازہ کھولنے سے بدی کا بھی دروازہ ساتھ ہی کھل جاتا ہے اور بجائے اخلاق میں ترقی کرنیکے انسان بداخلاقی کے ارتکاب پر اور بھی

دلیر ہو جاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جب چاہونگا توبہ کرلونگا اور خدا سے صلح کرلونگا لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے چاہونگا توبہ کرلونگا کا خیال کبھی ایک عقلمند انسان کے دل میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اسے کیا معلوم ہے کہ میں کب مرونگا۔ اگر اچانک موت آجائے تو توبہ کس وقت کریگا؟

علاوہ ازیں توبہ کی حقیقت کو یہ لوگ نہیں سمجھے۔ توبہ کوئی آسان امر نہیں ہے اور انسان کے اختیار میں نہیں ہے کہ جب چاہے اپنی مرضی سے توبہ کرلے کیونکہ توبہ اس عظیم الشان تغیر کا نام ہے جو انسان کے قلب کے اندر پیدا ہوکر اسکو بالکل گداز کر دیتا ہے اور اس کی ماہیت کو ہی بدل ڈالتا ہے۔

توبہ کے معنے اپنے پچھلے گناہوں پر شدید ندامت کا اظہار کرنے اور آیندہ کے لئے پورے طور پر خدا سے صلح کرلینے اور اپنی اصلاح کا پختہ عہد کرلینے کے ہیں۔ اب یہ حالت یکدم کسطرح پیدا ہو سکتی ہے؟ یہ حالت تو ایک لمبی کوشش اور محنت کے نتیجہ میں پیدا ہوگی۔ ہاں شاذ و نادر کے طور پر یکدم بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر جب بھی ایسا ہوگا کسی عظیم الشان تغیر کے سبب ہوگا۔ جو آتش فشاں مادہ کی طرح اسکی ہستی کو ہی بالکل بدل دے۔ اور ایسے تغیرات بھی انسان کے اختیار میں نہیں ہیں پس توبہ کیوجہ سے کوئی شخص گناہ پر دلیر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ توبہ اصلاح کا حقیقی علاج اور مایوسی کو دور کرتی ہے اور کوشش اور ہمت پر اکساتی ہے۔ اور یہ دھوکا کہ توبہ گناہ پر اکساتی ہے محض عربی زبان کی ناواقفیت اور اسلامی تعلیم سے بے رغبتی اور اس خیال کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے کہ توبہ اس امر کا نام ہے کہ انسان کہدے کہ یا اللہ میرے گناہ معاف کر۔ حالانکہ گناہوں کی معافی طلب کرنیکا نام توبہ نہیں بلکہ استغفار ہے۔ توبہ گناہوں کی معافی طلب کرنیکو نہیں کہتے بلکہ گناہوں کی معافی سچی توبہ کا صحیح نتیجہ ہے۔

پانچواں ذریعہ جو اسلام نے انسان کے اخلاق کی درستی کے لئے تجویز کیا ہے وہ بظاہر پہلے ذریعہ کے مخالف نظر آتا ہے مگر ہے مؤید اور مطابق۔ اور وہ یہ ہے کہ اسلام نے اس بد اثر کو مٹانے کی کوشش کی ہے جو مخفی طور پر ماں اور باپ سے بچہ اخذ کرلیتا ہے۔ اس تعلیم کو پہلی تعلیم کے مخالف نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہ بالکل سچی بات ہے کہ

انسان پاکیزہ فطرت لیکر آتا ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ ماں باپ کے اثر کے ماتحت بعض بدیوں کے میلان کو بھی لیکر آتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ فطرت اور میلان میں فرق ہے۔ فطرت تو وہ مادہ ہے جسے ضمیر کہتے ہیں۔ یہ ہمیشہ پاک ہوتی ہے کبھی بد نہیں ہوتی خواہ ڈاکو یا قاتل کے ہاں بھی کوئی بچہ کیوں پیدا نہ ہو اس کی فطرت صحیح ہوگی۔ مگر ایک کمزوری اس کے اندر رہیگی کہ اگر اس کے والدین کے خیالات گندے تھے تو ان خیالات کا اثر اگر کسی وقت اس پر پڑے تو یہ انکو جلد قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائیگا جیساکہ مرضوں کا حال ہے کہ جو بیماریاں پختہ ہوتی ہیں اور جزو بدن ہو جاتی ہیں اُن کا اثر بچوں پر اس رنگ میں آجاتا ہے کہ ان بیماریوں کے بڑھانے والے سامان اگر پیدا ہو جائیں تو وہ اس اثر کو نسبتاً جلدی قبول کرلیتے ہیں۔ یہ اثر جو ایک بچہ اپنے ماں باپ سے قبول کرلیتا ہے ان خیالات کا نتیجہ ہوتا ہے جو ماں باپ کے ذہنوں میں اسوقت جوش مار رہے ہوتے ہیں جب وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ گو یہ اثر نہایت ہی خفیف ہوتا ہے اور بیرونی اثرات بھی اسکو بالکل مٹا دیتے ہیں مگر اسلام نے اس باریک اثر کو نیک بنانے کا بھی انتظام کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ ماں باپ کو نصیحت کی ہے کہ جس وقت وہ علیحدگی میں آپس میں ملیں تو یہ دعا کرلیا کریں۔ اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطٰنَ وَجَنِّبِ الشَّیْطٰنَ مَا رَزَقْتَنَا (مشکوٰۃ مطبوعہ مجتبائی ص۲۱۴) اے خدا ہمیں بد وساوس اور گندے ارادوں سے اور انکے محرک لوگوں سے محفوظ رکھ اور جو ہماری اولاد ہو اسکو بھی ان سے محفوظ رکھ۔

یہ دعا علاوہ اس اثر کے جو بحیثیت دعا کے اس میں پایا جاتا ہے ایک اور بہت بڑا اثر رکھتی ہے۔ اور وہ یہ کہ والدین کے ذہنوں میں یہ خیالات کی ایک نئی اور عمدہ رَو چلا دیتی ہے جس کی وجہ سے اگر ان کے عام خیالات پوری طرح پاک نہ بھی ہوں تب بھی اسوقت پاکیزگی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اوّل تو دعا اور اس مضمون کی دعا خود ہی خیالات کو نیکی کیطرف پھیر دیتی ہے۔ دوسرے دیکھا گیا ہے کہ والدین کو اپنی اولاد کی نسبت یہ بہت خیال ہوتا ہے کہ گو ہم بد ہیں مگر ہماری اولاد نیک ہو۔ گو بعض والدین

اسکے خلاف بھی ملتے ہیں مگر عام قاعدہ یہی ہے کہ والدین اپنی اولاد کو بد دیکھنا پسند نہیں کرتے پس اس قریباً طبعی خواہش کیوجہ سے جب والدین اپنی اولاد کی نسبت ایسی دعا کرینگے تو اُن کا قلب بہت ہی پاکیزہ تبدیلی حاصل کریگا۔ اور چونکہ بچہ پر قُدرتی طور پر اُسیوقت کے خیال اثر کر سکتے ہیں جسوقت بچّہ کے اجزاء باپ کے جسم سے علیحدہ ہوتے ہیں اور ماں سے پرورش حاصل کرتے ہیں اس لئے یہ دعا جو ماں باپ کے ملنے کے وقت کے لئے سکھائی گئی ہے اگر ماں باپ کے اندر کوئی ناپاکی ہے تو اس کے بداثرات سے بچّہ کو بچا لیگی۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صاف طور پر اس فائدہ کیطرف ان الفاظ میں اشارہ فرماتے ہیں فَاِنَّہٗ اِن تقدّر بینہما ولد فی ذٰلک لم یضرّہ شیطان ابدًا (مسلم مع شرح نووی جلد اول ص۴۶۳ کتاب النکاح) یعنی اللہ تعالےٰ ایسے بچوں کو جن کے والدین تعلق باہمی کے وقت یہ دعا پڑھ لیتے ہیں مسِّ شیطان سے بچاتا ہے۔ جس سے مراد آپ کی فقط یہ ہی کہ اُس شیطانی اثر سے بچاتا ہے جو ماں باپ سے منتقل ہو سکتا تھا نہ کہ کُلّی طور پر۔ کیونکہ اس دعا کا طبعی اثر ہرگز صحبتِ بد کے اثر سے یا اور دوسرے بداثروں سے نہیں بچا سکتا۔ باقی رہا اس دعا کا اثر بحیثیت دُعا کے تو وہ تو اُسوقت ظاہر ہوگا جبکہ یہ دعا اُس حد تک پہنچیگی جس حد تک پہنچکر دُعا قبولیت کا مقام حاصل کرتی ہے۔ ورنہ خالی الفاظ کے دہرا دینے سے وہ اثر ظاہر نہیں ہو سکتا۔

چھٹا ذریعہ جو اسلام نے اخلاق کی درستی کے لئے اختیار کیا ہے وہ اُن راستوں کو کھولنا ہے جن کے ذریعہ سے ایسی تحریکات دل میں داخل ہوتی ہیں جو نیکی کی طاقت کو اُبھارتی ہیں۔ اُنمیں سے بعض اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ جیسے مثلاً دعا ہے۔ عبادت ہے۔ روزہ ہے۔ ذکر الٰہی ہے۔ اسلئے اِن ذرائع کو اسجگہ دُہرانے کی ضرورت نہیں پس میں تین اور راستوں کا بطور مثال ذکر کرتا ہوں:۔

میں قرآن کریم کے اس حکم کو لیتا ہوں جو اس نے صُحبتِ نیک کے متعلق دیا ہے وہ فرماتا ہے كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ اے مُسلمانو اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھا کرو۔ یہ ثابت شدہ بات ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے گرد وپیش کے حالات سے متاثر

ہوتا ہے پس جو شخص اپنی صحبت کے لئے نیک لوگوں کو اور اخلاق والے لوگوں کو چُنے گا۔ وہ بہت جلد اپنے اندر ایک عجیب تبدیلی دیکھیگا جو اسے کھینچکر نیکی کی طرف لیجائیگی اور بد خیالات کے ترک کر دینے میں اسکو مدد دے گی۔ اسلام نے اسپر ایسا زور دیا ہے کہ ہمیشہ سے مسلمان اپنے وطن اور مال کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کی صحبت میں جا کر رہتے ہیں جو انکی طبائع پر نیک اثر ڈال سکیں اور انکی مقناطیسی تاثیر کی مدد سے اپنے لمبے سفر کو کوتہ کر لیتے ہیں اور اپنے شاہدِ مقصود کو پا لیتے ہیں۔

دوسرا راستہ جو اسلام نے نیکیوں کے حصول کے لئے کھولا ہے وہ احکام بھی ہیں جو حلال اور حرام سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ اسوقت تک دنیا نے اس عظیم الشان صداقت کو محسوس نہیں کیا کہ انسان کی خوراک کا اس کے اخلاق پر نہایت ہی گہرا اثر پڑتا ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ اس صداقت کو محسوس نہیں کیا بلکہ اس امر پر اسلام پر لوگ نکتہ چینی کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ امر بدیہیات سے ہے اور ہر روز اسکی صداقت کے نئے ثبوت ملتے جاتے ہیں۔ بہرحال دنیا کچھ بھی کہے قرآن کریم فرماتا ہے يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (مومنون ع ۴) اے رسولو! پاک اشیاء کھاؤ اس کے نتیجہ میں تم کو نیک عمل کرنے کی توفیق ملے گی۔

اس آیت سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیئے کہ اسمیں صرف نبیوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کا قاعدہ ہے کہ اسمیں نبیوں کو مخاطب کیا جاتا ہے اور مراد سب متبع ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا قاعدہ کے ماتحت اسلام نے کھانے پینے کے متعلق مختلف احکام دئے ہیں جنکو لوگ رسم خیال کرتے ہیں لیکن قرآن کریم مدعی ہے کہ وہ اپنے اندر عظیم الشان حکمتیں رکھتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ دنیا کے لوگ اسکو تو تسلیم کرتے ہیں کہ جمادات کی جو خصوصیات ہیں یا نباتات کی جو خصوصیات ہیں انکا اثر تو انسان پر پڑتا ہے مگر وہ اس امر کے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ حیوانات کا گوشت کھانے سے بھی کوئی اثر انسان پر پڑتا ہے۔ حالانکہ جس طرح اور چیزوں کا اثر انسان کی طبیعت پر پڑتا ہے ان کا بھی پڑنا چاہیئے اور کسی جانور

کے خاص اخلاق اس کے کھانیوالے میں ضرور پیدا ہونے چاہئیں۔ مگر میں امید کرتا ہوں کہ آپ جلد لوگ اس حقیقت کو قبول کر لینگے کیونکہ اب یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ بعض جانوروں کے کھانے سے انسان ننگا ہونیکی اور بعض کے استعمال سے اپنی طاقت کو ناجائز طور پر خرچ کرنے کی خواہش محسوس کرتا ہے۔ جب یہ علم اور ترقی کر گیا تو اسلام کا دعویٰ ثابت ہو جائے گا۔

خلاصہ یہ کہ مذکورہ بالا اصل کو تسلیم کر کے اسلام نے خوراک کے احکام کو ایک قانون پر مبنی رکھا ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ چونکہ انسان کو اپنے تمام طبعی جذبات کو بڑھانے کی ضرورت ہے اس لئے اسے ہر قسم کی غذائیں کھانی چاہئیں۔ سوائے اُن غذاؤں کے جن کے استعمال سے کوئی حد سے بڑھا ہوا ضرر جسمانی یا اخلاقی یا روحانی ہو۔ چنانچہ اسی وجہ سے اسلام نے یہ حکم دیا ہے کہ ترکاری بھی اور گوشت بھی دونو چیزوں کا استعمال کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بعض اخلاق نباتات کے استعمال سے ترقی کرتے ہیں اور بعض حیوانات کے استعمال سے۔ جیسے کہ حلم اور نرمی اور ذکاوت اور استقلال نباتات کے استعمال سے پیدا ہوتے ہیں لیکن شجاعت اور وقار اور ہمت اور غیرت حیوانات کے استعمال سے زیادہ ہوتے ہیں۔

پس اسلام نے ہر اک قسم کی غذاؤں کے استعمال کا حکم دیا ہے تاکہ سب کے سب جذبات انسان کے اندر نشو و نما پاتے رہیں۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے یٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (اعراف ع ۳ و ۴) اے مومنو! نیک اعمال کے حصول کیلئے تین باتوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ خدا تعالےٰ کی عبادت ظاہر اور باطن کو درست کر کے کرو۔ دوسرے یہ کہ ہر قسم کے کھانے اور پینے کی چیزوں کو استعمال کرو اور ایک ہی طرف زور نہ دیدو تاکہ ہر قسم کے طبعی تقاضے تم میں نشو و نما پائیں۔ تو اُن سے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ انسان کو ظاہری صفائی کیطرف توجہ نہیں کرنی چاہیئے۔ یا یہ خیال کرتے ہیں کہ انسان کو

باطنی صفائی کی طرف توجہ نہیں کرنا چاہیئے۔ یا یہ خیال کرتے ہیں کہ انسان کو ایک ہی قسم کی غذاؤں کے پیچھے پڑ جانا چاہیئے۔ کہدے کہ خدا کی پیدا کی ہوئی زینت اور اس کے عطا کئے ہوئے عمدہ اور پاک کھانوں کو منع کرنیوالے تم کون ہو۔

ہاں اس قاعدہ کے ساتھ کہ انسان کو ہر قسم کی غذائیں جو اسکے مختلف طبعی تقاضوں کو اُبھاتی ہیں استعمال کرنی چاہئیں یہ بھی حدبندی لگادی ہے کہ جو غذائیں جذبات کو ایسا اُبھارتی ہیں کہ انکو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے یا جو صحت یا عقل یا اخلاق یا دین پر بد اثر ڈالتی ہیں انکو استعمال نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ وہ اصل غرض کو بالکل باطل کر دیتی ہیں۔ اُن غذاؤں میں سے سب سے مقدم قرآن کریم نے مفصلہ ذیل چار غذاؤں کو رکھا ہے جو چاروں چار اصول پر مبنی ہیں:-

فرماتا ہے قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (انعام ع ۱۸) کہدے کہ میں تو اپنی وحی میں کھانیوالے پر حرام نہیں پاتا مگر یہ کہ جو مُردہ ہو۔ یا بہایا ہوا خون ہو۔ یا سُور کا گوشت۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک ضرر رسان ہے۔ یا وہ چیز حرام ہے جو دین سے انسان کو باہر نکال دیتی ہے اور بے غیرتی پیدا کر دیتی ہے۔ یعنی وہ چیز جسپر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام بلند کیا گیا ہو یعنی یا تو اسے کسی اور معبود کی خوشی کے خیال سے ذبح کیا گیا ہو یا خدا کے سوا کسی اور کا نام ذبح کے وقت لیا گیا ہو۔ پھر فرماتا ہے مگر جو مضطر ہو جائے اُسے کوئی اور کھانا نہ ملے۔ بشرطیکہ جان کے ایسے موقع پر نہ گیا ہو۔ یا کھاتے وقت ضرورت سے زیادہ نہ کھائے تو ایسا شخص اگر ان کھانوں کو کھالے تو اللہ تعالےٰ اُس کو ان کے بد اثرات سے بچا لیگا۔

اِس آیت میں تین چیزوں مردار اور خون اور سُور کے گوشت کو طبعی نقصانات کیوجہ سے حرام قرار دیا گیا ہے اور آخری چیز کو دینی نقصان کیوجہ سے۔ چنانچہ مردار اور خون تو بہت سے زہروں پر مشتمل ہے۔ اور مردار کی نسبت اغلب گمان یہی ہوتا ہے

کہ وہ بیماری یا زہر یا زہریلے جانوروں کے کاٹنے سے مرا ہو یا بالکل بوڑھا ہو کر مرا ہو۔ اور یہ سب حالتیں ایسی ہیں کہ انمیں جانور کا گوشت کھانے کی قابلیت سے باہر ہو جاتا ہے اور اگر کسی سخت صدمہ سے مرا ہو تب بھی آسمیں زہر پیدا ہو جاتا ہے پس درحقیقت کھانے کے قابل وہی گوشت ہوتا ہے جو ذبح کئے ہوئے جانور کا ہو۔ خون بھی زہروں پر مشتمل ہوتا ہے اور صحت کے لئے مُضر۔ سُوّر کا گوشت کئی عیب اپنے اندر رکھتا ہے۔ اوّل تو سُوّر کے گوشت میں بعض بیماریاں پائی جاتی ہیں۔ دوم یہ جانور طبعاً غلاظت پسند ہے۔ سوم اس جانور میں ایک اخلاقی نقص ہے جو اور کسی جانور میں نہیں پایا جاتا پس اسکا استعمال جسمانی اور اخلاقی دونو لحاظ سے مُضر ہے۔ مگر چونکہ خوراک کی مُضرتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ افسوس ہے کہ ابتک لوگ اس نقص کو محسوس نہیں کر سکے۔ مگر ہم یقین کرتے ہیں کہ وہ دن دُور نہیں ہے جب اس جانور کو خوراک کے جانوروں میں سے بالکل نکالدیا جائیگا۔ اور فطرت انسانی کو بے روک بڑھنے کا موقع دیا جائیگا۔

چوتھی چیز جو شرک کے طور پر ذبح کیجائے اور اس کے قربان کرنیکا باعث خدا تعالےٰ کے سوا اور ہستیوں کی خوشنودی کے حاصل کرنے کی خواہش ہو۔ چونکہ آسمیں خدائے وحدہٗ لاشریک کی ہتک کیجاتی ہے کہ اس کی صفات اور دوسری ہستیوں کو دیجاتی ہیں۔ اسلئے اسکو استعمال کرنا انسان کو بے غیرت بناتا ہے بلکہ درحقیقت ایسے جانور کو کھانا دلی ناپاکی اور بے غیرتی کی علامت ہے۔ پس اسلام نے اسکو بھی حرام کیا ہے۔

مذکورہ بالا چیزوں کے علاوہ جنہیں ممتاز طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اور بعض اشیاء بھی ممنوع قرار دیگئی ہیں اور انکی مناعی کی حکمت بھی وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ یعنی جسمانی یا اخلاقی نقصان۔ چنانچہ اسلام درندے جانوروں اور شکاری پرندوں اور اندھیرے اور غلاظت میں رہنے والے جانوروں اور حلال جانوروں میں سے غلاظت کا استعمال کرنیوالے جانوروں کا گوشت منع کرتا ہے۔ پینے کی چیزوں میں سے شراب کو حرام فرمایا ہے کیونکہ یہ عقل پر پردہ ڈالتی اور باریک اعصاب کو جو ذہانت اور علم کو ترقی دینے والے ہیں صدمہ پہنچاتی ہے۔ اور گو اسلام اقرار کرتا ہے کہ شراب میں بعض فائدے بھی ہیں مگر فرماتا ہے

کہ اسکا نقصان اس کے فائدے سے زیادہ ہے اسلئے اسکو بالکل ترک کر دینا چاہیئے۔

غرض اسلام نے اخلاق پر خوراک کے اثر کو قبول کیا ہے اور اسکو خاص قیود اور شرائط سے محدود اور مشروط کر کے اخلاق کے حصُول کا ایک نیا دروازہ کھولدیا ہے۔ اور صرف وہی غذائیں استعمال کرنیکی اور اسی مناسبت سے استعمال کرنیکی اجازت دی ہے جن سے اور جس حد تک ان سے اخلاق پر نیک اثر پڑتا ہے۔

تیسرا راستہ نیک اخلاق کے حصول کا اسلام نے یہ تجویز کیا ہے کہ بچپن سے بچہ کے دل پر نیک باتوں کا اثر ڈالا جائے۔ درحقیقت اس نکتہ میں اسلام سب ادیان سے منفرد ہے۔ عام طور پر لوگوں نے یہ سمجھا ہوا ہے کہ شریعت کا اثر بچّہ کے بالغ ہونے سے شروع ہوتا ہے۔ مگر اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ بیشک جب بچہ بالغ ہوگا تبھی سے اسپر شریعت کی حجت ہوگی مگر جو باتیں کہ عادت اور مزاولت سے تعلق رکھتی ہیں جبتک بچپن سے انکی طرف بچہ کو توجہ نہ دلائی جائے گی وہ اُن پر آسانی سے کاربند نہ ہو سکیگا اور ہمیشہ وہ اسے دوبھر معلوم ہونگی۔ علاوہ ازیں اسلام ہمیں بچہ کی تربیت کا زمانہ وہ نہیں بتاتا جب بچّہ کچھ ہوش والا ہو جاتا ہے بلکہ وہ ہمیں اس سے بہت پہلے لے جاتا ہے یعنی اس کی پیدائش کے وقت تک۔ چنانچہ اسلام حکم دیتا ہے کہ جسوقت بچہ پیدا ہو اُسی وقت اُس کے کان میں اسلام کے احکام جو اذان میں بیان ہیں ڈالے جائیں دائیں طرف بھی اور بائیں طرف بھی۔ اور اس میں علاوہ اور حکمتوں کے یہ حکمت بھی ہے کہ بعض دفعہ بچہ ایک کان سے بہرا ہوتا ہے۔ پس دونو طرف کان میں ان آوازوں کو ڈالنے سے وہ بہرحال سُن لیگا سوائے اس صُورت کے کہ وُہ بالکل بہرا ہو۔

یہ حکم بظاہر ایک رسم معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت اسمیں دو بڑے فوائد مخفی ہیں۔ ایک تو والدین کو یہ توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ پیدائش سے بچّہ کے کان میں نیک باتیں ڈالنے لگیں۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ جو والدین اسلام کے حکم کی حقیقت کو سمجھیں گے وہ بچہ کی تربیت کو اس کی پیدائش کے زمانہ سے ہی شروع کریں گے۔ یہ بالکل عقل کے خلاف ہوگا کہ وہ اس کے پیدا ہونے پر تو اس کے کان میں اسلام کے احکام ڈالیں لیکن پھر جب

وُہ بڑھنا شروع کرے تو اُسے چھوڑ دیں حتیٰ کہ کئی سال گزرنے پر پھر اسکی تربیت شروع کریں۔ بچہ بروز عقل میں ترقی کرتا ہے جس بچّہ کو پیدائش کے وقت نیک باتوں کی تلقین کرنیکا ہمیں حکم دیا گیا ہے اسکو بعد میں تلقین کرنے کا حکم پہلے سے بھی زیادہ سخت ہونا چاہیئے پس اس حکم میں درحقیقت والدین کو نصیحت ہے۔

دوسرا اہم فائدہ اس حکم میں یہ ہے کہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ بچہ میں سمجھنے کی عقل تدریجی ہے۔ اور اسکا زمانہ پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ درحقیقت وہ حالت جس کو لوگ سمجھ اور ہوشیاری کی حالت کہتے ہیں وہ یکدم کہیں سے نہیں آجاتی وہ اسی علم سے پیدا ہوتی ہے جو بچہ پیدائش کے وقت سے جمع کر رہا تھا اور اس کے دماغ پر سے کوئی اثر اس کی پیدائش کبوقت سے مٹتا نہیں بلکہ نقش رہتا ہے اور خود گو بھلا یا جائے۔ مگر اپنا ورثہ عقل اور فہم کی صورت میں انسان کے پاس چھوڑ جاتا ہے۔ چنانچہ تجربہ اس امر پر شاہد ہے کہ بعض ایسے واقعات معلوم ہوئے ہیں کہ بعض آدمیوں پر اعصابی کمزوری کا حملہ ہو کر وہ خود رفتہ ہو گئے اور انہوں نے ایسی زبانیں بولنی شروع کر دیں جو ان کو معلوم نہ تھیں۔ سُننے والوں نے اسکو غیر معمولی قرار دیا مگر آخر معلوم ہوا کہ وہ جو کچھ بولتے تھے وہ چند سُنی ہوئی باتیں تھیں جو انہوں نے نہایت بچپن کی حالت میں جبکہ وہ پنگھوڑے میں پڑے ہوئے تھے ان زبانوں کے بولنے والوں سے سُنی تھیں جب دماغ کے حصہ مؤثرہ میں نقص پیدا ہو گیا تو حصہ متأثرہ کام کرنے لگا اور اس کے پرانے نقش سامنے آنے لگ گئے۔ غرض اسلام کی یہ تعلیم نہایت ہی حکمت پر مبنی ہے اور اسپر عمل کر کے دنیا کے اخلاق کی درستی بہت عمدگی سے ہو سکتی ہے۔

ساتواں دروازہ جو اسلام نے اخلاق کی درستی کے لئے تجویز کیا ہے وہ اُن دروازوں کا بند کرنا ہے جن سے گناہ پیدا ہوتا ہے۔ مَیں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ اسلام کے اصُول کے مطابق بدی باہر سے پیدا ہوتی ہے ورنہ انسان کا دل نیک ہے یعنی انسان کو ایک ایسی ضمیر دیگئی ہے جو اِس امر کو پسند کرتی ہے کہ نیکی کی جائے اور بدی سے اجتناب کیا جائے۔ تمام کے تمام انسان خواہ وہ کسی مذہب و ملّت کے ہوں وہ اِسی فطرت کو

لیکر آتے ہیں مگر خالی اس طاقت سے انسان کا کام نہیں چل سکتا۔ کیونکہ ضمیر تو صرف اسکو یہ بتاتی ہے کہ نیکی کر اور بدی سے بچ۔ باقی سوال یہ رہجاتا ہے کہ فُلاں کام نیک ہے یا فلاں بد اسکا فیصلہ عقل کرتی ہے اور عقل کے فیصلوں کی بُنیاد اُن علوم پر ہوتی ہے جو انسان اپنے حواس کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ پس اگر ان خارجی اثرات کے قبول کرنیں انسان غلطی کر بیٹھیگا تو لازماً وہ نیکی اور بدی کی تعریف میں بھی غلطی کریگا۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی ضمیر بھی دھوکا کھائے گی۔ اور چونکہ وہ نیک کاموں کو بد سمجھیگی اُن پر اسے ملامت کریگی۔ اور چونکہ بد کو نیک سمجھیگی ان پر اسکی تعریف کریگی۔ پس یہ ضروری ہے کہ ان بد اثرات کو جنہیں انسان قبول کرتا ہے روکا یا کم کیا جائے۔ اسی طرح جو فوری جوش انسان کو بدی کا پیدا ہوتا ہے اسکا محرک بیرونی ہوتا ہے اسکا روکنا بھی ضروری ہے کیونکہ اگر وہ رک جائے تو پھر انسان اپنے نفس پر قابو پالیتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کو جو شراب پیتا ہے وہ اُسیوقت بیتاب ہوتا ہے جب لوگوں کو شراب پیتے ہوئے دیکھتا ہے یا اُن چیزوں کو دیکھتا ہے جو شراب کے پینے یا رکھنے میں مستعمل ہوتی ہیں۔ یا اُن وقتوں پر اسے اسکا خیال آتا ہے جن وقتوں میں وہ شراب پیا کرتا تھا۔ اب اگر ایک شخص کو ایسی جگہوں سے الگ رکھا جائے اور ان چیزوں کو جو اسے شراب کی یاد دلائیں اس کے سامنے سے دُور رکھا جائے تو یقیناً کچھ مدت میں اسکی عادت جاتی رہیگی۔ اور یہ اپنے نفس پر قابو پالیگا۔

اسلام نے اس حقیقت کو اپنے احکام میں مدِنظر رکھکر ایسے احکام دیئے ہیں جن سے اُن راستوں کو بند کر دیا ہے جن سے بدی یا بدی کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ ایسا علم النفس کا مسئلہ جس کے پیش کرنے سے اسلام نے دنیا پر اپنے احسانات میں مزید اضافہ کیا ہے لوگوں کی مخالفت کے بڑھانے کا سب سے بڑا آلہ ثابت ہوا ہے۔ اور وہ لوگ بھی اسکی حقیقت کو ابھی نہیں سمجھے جو علم دوست اور سچائی کے متلاشی ہیں۔

اِن تمام تعلیمات کا بیان کرنا جن سے اسلام نے گناہ کے دروازوں کو بند کیا ہے مشکل امر ہے مگر مَیں چند مثالیں اسکی پیش کرتا ہوں:۔

پہلی مثال اس قسم کے احکام کی وہ احکام ہیں جو اسلام نے عفت کے قیام

کے لئے دئے ہیں۔ چنانچہ اسلام صرف دوسرے مذاہب کیطرح یہ نہیں کہتا کہ تو زنا نہ کر۔ کیونکہ زنا نہ کر کوئی ایسا حکم نہیں جس کے سننے کے ہم محتاج ہوں۔ سوال یہ ہے کہ کس طرح انسان زنا سے بچے؟ اسلام اسکا جواب یہ دیتا ہے کہ تو اس گناہ کے دروازے بند کر کے اس سے بچ سکتا ہے اور وہ دروازے آنکھ۔ کان اور جِلد ہیں۔ کیونکہ زنا کی تحریک انسان کو انہی دروازوں سے ہوتی ہے۔ جب کوئی انسان حُسن کو دیکھتا ہے یا حُسن کی تعریف کو سنتا ہے یا خوبصورت آواز سنتا ہے یا ایک نرم اور ملائم جسم کو چھوتا ہے تو اگر وہ حُسن یا اس کا ذکر یا آواز یا جسم اس کی خواہش کیمطابق ہوتا ہے تو اسکو اس کی طرف رغبت پیدا ہو جاتی ہے اور نتیجہ وہ انتہائی قرب ہوتا ہے جسے کل دنیا کی عقلوں نے اخلاق اور سوسائٹی کے لئے ایک خطرناک زہر قرار دیا ہے پس اسلام نے اس دروازہ کو بند کرنیکے لئے حکم دیا ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۖ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (نور۔ ع ۴)

مومنوں کو کہدے اپنی آنکھوں کو نیچی رکھا کریں اور ان تمام راستوں کی جن سے بدی کا خیال داخل ہوتا ہے حفاظت کیا کریں یہ انکے لئے بہت ہی نیکی پیدا کرنے کا موجب ہوگا۔ اللہ تعالے اسکو خوب جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ اسیطرح مومن عورتوں سے کہدے کہ وہ اپنی آنکھوں کو نیچا رکھیں اور تمام ان راستوں کو جن سے بدی کا خیال داخل ہوتا ہے محفوظ

رکھیں اور اپنی زینت کو لوگوں پر ظاہر نہ کریں سوائے اس کے کہ جو خود بخود ظاہر ہو اور چاہیئے کہ اپنی گردن۔ سر اور منہ کو کپڑے سے ڈھانکیں اور اپنی زینت کو سوائے اپنے خاوندوں یا اپنے باپ دادوں یا اپنے خاوندوں کے باپ دادوں یا اپنی اولاد یا اولاد کی اولاد یا اپنے خاوندوں کی اولاد یا ان کی اولاد یا اپنے بھائیوں یا اپنے بھائیوں کی اولاد یا بہنوں کی اولاد یا عورتوں یا غلاموں یا ایسے ملازم مردوں کے جو بالکل بوڑھے ہیں یا جن میں شہوانی مادے نہیں پائے جاتے یا بچوں کے جو ابھی تک بقائے نسل کے تعلقات سے واقف نہیں کسی پر ظاہر نہ کریں اور چاہیئے کہ ایسے طور پر پیر نہ ماریں کہ اُن کی مخفی زینت اس سے ظاہر ہو۔ اور اے مومنو! تم سب لوگ اللہ تعالے کی طرف توجہ کرو تاکہ کامیاب ہو جاوٴ۔

اِن آیات میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اُن تمام راستوں کو مرد اور عورت بند کریں جن سے گناہ کی تحریک انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ ان راستوں میں سے پہلا راستہ آنکھ ہے اس کے متعلق حکم دیا کہ نظر کو نیچا رکھیں۔ دوسرا راستہ کان ہے۔ ان کے متعلق حکم دیا کہ عورت مرد اور مرد عورت کی آواز راگ وغیرہ کے طور پر نہ سُنے اور بلاوجہ اور بے تعلق عورتوں یا مردوں کے حسن کے قصے اور واقعات نہ سُنیں۔ تیسرا راستہ جِلد ہے۔ اس کے متعلق حکم دیا کہ ایک دوسرے کو بلاوجہ اور بلا ضرورتِ طبعی چھوئیں نہیں۔ چونکہ آنکھیں نیچی رکھنے کا فعل ایسا ہے کہ ایسے مقامات پر جہاں مرد اور عورت ضرورتاً جمع ہوتے ہوں۔ جیسے کہ شارع عام ہے مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے عورتوں کو کہا کہ جب وہ باہر نکلیں تو اپنے سروں سینوں اور منہ کے ایسے حصوں کو ڈھانپ لیں جو راستہ دیکھنے کے کام یا سانس لینے کے کام نہیں آتے۔

یہ احکام ایسے باحکمت ہیں کہ اگر کوئی بلا تعصّب اور بے تعلق ہو کر ان پر غور کرے تو انکی خوبی کا اقرار کئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا کیونکہ اِن سے بدیوں کا قلع قمع کر دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ کے لوگوں پر بوجہ انکی عادات اور قدیم رسوم کے یہ خیالات شاق گزرتے ہیں۔ مگر ان کی حیرت اور گھبراہٹ صرف اور صرف عادات اور رسوم کے سبب سے ہے ورنہ ان احکام پر عمل کرنا مرد اور عورت کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں۔

اسلام ہرگز یہ حکم نہیں دیتا کہ عورتیں گھروں میں بند ہو کر بیٹھ جائیں۔ ابتدائے اسلام میں ہرگز مسلمان عورتیں ایسا نہیں کرتی تھیں بلکہ وہ جنگوں میں شامل ہوتی تھیں زخمیوں کی مرہم پٹیاں کرتی تھیں۔ علوم مردوں سے پڑھتی تھیں اور مردوں کو پڑھاتی تھیں۔ سواری کرتی تھیں غرض انکو پوری عملی آزادی حاصل تھی صرف اس امر کا انکو حکم تھا کہ اپنے سر۔ گردنیں اور منہ کے وہ حصے جو سر اور گردن کے ساتھ وابستہ ہیں انکو ڈھانپے رکھیں۔ تا وہ راستے جو گناہ پیدا کرتے ہیں بند رہیں۔ اور اگر اس سے زیادہ احتیاط کر سکیں تو نقاب اوڑھ لیں لیکن یہ کہ گھروں میں بند رہیں اور تمام علمی کاموں سے الگ رہیں۔ یہ نہ اسلام کی تعلیم ہے اور نہ اس پر پہلے کبھی عمل ہوا ہے۔ جو پردہ آجکل مسلمانوں میں اکثر ممالک میں نظر آتا ہے۔ یہ سیاسی پردہ ہے۔ یعنی چونکہ بہت سے ممالک میں عورتوں کی عزت صرف روپیہ قرار دیگئی ہے جو عورت کی خطرناک ہتک ہے اس لئے مسلمانوں نے سیاستاً ایسے ممالک میں اپنے لئے بعض ایسی قیدیں لگالی ہیں جو انکی عزت اور عصمت کی حفاظت کریں نہ اس لئے کہ انکا مذہب ایسا حکم دیتا ہے۔

میں نے سُنا ہے کہ بعض لوگ اس حکم کو عورت کی ہتک کرنیوالا خیال کرتے ہیں۔ مگر مجھے اس پر تعجب ہے، اس لئے کہ پردہ آنکھیں نیچی رکھنے کے حکم کے لئے ایک ظاہری تدبیر ہے اور اس حکم میں مرد اور عورت دونو کو شریک کیا گیا ہے پس اگر ہتک ہے تو دونو کی ہے نہ کہ عورت کی۔ کیونکہ حکم ایک کے لئے نہیں بلکہ دونو کے لئے ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ عورت کو کیوں پردہ کیلئے کہا گیا ہے مرد کو کیوں نہیں کہا گیا ؟ تو اسکا جواب یہ ہے کہ اسلام مرد اور عورت کے کام کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ عورت کا کام بچوں کی تربیت ہے اور مرد کا کام ان کے لئے سامانِ معیشت بہم پہنچانا ہے۔ مرد کو اس کے کام کی نوعیت کیوجہ سے باہر رہنا پڑتا ہے پس مرد کا دائرۂ عمل بازار اور سڑکیں ہیں اور عورت کا دائرۂ عمل اسکا گھر ہے۔ اور شریعت نے ہر ایک کو اپنے دائرۂ عمل کی جگہ میں آزاد کیا ہے اور دوسرے پر کچھ قیدیں لگادی ہیں۔ مرد کو حکم ہے کہ جب وہ کسی کے گھر میں گھسے تو پہلے اجازت لے اور پھر جائے کیونکہ وہ عورتوں کی آزادی کی جگہ ہے۔ عورت کو باہر نکلنے پر مردوں سے اجازت لینے کا حکم نہیں دیا بلکہ صرف اسقدر احتیاط کر لینے کا حکم دیا ہے جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعتِ اسلام اس امر کو تسلیم کرتی ہے

کہ جس طرح مرد گھر سے بے تعلق ہے اسیطرح عورت سڑکوں اور بازاروں سے بے تعلق نہیں اس لئے مرد پر اجازت کی شرط جو زیادہ سخت ہے لگائی گئی اور عورت پر صرف اپنے ایک حصہ کو ڈھانک لینے کی۔ پس پردہ میں ہتک یا غیر ہتک کا کوئی سوال نہیں بلکہ اخلاقی ترقی کا یہ ایک زرین ذریعہ ہے اور اسکی مخالفت صرف بوجہ عادات اور رسوم ہے ورنہ میں نے ایسی عورتیں دیکھی ہیں جنہوں نے پردہ شروع کر دیا ہے اور وہ اس میں کوئی بھی تکلیف یا بے آرامی محسوس نہیں کرتیں سوائے ابتدائی چند دنوں کی شرم یا بے آرامی کے جو طبعاً ہونی چاہیئے۔

دوسری مثال بدی کے رستے بند کرنے کی شریعتِ اسلام کا میانہ روی کا حکم ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ طبعی جذبات کے کُلّی طور پر روک دینے سے وہ بغاوت کرتے ہیں اور آخر سب روکوں کو توڑ دیتے ہیں۔ طبعی جذبات کی مثال بالکل اس دریا کی ہے جس میں کبھی کبھی پانی اس کے پھیلاؤ سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ اگر ہم بند لگا کر اس پانی کو استعمال کر لیں تو یہ ہمارے لئے فائدے کا موجب ہو جاتا ہے اگر یہ نہ کریں تو آخر وہ بے موقع ٹوٹتا ہے۔ اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ مسلمان کو اپنے تمام کاموں میں میانہ روی کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ یہ نہیں کہ ایک ہی طرف کا ہو جائے۔ اگر وہ ایک طرف کا ہو جائیگا تو ضرور اسکے طبعی جذبات زور کر کے کناروں پر سے بہ پڑیں گے۔ مثلاً یہ کہ رہبانیت اختیار کرے۔ یا اپنے سب مال کو لوگوں میں تقسیم کر دے اور اپنے اور اپنے بیوی بچوں کی ضرورت کے لئے کچھ نہ رکھے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے شہوانی جوش کسی وقت اسکو اس کے پاؤں پر سے اٹھا کر لے جاویں گے اور یہ حلال طریق کو چھوڑ کر حرام میں مبتلا ہوگا۔ یا یہ ہوگا کہ اسکی ضروریات خورد و نوش چونکہ سب مال کے لُٹا دینے سے باطل نہیں ہو جائینگی۔ یہ اپنا مال لُٹا کر یا سوال کرنے پر مجبور ہوگا جو بذاتِ خود ناپسند ہے اور یا پھر چوری اُچکا پن کی طرف مائل ہوگا اور بجائے نیکی میں ترقی کرنیکے گناہ کا مرتکب ہوگا پس شریعت اسلام نے یہ حکم دیکر کہ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (بقرہ ع ۱۷) ہم نے تمہیں ایسی قوم بنایا ہے جس کے سب کام میانہ روی پر مبنی ہیں۔ اُن دروازوں کو جو گناہ کے ہیں بند کر دیا ہے۔

ایک راستہ بدی کا رسم اور عادات ہیں۔ بہت سی بدیاں انسان اسوجہ سے کرتا ہے کہ اسے اسکی عادت کے پورا کرنے کا سامان نہیں ملتا یا رسوم کیوجہ سے وہ بدی کرنے پر مجبور ہوتا ہے

مثلاً اس کے پاس روپیہ کافی ہوتا نہیں اور ملک کی رسم چاہتی ہے کہ خاص قسم کا لباس پہنے وہ اس رسم کا مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے بدی اور گناہ سے روپیہ کماتا ہے۔ اسلام نے ان دونوں راستوں کو بند کر دیا ہے رسموں کو بھی اور عادتوں کو بھی۔ عادتوں کو تو اس طرح کہ جسقدر کھانے پینے کی چیزیں ایسی ہیں کہ وہ عادی بنا دیتی ہیں انکو منع فرما دیا ہے۔ چنانچہ شراب اسکی پہلی مثال ہے جو بطور نظیر کے ہے ورنہ ہر اک چیز جو نشہ پیدا کرتی یا انسان کی طاقت کو ساکن کر کے ایک لذت کی حالت پیدا کر دیتی ہے اور آخر انسان کو اپنا عادی بنا لیتی ہے۔ ان سے اسلام منع کرتا ہے۔ رسوم کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ ایک بوجھ ہیں جنکو قومی خوف کی وجہ سے انسان اٹھاتا ہے ورنہ وہ بوجھ طاقت سے بڑھ کر ہیں کیونکہ انمیں غریب اور امیر مقروض اور آزاد کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اور لوگوں کو مجبور کیا گیا ہے کہ وہ اپنی خیالی عزت کی حفاظت اور اپنے ہم چشموں میں ذلیل نہ ہونے کی غرض سے گناہ اور بدی میں مبتلا ہوں اور ظاہر کیخاطر باطن کو تباہ کر لیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی ایک غرض ہی یہ بیان فرماتا ہے کہ یَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اعراف ع ۱۹) یہ نبی حکم دیتا ہے اچھی باتوں کا اور روکتا ہے بُری باتوں سے یعنی کامل شریعت لایا ہے۔ پھر فرماتا ہے۔ یہ رسولؐ حلال کرتا ہے پاک اور نفع رساں چیزوں کو اور حرام قرار دیتا ہے اُن چیزوں کو جو بیفائدہ ہیں۔ یعنی اس کی شریعت بطور چٹی اور سزا کے نہیں بلکہ ہر اک حکم اپنے اندر کوئی نفع یا ازالۂ ضرر رکھتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ جنکو یہ اتار ہی نہ سکتے تھے اگر اتارتے تو سزا ملتی اتارتا ہے۔ یعنی رسوم جو کہ بوجھ بھی ہوتے ہیں مگر باوجود اس کے انسان ان کو اتار نہیں سکتا۔ کیونکہ جانتا ہے کہ قوم ناراض ہو جائیگی اور رہنا بھی مشکل ہو جائیگا۔ پھر فرماتا ہے کہ اور یہ رسولؐ وہ طوق اتارتا ہے جو انہوں نے پہنے ہوئے تھے یعنی اُن عادات کو دور کرتا ہے جو بطور رسم کے تو نہ تھیں لوگ تو ان کے ترک کرنے پر سزا نہیں دیتے تھے مگر یہ خود ان کو اتارنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ دیکھ لو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح ایک ایسی قوم میں سے جو شراب کی ایسی عادی تھی کہ آدھی رات کو اُٹھ کر شراب پینا شروع کرتی تھی اور عشاء کیوقت تک شراب پیتی ہی جاتی تھی

ایک حکم سے شراب کو مٹا دیا اور اس طرح مٹایا کہ پھر شراب نے بطور قومی شربت کے قدم نہ رکھا۔ اب اسوقت سائنس نے اسکی مضرتوں کو بہت ہی واضح کر دیا ہے اور عام طور پر ڈاکٹر اس کے مخالف ہوتے جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی بعض حکومتیں باوجود سخت کوشش کے اس کا رواج اچھی طرح نہیں مٹا سکیں۔

خلاصہ یہ کہ رسم اور عادات بھی گناہ کا مرتکب بنا دیتی ہیں۔ ایک شرابی کو شراب۔ ایک افیونی کو افیون۔ ایک کوکین استعمال کرنیوالے کو کوکین نہ ملے تو وہ بیسیوں جرم کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جن پر وہ دوسری کسی صورت میں بھی آمادہ نہ ہوتا۔

اوپر جو راستے گناہ کے بیان کئے گئے ہیں وہ بطور مثال کے ہیں مگر پھر بھی مضمون سمجھانے کے لئے کافی ہیں۔ اسلئے چونکہ اخلاق کی تعلیم کے تمام ضروری پہلوؤں پر اجمالاً بحث ہو چکی ہے اب اسلام کی اُس تعلیم کے بیان کرنے کیطرف توجہ کرتا ہوں جو اس نے تمدن کے متعلق دی ہے۔

اسلام کی تعلیم تمدن کے متعلق

تمدن کے قوانین سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ قوانین مراد ہیں جن کے ذریعہ سے اُن بنیادوں کو قایم کیا جائے جو سوسائٹی کے بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ اور پھر وہ حقوق مراد ہیں جو بنی نوع انسان کو ایسے امور میں حاصل ہیں جن میں ان کے فوائد متحد ہیں۔ اور اسی طرح وہ فرائض جو بنی نوع انسان کی مشترک ترقی کے لئے افراد کے ذمہ لگائے گئے ہوں۔

میں جب غور کرتا ہوں تو میرے نزدیک تمدن اخلاق کے ہی ایک حصہ کو جامۂ عمل پہنانے کا نام ہے۔ اخلاق اور تمدن میں درحقیقت یہی فرق ہے کہ علم اخلاق تو افراد کی پاکیزگی سے بحث کرتا ہے اور علم تمدن قومی پاکیزگی سے بحث کرتا ہے۔ گویا اخلاق کا وہ نقطہ جو فرد سے وابستہ ہے ہم اُسے اخلاق سے موسوم کرتے ہیں۔ اور اخلاق کا وہ نقطہ جو مجموعہ افراد

سے تعلق رکھتا ہے ہم اسے تمدن کہہ لیتے ہیں جب ہم اخلاق کا ذکر کرتے ہیں تو ہم گویا یہ بحث کرتے ہیں کہ انسان کو اپنے نفس کو پاک بنانیکے لئے کیا اعمال کرنے چاہئیں؟ اور جب ہم تمدن کا ذکر کرتے ہیں تو گویا یہ بحث کرتے ہیں کہ مختلف افراد آپسمیں محبت سے رہنے اور بحیثیت قوم کے ترقی کرنیکے لئے کس طرح معاملہ کریں؟ پس صرف فرق یہ ہوگا کہ اول الذکر موقع پر ہم صداقت کی حقیقت پر بحث کرینگے اور ثانی الذکر موقع پر ہم اس صداقت کو مختلف افراد کے متعلق استعمال کرنیکے طریق پر بحث کرینگے۔

اِس مفہوم کو بیان کر دینے کے بعد جو میں تمدن کا سمجھتا ہوں میں اسلام کی تعلیم تمدن کے متعلق بیان کرتا ہوں۔

سب سے پہلے تو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم نے علاوہ مختلف جگہ پر تمدن کے احکام بیان کرنے کے تمدن کے متعلق ایک مکمل سورت اتاری ہے جو مختصر مگر تمدن کی اقسام کے بیان کرنے اور اسکی اصلاح کیطرف توجہ دلانے پر مشتمل ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ قرآن کریم کی سب سے آخری سورۃ یہی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک آخری ترقی انسان کی جسمانی ضروریات کے متعلق تمدن کی درستی ہی ہے۔ اس سورۃ میں قرآن کریم نے تمدن کو اللہ تعالےٰ کی تین صفات کے ماتحت تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ سب سے پہلی قسم تمدن کی اہلی تعلقات بیان کی ہے جو خدا تعالےٰ کی صفت ربوبیت کے ماتحت ہے۔ اسمیں خاندان اور قوم کے تعلقات پر بحث اور ان کے آپس کے فرائض کو بیان کیا جاتا ہے۔ اہلی تعلقات میں وہ رشتہ داریاں بھی شامل ہیں جو نسلی یا صہری تعلقات کے سبب سے ہوتی ہیں۔ اور وہ برادرانہ تعلقات بھی شامل ہیں جو بوجہ ایک ملک یا ایک علاقہ میں رہنے کے پیدا ہو جاتے ہیں۔

دوسری قسم تمدن کی بادشاہت اور ملکیت کے تعلقات کا بیان ہے۔ یہ قسم بادشاہ اور رعایا اور مالک اور نوکر کے تعلقات پر بحث کرتی ہے۔ اور یہ صفت خدا تعالےٰ کی صفت مالکیت کے ماتحت ہے۔

تیسری قسم تمدن کی یہ بیان کی ہے کہ ایک ملک کا دوسرے ملک سے اور ایک مذہب کا دوسرے مذہب سے کیا تعلق ہو اور کن قواعد پر انکی بنیاد ہو؟ یہ قسم اللہ تعالےٰ کی صفتِ الوہیت کے ماتحت ہے۔

صفتِ ربوبیت خاندان اور برادری کے تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے۔ صفتِ مالکیت بادشاہت

اور ملکیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ اور صفتِ الوہیت تمام بنی نوع انسان کے تعلقات اور مذہبی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے۔

اب میں تینوں اقسام کے متعلق اسلام کے الگ الگ احکام بیان کرتا ہوں۔ پہلا تعلق بقائے نسل کے قانون کو مدنظر رکھتے ہوئے میاں بیوی کا معلوم ہوتا ہے۔ اس تعلق کی درستی پر خاندان کی اِصلاح کا بہت کچھ دارومدار ہے اور خاندانی تعلقات پر قومی تعلقات کا دارومدار ہے اور اسی طرح یہ سلسلہ وسیع ہوتا چلا جائیگا۔ اسلام میاں بیوی کے تعلق پر پہلی بحث تو یہ کرتا ہے کہ اس تعلق کی بناء اخلاق پر ہونی چاہیئے نہ کہ ظاہری حسن و شکل پر یا مال و دولت پر۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے نکاح سے پہلے تقویٰ کا خیال کر لو اور آیندہ جس قسم کی اولاد اس تعلق کے نتیجہ میں پیدا ہوگی اس پر غور کر لو۔ رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ تنکح المرأۃ لاربعٍ لِمالہا ولحسبہا وجمالہا ولِدینہا فاظفر بذات الدین تربت یداک (بخاری کتاب النکاح باب الاکفاء فی الدین) کوئی شخص تو حسب کی خاطر نکاح کرتا ہے کوئی نسب کی خاطر۔ کوئی خوبصورتی کی خاطر۔ کوئی مال کی خاطر۔ اے مسلمان خدا تجھے سمجھ دے تُو دیندار اور نیک عورت سے شادی کیجیو۔

کیسی پاکیزہ تعلیم ہے۔ اگر شادی کرتے وقت اس امر کو مدنظر نہ رکھا جائیگا کہ عورت یا مرد کا دماغ اور طبعی میلان اور ذہانت کیسے ہیں تو اوّل تو باہمی تعلقات ہی ٹھیک نہیں رہیں گے جس سے تمدن خراب ہوگا۔ دوسرے اولاد کبھی اچھی نہ پیدا ہوگی۔ کیونکہ یہ دیکھا گیا ہے کہ ماں باپ کی ذہانت اور انکے افکار کا اثر اولاد پر ضرور پڑتا ہے۔ ہوشیار ماں باپ کے لڑکے ہوشیار پیدا ہوتے ہیں اور بیوقوف ماں باپ کے بچے بیوقوف پیدا ہوتے ہیں چنانچہ یوجنکس علم نے تو اس مضمون پر بہت کچھ روشنی ڈالدی ہے اور گو میرے نزدیک اس علم کے ماہرین استنباط نتائج میں حد سے بہت ہی بڑھ گئے ہیں لیکن پھر بھی اس حد تک انکی بات درست ہے اور اسلام انکی تائید کرتا ہے۔ کہ ماں باپ کی دماغی قابلیتوں اور ان کے خیالات کا اثر ایک حد تک اولاد پر ضرور پڑتا ہے۔ پس اسوجہ سے خاوند اور بیوی کا انتخاب ایک نہایت ہی اہم مسئلہ ہے۔

پس شریعتِ اسلام نے پہلی بنیاد تو تمدن کی یہ رکھی کہ نکاح میں عقل اور فہم اور ذکا کو خوبصورتی اور مال اور خاندان پر ترجیح دیدی۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ اسلام حسب نسب یا مال یا

خوبصورتی کو بالکل ہی نظرانداز کرتا ہے بلکہ میرا یہ مطلب ہے کہ اسلام انکو اصل مقصود قرار نہیں دیتا۔ اگر کوئی عورت مرد دیانتداری سے محض ذہانت اور اخلاق اور دین کی وجہ سے آپس میں ایک دوسرے سے تعلق پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی خوبصورتی اور مال اور حسب اور نسب بھی ملجاتا ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے مگر یہ امور مقصود نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر شادیاں اس اصل پر ہونے لگیں تو ملک کی اخلاقی حالت کی درستی کے علاوہ آیندہ نسلیں نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی پیدا ہوں۔

اِس غرض کو پورا کرنے کے لئے اسلام نے یہ حکم بھی دیا ہے کہ علاوہ اس کے کہ میاں بیوی آپسمیں ایک دوسرے کی نسبت تسلی کرلیں۔ عورت کے رشتے دار بھی تسلی کرلیں کہ واقع میں مرد ایسے اخلاق کا ہے کہ اس سے رشتہ کرنا عورت کے لئے بھی اور آیندہ نسل کے لئے بھی مفید ہوگا۔ اور نکاح کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ مرد کی پسند ہو عورت کی منظوری ہو۔ اور عورت کے باپ یا بھائی یا جو خاندان کا بڑا مرد ہو اسکی منظوری ہو۔ اور اگر کوئی مرد خاندان میں نہو تو حاکم شہر اس امر کی تسلی کرے کہ کسی عورت کو کوئی شخص دھوکا دیکر تو شادی نہیں کرنے لگا۔ عورت اور مرد میں اس وجہ سے فرق رکھا گیا ہے کہ مرد طبعاً ایسے امور میں حیا کم کرتا ہے اور خود دریافت کرلیتا ہے۔ اور عورت شرم کرتی ہے اور اس کے احساسات تیز ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ جلد دھوکہ میں آجاتی ہے پس اس کے لئے اس کے خاندان کے بڑے مرد کی تحقیق اور منظوری یا ایسے کسی آدمی کی عدم موجودگی میں حاکم شہر کی منظوری ضروری رکھی ہے۔ اگر اس حکم پر عمل کیا جائے تو وہ بہت سے دھوکے اور فریب جو شریف الطبع اعتماد کرنیوالی عورتوں سے کئے جاتے ہیں یکدم دُور ہو جائیں۔ چونکہ اسلام میں پردہ کا حکم ہے اس لئے نکاح کے ابتدائی امور طے ہو جانے اور دیگر امور میں تسلی ہو جانے پر مرد اور عورت کو آپس میں ایک دوسرے کو کھلے طور پر دیکھنے کی اجازت دی ہے تا کہ اگر شکل میں کوئی ایسا نقص ہو جو بعد میں محبت کے پیدا ہونے میں روک ہو تو اس کا علم مرد و عورت کو ہو جائے۔

شادی کے ساتھ ہی شریعتِ اسلام نے عورت کے لئے علیحدہ جائداد کا انتظام کیا ہے اور اسکو شادی کا ایک ضروری جزو قرار دیا ہے۔ اِسے اسلامی اصطلاح میں مہر کہتے ہیں۔ اس کی غرض یہ ہے کہ عورت کی ایک علیحدہ جائداد بھی رہے تاکہ وہ اپنی شخصیت کو قائم رکھ سکے

اور اپنے طور پر صدقہ دے سکے یا صِلہ رحمی کرسکے گویا مہر کے ذریعے پہلے دن سے ہی مرد سے یہ اقرار کرالیا جاتا ہے کہ عورت اس امر کی حقدار ہے کہ اپنی الگ جائیداد بنائے اور خاوند کو اس کے مال پر کوئی تصرف نہیں ہوگا۔ پھر عورت کا یہ حق مقرر کیا ہے کہ خاوند عورت کو بلا کسی کھلی کھلی بدی کے سزا نہیں دے سکتا۔ اور اگر سزا دینی ہو تو اس کے لئے پہلے ضروری ہوگا کہ محلہ کے چار واقف مرد عورت کو گواہ بنا کر ان سے شہادت لے کہ عورت واقع میں خلاف اخلاق افعال کی مرتکب ہوئی ہے اِس صورت میں بے شک سزا دے سکتا ہے مگر وہ سزا تدریجی ہوگی چنانچہ فرمایا۔ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۰ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا (نساء۔ ع ۶) پہلے وعظ۔ اگر وہ اس سے متأثر نہ ہو تو کچھ عرصہ کے لئے اس سے علیحدہ دوسرے کمرے میں سونا۔ اگر اسکا اثر بھی عورت پر نہ ہو تو گواہوں کی گواہی کے بعد بدنی سزا کا دینا۔ جس کے لئے شرط ہے کہ ہڈی پر چوٹ نہ لگے۔ اور نہ اس مار کا نشان پڑے (بخاری کتاب النکاح)

اور یہ بھی شرط ہے کہ یہ سزا صرف فحش کی وجہ سے دیجاتی ہے نہ کہ گھر کے کام وغیرہ کے نقص کی وجہ سے قطع تعلق کی صورت میں حکم ہے کہ وہ چار ماہ سے زیادہ کا نہیں ہو سکتا۔ اگر چار ماہ سے زیادہ کوئی خاوند اپنی بیوی سے الگ رہے تو اسے قانون مجبور کریگا کہ عورت کے حقوق ادا کرے اور خرچ کی ادائگی سے تو وہ ایک دن کے لئے بھی انکار نہیں کرسکتا۔ مرد پر فرض ہے کہ عورت کے کھانے پینے۔ پہننے اور مکان کی ضروریات کو مہیا کرے۔ خواہ عورت مالدار اور مرد غریب ہی کیوں نہو۔ اسیطرح مرد کو حکم ہے کہ عورت سے محبت اور پیار کا معاملہ کرے نہ حکومت اور سختی کا۔ بلکہ قرآن کریم نے فرمایا کہ عورتوں سے صلح ہو یا جنگ دونو صورتوں میں احسان کا ہی معاملہ کرو۔ رسُول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا استوصوا بالنساء خیراً عورتوں سے نیک معاملہ کرنے کے متعلق میری نصیحت کو یاد رکھو۔ اِسیطرح فرمایا لا یفرك مؤمن مؤمنة

ان کرہ منھا خلقا رضی منھا اخر۔ خاوند اپنی بیوی سے نفرت نہ کرے اسوجہ سے کہ اسمیں کوئی عیب ہے۔ کیونکہ اگر اسمیں کوئی عیب ہے، تو کوئی خوبی بھی تو ہے۔ اسیطرح آپ ؐ نے فرمایا۔ عورت کا حق اس کے خاوند پر یہ ہے کہ وہ جیسا کپڑا خود پہنے ویسا پہنائے۔ اور جیسا کھانا خود کھائے ویسا اسے کھلائے۔ اور یہ کہ اسے گالی نہ دے۔ اور اس سے الگ جا کر نہ رہے۔ پھر فرمایا کہ کسی مرد کے لئے جائز نہیں کہ دن رات عبادت یا دوسرے کاموں میں مشغول رہے اور اپنی بیوی کے حقوق کو نظر انداز کر دے اسکا فرض ہے کہ وہ اپنے وقت میں سے ایک حصہ اپنی بیوی کے لئے بھی فارغ کرے۔

اسی طرح فرمایا خیارکم خیارکم لنساءھم تم میں سے اچھے لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔ اس کے بالمقابل عورت کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے خاوند کی فرمانبردار رہے۔ اس کے مال کو ضائع ہونے سے بچائے۔ اسکی عزت کی حفاظت کرے۔ اسکی اولاد کی اچھی طرح پرورش کرے۔

اگر عورت مرد کے تعلقات کسی وقت بگڑ جائیں تو حکم ہے کہ جسقدر ہو سکے صلح کی کوشش کریں۔ اگر آپس میں صلح نہ ہو سکے اور فساد بڑھتا ہی جائے تو اسلام کہتا ہے کہ ایک حکم مرد کے عزیزوں یا عزیز نہ ہوں تو دوستوں میں سے اور ایک عورت کے عزیزوں یا عزیز نہ ہوں تو اس کے خیرخواہوں میں سے مقرر کیا جائے۔ دونوں مل کر نااتفاقی کی وجوہ پر غور کریں۔ اگر ان کے نزدیک صلح ممکن ہو تو اُن تجاویز کے ذریعے سے جو اُن کے ذہن میں ہوں صلح کرانیکی کوشش کریں۔ اگر ان کے نزدیک صلح کی کوئی صورت ممکن نہ ہو یا انکی تجاویز ناکام جائیں تو پھر مرد کو اجازت ہوگی کہ وہ عورت کو طلاق دیدے یعنی اپنے نکاح کے فسخ کرنیکا اعلان کردے۔ اس اعلان فسخ نکاح کے لئے بھی شرائط مقرر ہیں مثلاً علے الاعلان ہو۔ اسی طرح پسند کیا گیا ہے کہ ایک ایک ماہ کے بعد تین دفعہ کرکے ہو۔ تاکہ شاید اس عرصہ میں پھر دل درست ہو جائیں تو صلح کرلیں جسکا دروازہ آخری اعلان تک کھلا رکھا گیا ہے۔

اگر عورت کو خاوند سے شکایت ہو اور وہ الگ ہونا چاہے تو جس طرح اس کے نکاح کے وقت اس کے سب سے قریبی مرد رشتہ دار یا حاکم کی وساطت ضروری رکھی گئی تھی۔ اس موقع پر بھی یہ شرط

مقرر کی گئی ہے کہ وہ حاکمِ وقت کی وساطت سے خاوند سے علیحدہ ہو۔ اگر حاکم دیکھے کہ اسکا دعویٰ حق بجانب ہے، تو حکماً خاوند سے اسکو الگ کردے۔

جُدائی کے متعلق یہ احکام ہیں کہ اگر خاوند نے کوئی جائداد عورت کو دی ہوئی ہے تو اگر طلاق اسکی طرف سے ہے تو وہ اپنے دیئے ہوئے مال کو بیوی سے واپس نہیں لے سکتا۔ اور اگر حکم طلاق کا فیصلہ کریں اور ان کے نزدیک قصور عورت کا ہو تو وہ اس سے ایک حصہ مال کا خاوند کو واپس دلا سکتے ہیں۔ اور اگر عورت خود الگ ہونا چاہے تو قاضی اس سے ایسی کوئی جائداد جو خاوند نے اسکو دی تھی اور وہ ابتک موجود ہے خاوند کو واپس دلادیگا طلاق کی صورت میں جبتک مدت طلاق نہ گزر جائے خرچ اور مکان خاوند کے ذمہ ہوگا۔

عورت کے حقوق کو محفوظ کرنیکے لئے یہ بھی شرط لگادی کہ اس کے رشتہ دار نکاح سے پہلے کوئی رقم نکاح کی شرط میں نہیں لے سکتے تا ایسا نہ ہو کہ عورتوں کے نکاح کے متعلق جو انکو منظوری کا حق دیا گیا ہے وہ اسکو ناجائز طور پر استعمال کریں۔

چونکہ کبھی مجبوریاں ایسی پیش آجاتی ہیں جیسے بقائے نسل یا بقائے صحت یا ضروریاتِ سیاسی وغیرہ جنمیں ایک سے زیادہ شادیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے اسلام نے ایک سے زیادہ شادیوں کی بھی اجازت دی ہے مگر شرط یہ ہے کہ بیویوں میں انصاف قایم رکھا جائے۔ لباس میں۔ خوراک میں۔ جیب خرچ میں۔ تعلقات و سلوک میں بیویوں سے بالکل یکساں برتاؤ ہو۔ باری باری ایک ایک عورت کے پاس خاوند رہے۔ اور اگر ایسا نہ کرے تو رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اسکا حال ایسا ہی ہوگا کہ گویا وہ آدھے دھڑ کے ساتھ اٹھا ہے (ترمذی جلد اول ص۱۳۶ و نسائی جلد دوم ص۹۷)

کثرت ازدواج پر عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے اور اسی طرح طلاق پر لیکن عجیب بات ہے کہ مغرب طلاق کیوجہ سے خدا کے مقدسوں کو پانچ چھ سو سال گالیاں دینے کے بعد اب اس بات کا قائل ہو رہا ہے۔ کہ طلاق کی بھی کوئی صورت ضرور ہونی چاہیئے کیونکہ اس کے بغیر ملک کا تمدن برباد ہو رہا ہے۔ کاش کہ وہ پہلے ہی سوچتا اور خدا کے برگزیدوں پر اعتراض کا خنجر نہ چلاتا اور کم سے کم بدکلامی نہ اختیار کرتا۔ تا آج کی شرمندگی کا دن اسے میسر نہ آتا مگر افسوس

ہے کہ یورپ اب بھی اسلام کے قانون کو جسمیں سب پہلوؤں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ ایک طرف طلاق کو جسقدر ہو سکے روکا گیا ہے اور دوسری طرف آخری علاج کے طور پر اسکی اجازت بھی دیگئی ہے اختیار نہیں کرنا چاہتا اور خدا کی بات کو چھوڑ کر خود نئے قوانین بنانا چاہتا ہے جسکا نتیجہ ابھی سے خراب نکلنا شروع ہو گیا ہے اور طلاق کی حد سے بڑھی ہوئی آزادی سے نکاح کا وہ تقدس جو اہلی زندگی کی روح رواں ہے برباد ہو رہا ہے اور خطرہ ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ بنیاد کھوکھلی ہو کر اوپر کی عمارت کو بھی صدمہ پہنچا وے۔

اب رہا کثرت ازدواج کا مسئلہ اس کیطرف ابھی تک مغرب نے سنجیدگی سے توجہ نہیں کی لیکن آخر اسکو ایسا کرنا پڑیگا کیونکہ قدرت کے قوانین کا مقابلہ دیر تک نہیں کیا جا سکتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ایک عیاشی کا ذریعہ ہے لیکن اگر اسلام کے احکام پر غور کیا جائے تو ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ عیاشی نہیں بلکہ قربانی ہے۔ اور قربانی بھی عظیم الشان قربانی۔ عیاشی کسے کہتے ہیں؟ اسی کو کہ انسان اپنے دل کی خواہش کو پورا کرے مگر اسلامی احکام کے ماتحت ایک سے زیادہ شادیوں میں دل کی خواہش کس طرح پوری ہو سکتی ہے؟ اسلام حکم دیتا ہے کہ ایک بیوی خواہ کتنی بھی پیاری ہو اس کے ساتھ ظاہری معاملہ میں فرق نہ کرو تمہارا دل اسے خواہ اچھا لباس پہنانے کو چاہتا ہو مگر تم اس کو وہ لباس نہیں پہنا سکتے جبتک کہ دوسری کو بھی ویسا ہی لباس نہ پہناؤ۔ تمہارا دل خواہ اسے عمدہ کھانا کھلانے یا اس کے پاس نوکر رکھ دینے کو چاہتا ہے مگر اسلام کہتا ہے کہ تم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے جبتک کہ ایسا ہی سلوک دوسری بیوی سے نہ کرو۔ تمہارا دل خواہ ایک بیوی کے گھر کتنا ہی رہنے کو چاہتا ہو مگر اسلام کہتا ہے کہ تم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے جبتک اسی قدر تم دوسری بیوی کے پاس نہ رہو یعنی برابر کی باری مقرر کرو۔ پھر تمہارا دل ایک بیوی سے خواہ کسقدر ہی اختلاط کو چاہتا ہو۔ اسلام کہتا ہے بیشک تم اپنے دل کی خواہش کو پورا کرو مگر اسی طرح تمہیں اپنی دوسری بیوی کے پاس جا کر بیٹھنا ہو گا۔ غرض سوائے دل کے تعلق کے جو کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا سلوک معاملہ۔ امداد۔ خیر خواہی کسی امر میں فرق کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیا یہ زندگی عیاشی کی کہلا سکتی ہے یا یہ قوم اور ملک کے لئے یا ان فوائد کے لئے جن کیلئے دوسری شادی کیجاتی ہے ایک

ہے اور قربانی بھی کتنی بڑی قربانی؟

کیسا دکھ اور صدمہ ہوتا ہے یہ دیکھکر کہ جو لوگ اسلامی احکام سے ایک ذرہ بھر بھی واقفیت نہیں رکھتے وہ صرف یہ سنکر کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک سے زیادہ شادیاں کی تھیں یہ اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ آپؐ کے اخلاق نعوذ باللہ بعد میں آکر خراب ہو گئے تھے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آپؐ نے ملک اور قوم کی بہتری کے لئے شادیاں کیں۔ اور آپؐ کے انصاف کا حال پڑھ کر انسان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ آپکو عدل کا اسقدر خیال تھا کہ آپؐ مرض موت کے شدید بخار کیحالت میں دو آدمیوں کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر جبکہ آپکے پاؤں زمین پر گھسٹتے جاتے تھے ایک بیوی کے گھر سے دوسری بیوی کے گھر جاتے تھے۔ حتیٰ کہ وفات سے چند دن پہلے آپؐ کی بیویوں نے درخواست کی کہ آپؐ کو تکلیف ہوتی ہے آپؐ ایک ہی گھر میں آرام سے رہیں۔ اور خود ہی انہوں نے عائیشہ رض کا گھر تجویز کیا۔ (صحیح بخاری کتاب المغازی باب مرض النبیؐ ووفاتہ صـ۶۳۹ و صـ۶۴۰ و صـ۶۴۱)

بعض ایک سے زیادہ شادیوں کو ظلم قرار دیتے ہیں مگر یہ ظلم نہیں۔ کیونکہ ایسی ضرورتیں پیش آتی ہیں جب شادی نہ کرنا ظلم ہو جاتا ہے۔ ایک عورت جو پاگل ہو جائے کوڑھی ہو جائے۔ یا اس کی اولاد نہو اسوقت اس کا خاوند کیا کرے؟ اگر وہ دوسری شادی نہیں کریگا اور کسی بدکاری وغیرہ میں مبتلا ہوگا تو یہ اس کا اپنی جان اور سوسائٹی پر ظلم ہو گا۔ اور اگر وہ کوڑھی ہے تو اپنی جان پر ظلم ہو گا۔ اگر اولاد نہیں ہوئی تو قوم پر ظلم ہو گا۔ اور اگر وہ پہلی عورت کو جدا کر دے تو یہ حد درجہ کی بے حیائی اور بے وفائی ہوگی کہ جبتک تو وہ تندرست رہی یہ اسکے ساتھ رہا اور جب وہ اسکی مدد کی سب اوقات سے زیادہ محتاج تھی اس نے اسے چھوڑ دیا۔ غرض بہت سے مواقع ایسے پیش آتے ہیں کہ دوسری شادی جائز ہی نہیں کہ یہ بہت کمزور لفظ ہے بلکہ ضروری نہیں بلکہ ایک قومی فرض ہو جاتا ہے۔

میاں بیوی کے تعلقات کے بعد اولاد پیدا ہوتی ہے جو تمدن کی گویا دوسری اینٹ ہیں۔ اولاد کے متعلق اسلام نے یہ حکم دیا کہ انکی عمدگی سے پرورش کیجائے۔ والدین پر انکا پالنا اور انکی ضروریات کو پورا کرنا فرض ہے۔ ان کو خرچ کی تنگی کی وجہ سے مار دینا جیسا کہ

وحشی قبائل میں رواج تھا۔ بصورت لڑکیوں کے بوجہ تکبر کے مار دینا جیساکہ کئی جنگی قوموں میں دستور تھا منع ہے۔ اولاد کی پیدائش کے متعلق حکم دیا کہ خاوند اگر چاہے کہ اس کے اولاد نہ ہو تو اس کے لئے عورت سے اجازت لینا ضروری ہوگا۔ بغیر عورت کی اجازت کے اولاد کو رد کا نہیں جا سکتا۔

پھر فرمایا کہ بچوں کو علم اور اخلاق سکھائے جائیں اور بچپن سے انکی تربیت کیجائے تاکہ وہ بڑے ہوکر مفید بن سکیں۔ اولاد کے درمیان بھی یکساں سلوک کرنیکا حکم دیا۔ بچپن میں انکی خواہشات اور ضروریات کے مطابق سلوک تو خیر اور بات ہے مگر جب وہ بڑے ہوجائیں تو حکم دیا کہ جو تحفہ دے وہ سب کو دے ورنہ کسی کو نہ دے۔ اولاد کو تربیت کیخاطر اگر مارنا پڑے تو حکم دیا کہ منہ پر نہ مارے کہ تمام آلاتِ حواس اسمیں جمع ہیں اور ان کے نقصان سے بچہ کی آئندہ زندگی پر اثر پڑتا ہے۔

لڑکیوں کی تربیت کے متعلق خاص حکم دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس کے گھر میں لڑکی پیدا ہو اور وہ اس کی اچھی طرح تربیت کرے تو اسکا یہ کام اس کو آگ سے بچانے والا ہوگا۔ یعنی لڑکی کی اچھی تربیت کرنی اور اس سے حسنِ سلوک کے سبب سے اللہ تعالےٰ اس سے اچھا معاملہ کریگا۔

اسی طرح آپؐ نے فرمایا۔ جس شخص کے ہاں لڑکے ہوں یا لڑکیاں ہوں یا اس کے ذمّے بھائیوں یا بہنوں کی پرورش ہو۔ اور وہ انکو علم سکھائے اور اچھی طرح ان کی ضروریات زندگی کا انتظام کرے۔ تو اللہ تعالےٰ اس کے بدلہ میں اس شخص کو جنت دیگا۔ یعنی وہ اس کام کے ذریعہ سے اللہ تعالےٰ کے مزید فضل کو جذب کریگا نہ یہ کہ خواہ وہ اور کوئی بدی کرے اس کا اثر اس کی روحانیت پر کوئی نہ ہوگا۔ اسیطرح فرمایا جس کے گھر لڑکی ہو اور وہ نہ اسے قتل کرے نہ اسے ذلیل کر کے رکھے نہ لڑکوں کو اس پر فضیلت دے تو خداتعالےٰ اسے جنّت دیگا۔

اولاد کی صحت کا خیال رکھنے کا خاص حکم دیا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اے لوگو! اپنے بچوں کو مخفی طور پر قتل نہ کرو۔ کیونکہ مرد کا عورت سے ایام رضاعت میں ملنا جوانی میں جاکر بچے کے قویٰ کو نقصان دیتا ہے۔ یعنی ان دنوں میں اس کا اثر خاص طور پر

ظاہر ہوتا ہے۔ اس ارشاد سے ایک عام قانون بچہ کی صحت کے خیال کا نکلتا ہے۔ کیونکہ اس غرض کے لئے اگر شہوات طبعیہ کو روکنا پسند کیا گیا ہے تو دوسری قربانیاں تو اس سے ادنیٰ ہی ہیں۔

اہلی زندگی میں ایک سوال ورثہ کا ہے۔ اسمیں اسلام نے ایسی مکمل تعلیم دی ہے کہ تمام غیر متعصب لوگ خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں اس کی خوبی اور اسکی حکمت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اول تو اسلام نے ورثہ کے معاملہ میں عورتوں کو بھی حصہ دار مقرر کیا ہے۔ دوسرے والدین کو حصہ دار مقرر کیا ہے۔ سوم خاوند اور بیوی کو حصہ دار مقرر کیا ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ رشتہ دار عقلاً ضرور وارث ہونے چاہئیں۔ علاوہ مذکورہ بالا ہدایتوں کے شریعت اسلام حکم دیتی ہے کہ وارثوں کو ان کے ورثہ سے محروم نہ کیا جائے۔ پس کوئی شخص اپنے مال سے وارثوں کو محروم نہیں کرسکتا۔ ہاں مرنے والے کو یہ حق دیا ہے کہ اپنے مال میں سے ایک ثلث وصیت کرے اس سے زیادہ مال وصیت کرنیکا کسی کو حق نہیں کیونکہ اس سے وارثوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ حکم ہے کہ وصیت وارث کے حق میں نہیں کیجاسکتی۔ وارثوں کو وہی حصہ ملیگا جو ان کے لئے مقرر ہوچکا ہے غیر وارث کو حصّہ دیا جا سکتا ہے۔

عورت کا حصہ مرد سے اکثر حالتوں میں نصف رکھا ہے۔ جن میں برابر رکھا ہے وہاں خاص حکمتوں کے ماتحت کیا گیا ہے۔ بعض لوگ اس فرق میں بے انصافی دیکھتے ہیں حالانکہ عورتوں کے حقوق ابتک بھی محفوظ نہیں ہیں۔ **صرف اسلام ہی ہے جس نے عورتوں کو پورے حق دلائے ہیں**۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے ماں پر خرچ کی کوئی ذمہ واری نہیں رکھی تمام اخراجات مرد پر رکھے ہیں۔ اسوجہ سے مرد کی مالی ذمہ واری بہ نسبت عورت کے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ پس وہ زیادہ حصہ کا مستحق تھا۔ بچوں کی پرورش بیوی کی پرورش مرد کے ذمّہ ہے۔ عورت اگر نکاح کریگی تو اس کا اور اس کی اولاد کا خرچ اس کے خاوند کے ذمّہ ہوگا۔ اگر نہ کریگی جسے اسلام پسند نہیں کرتا تو وہ اکیلی جان ہوگی۔ مگر مرد اگر نکاح کریگا اور اسی کا اسلام اسے حکم دیتا ہے تو اسے اپنی بیوی اور بچوں کا خرچ برداشت کرنا ہوگا۔ پس مرد کا عورت سے دُگنا حصّہ مرد کی رعایت کے طور پر یا عورتوں کی ہتک کے طور پر نہیں ہے بلکہ واقعات کو مدنظر رکھکر یہ حکم دیا گیا ہے۔ اور عورتوں کو اس میں ہرگز نقصان

نہیں بلکہ وہ شاید پھر بھی فائدہ میں رہتی ہیں۔

اولاد پر والدین کے حقوق اس طرح مقرر فرمائے ہیں کہ وہ اپنے والدین کی عزت کریں۔ انکی فرمانبرداری کریں۔ اور جب وہ ناقابل ہو جاویں تو انکی ضروریات کے کفیل ہوں۔ اور ان کے احساسات کو صدمہ نہ پہنچنے دیں۔ ان سے تُرشروئی سے پیش نہ آویں بلکہ ان کیلئے دعائیں کریں اور خدا تعالےٰ سے انکی بہتری کے لئے عرض کرتے رہیں۔

بھائیوں کا بھائیوں پر یہ حق مقرر فرمایا ہے کہ وہ اپنے لاوارث بھائیوں کو پالیں۔ اور اسی طرح اگر بھائی لاوارث ہوں تو انکے وارث بنیں۔ دوسرے رشتہ داروں پر بھی یہی حق مقرر کیا گیا ہے کہ اگر بھائی بھی نہوں تو باپ کیطرف کے رشتہ دار۔ وہ نہوں تو ماں کیطرف کے رشتہ دار پرورش کریں۔ اور انکے لاوارث مرنے کی صورت میں ان کے وارث ہوں۔

خاندان کے بعد محلّہ دار اور ہموطن لوگوں کے تعلقات بوبیّت میں شامل ہیں۔ ان کے متعلق اسلام حکم دیتا ہے کہ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (نساء ع ۶) اور اپنے والدین سے نیک سلوک کرو۔ اور یتامیٰ سے اور مسکینوں سے اور قریب کے ہمسایہ سے اور دُور کے ہمسایہ سے۔ اور شریک فی العمل سے۔ اور مسافر سے اور غلاموں سے۔

تمدن کا اساس مختلف لوگوں کے نیک تعلقات ہی ہیں اور خصوصًا غرباء کی خبرگیری جو گویا پیچھے رہے ہوئے بھائی ہیں اسلام نے ان سب لوگوں کے حقوق کو بیان کر کے تعلقات کو نہایت مضبوط بنیاد پر قائم کر دیا ہے۔

یتیم وہ ہیں جن کے ماں باپ نہیں ان کی خبرگیری کی ذمہ واری سوسائٹی پر رکھی۔ کہ مالداروں کو چاہیئے کہ انکو اپنے بچوں کی طرح پالیں۔ دوسری ذمہ واری یہ رکھی کہ مساکین جو بوجہ مال نہ ہونیکے کوئی کام نہیں کر سکتے ان کی مدد کریں اور انکو کام کا موقع دیں۔ اس کے بعد ان لوگونکو لیا جو مالدار ہیں۔ یعنی ہمسائے خواہ قریب کے ہوں خواہ دور کے یعنی گھر کے پاس جن کا گھر ہو یا شہر کے دُور حصّوں میں رہنے والے ہوں یا یہ کہ کسی دوسرے ہمسایہ شہر کے باشندے

ہوں انکی نسبت فرمایا کہ ان سے نیک سلوک کرو تاکہ محبت بڑھے اور تعلقات مضبوط ہوں۔

پھر فرمایا کہ شریک فی العمل یعنے جو لوگ ساتھ ملازم ہوں یا تجارت یا پیشہ میں شریک ہوں انکا بھی خاص حق ہوتا ہے۔ انکی بھی خاص مدد کرنی چاہیئے۔

اگرچہ مَیں مزدوروں اور پیشہ وروں کی مجالس کا تو قائل نہیں ہوں جو میرے نزدیک صرف یورپ کے تمدن کا نتیجہ ہیں اگر اسلامی تمدنی قوانین کی اتباع کیجائے تو بلا ایسی انجمنوں کے مزدوروں کے حقوق احسن طور پر ادا ہو سکتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک ایک قسم کی مواساۃ اور مشارکت کا اس حکم سے ضرور پتہ ملتا ہے اور اسلام ہمیں حکم دیتا ہے کہ ایک پیشہ یا ایک کام کرنیوالونکو آپس میں خاص طور پر تعاون اور مدد سے کام لینا چاہیئے۔

سب سے آخر میں یہ حکم دیا کہ مسافر جو اپنے عزیز رشتہ داروں سے دور ہے اس سے نیک سلوک بھی تمہارا فرض ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ غریب مسافر سے نیک سلوک کریں بلکہ ہر مسافر کے متعلق حکم ہے خواہ وہ کتنا بھی امیر کیوں نہو۔ تاکہ دور و نزدیک محبت کا تعلق قایم ہو اور امن کی بنیاد رکھی جائے۔

بڑوں اور چھوٹوں کے تعلقات کے متعلق اسلام حکم دیتا ہے کہ لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا (ترمذی) یعنی جو بڑا ہو کر چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور چھوٹا ہو اور بڑوں کا ادب نہ کرے وہ ہمارے طریق پر نہیں۔ اس حکم سے استاد اور شاگرد اور آقا اور ملازم اور اسی قسم کے اور سب تعلقات کے متعلق ایک اصولی ہدایت دی گئی ہے۔

عورت اور مرد کے عام تعلقات کے متعلق یہ تعلیم دی ہے کہ مردوں کو عورتوں کے آرام کا خیال رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد تھوڑی دیر بیٹھے رہتے تاکہ پہلے عورتیں آرام سے گزر جائیں۔ جب وہ گزر جائیں تو پھر آپؐ اٹھتے اور دوسرے مرد بھی آپؐ کے ساتھ اٹھتے۔ سفر میں جب لوگ اونٹوں کو تیز کرتے تو آپؐ فرماتے کہ شیشوں کا بھی خیال رکھو یعنی عورتیں ساتھ ہیں وہ تمہاری طرح تکلیف برداشت نہیں کر سکتیں اس لئے آہستہ چلو۔ تا ان کو تکلیف نہو۔

خاوندوں کو حکم دیا کہ سفر سے واپس آتے ہوئے گھر میں اچانک داخل نہوں بلکہ دن کیوقت اور پہلے سے مطلع کر کے آئیں تاکہ عورتیں گھر کی اور بدن کی صفائی کا اہتمام کرلیں۔

عورتوں کے متعلق یہ حکم بھی دیا کہ انکو ان کے بچوں سے جُدا نہ کیا جائے جس میں ایک عام قاعدہ بتایا ہے کہ عزیزوں اور رشتہ داروں کو آپس میں جدا نہ کرنا چاہیئے بلکہ ان کو آپس میں ملنے کا موقع دیتے رہنا چاہیئے۔

آپس کے تعلقات کو قطع کرنے والے سب امور سے منع فرمایا ہے مثلاً یہ کہ کوئی کسی شخص پر الزام نہ لگائے۔ اور اگر کوئی بدکاری کا الزام لگائے اور اسکو ثابت نہ کر سکے تو اسے سخت سزا دیجائے۔

اسی طرح حکم دیا کہ نکاح پر نکاح کی درخواست نہ دے۔ اگر معلوم ہو جائے کہ کوئی شخص کسی جگہ رشتہ کی تحریک کر رہا ہے تو گو اسے معلوم ہو کہ اگر میں درخواست دوں تو مجھے کامیابی کی زیادہ امید ہے۔ اسوقت تک خاموش رہے جبتک پہلی درخواست کا فیصلہ نہ ہو جائے۔

عام شہریت کے اصول

ایک مسلمان شہری کے جو کام اسلام نے مقرر کیے ہیں اب میں انمیں سے بعض کا ذکر کرتا ہوں۔ ایک حق اسلام نے یہ مقرر کیا ہے کہ ہر ایک آدمی محنت کر کے کھائے اور سُست نہ بیٹھے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بہترین رزق وہ ہے جو انسان اپنے ہاتھوں کی کمائی سے مہیا کرے۔ اور فرمایا کہ داؤد علیہ السلام کی عادت تھی کہ وہ ہاتھ کی محنت سے اپنا رزق پیدا کرتے تھے۔

ایک فرض مسلم شہری کا اسلام نے یہ مقرر کیا ہے کہ وہ **سوال نہ کرے**۔ رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس امر کے متعلق خاص طور پر خیال رکھتے تھے اور ہمیشہ سوال سے لوگوں کو منع کرتے رہتے تھے۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سوال صرف تین شخصوں کو

جائز ہے۔ ایک اس شخص کو جو فقر سے نکلنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر اسے کوئی کام ہی نہیں ملتا۔ یا وہ بالکل کام کر ہی نہیں سکتا۔ دوسرے وہ شخص جسپر کوئی ایسی چٹی پڑ گئی جو اس کے خیال و گمان سے باہر تھی پس ایسے شخص کے لئے چندہ جمع کیا جا سکتا ہے۔ اور تیسرے ان لوگوں کیلئے سوال جائز ہے کہ جن پر کوئی قومی جرمانہ آپڑا ہو یعنی کسی شخص نے کوئی خون وغیرہ کر دیا ہو اور قوم پر تاوان پڑ گیا ہو تو وہ لوگ سوال کر سکتے ہیں۔

ایک فرض مسلم شہری کا یہ ہے کہ جو شخص اس کے سامنے سے آئے اسے **السّلامُ علیکُم** کہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ خدا تعالےٰ کیطرف سے تم پر سلامتی ہو۔ گویا ہر وقت تعلقات فی مابین کی درستی کی کوشش کرتا رہے۔ پھر جو شخص آتا ہوا ملے اور وہ واقف اور دوست ہو تو مُسلم شہری کا فرض یہ ہے کہ اس سے مصافحہ کرے۔

اِسی طرح مسلم شہریوں کے یہ فرائض مقرر کئے گئے ہیں کہ جو لوگ اپنے محلّہ کے یا دوسرے واقفوں میں سے بیمار ہوں انکی عیادت کے لئے جائیں۔ اور انکی تسلّی اور تشفّی کریں۔ گھر میں گھُسیں تو پہلے اجازت لے لیں۔ پہلے السلام علیکم کہیں۔ اگر گھر میں کوئی ہو اور جواب دے کہ اس وقت نہیں مل سکتے۔ تو بلا ملال کے واپس چلے جائیں۔ اگر کوئی نہو تو بھی واپس چلے جائیں۔ اگر ان کے سامنے کوئی شخص کوئی ایسی بات کہدے جو کسی دوسرے شخص کے خلاف ہو تو اس کو دبا دیں اور اس شخص تک نہ پہنچائیں جس کو کہی گئی ہے۔ ورنہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ سمجھا جائیگا کہ وہ بات اسی نے کہی ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ کہنے والے کی مثال تو ایسی تھی کہ اس نے تیر مارا اور لگا نہیں۔ اور جس نے اس کو وہ پہنچا دی جس کے حق میں کہی گئی تھی اس کی مثال ایسی ہے جیسے اس نے تیر اٹھا کر اس شخص کے سینے میں چبھو دیا۔

اسی طرح مسلم شہریوں کا یہ فرض ہے کہ جو شخص فوت ہو جائے اس کے جنازے کی تیاری میں مدد دیں اور قبر تک لیجاویں اور دفنائیں۔ لیکن سب کے جانیکی ضرورت نہیں اگر بقدر ضرورت آدمی چلے جائیں تو یہ کافی ہوگا لیکن اگر کوئی بھی نہ جائے تو سب گنہگار ہونگے۔ اس فرض کی ادائیگی کا مسلمان اسقدر خیال رکھتے تھے کہ صحابہؓ کے زمانہ کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ غیر مذاہب کے لوگوں تک کے جنازوں کے ساتھ مسلمان جاتے تھے۔

اِسی طرح مسلم شہریوں کا فرض ہے کہ ایسی باتیں جو وقار کے خلاف ہوں اور لوگوں کو تکلیف دینے والی ہوں نہ کریں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے مسلمان بازاروں اور گلیوں میں وقار کے ساتھ چلتے ہیں۔ رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کو دیکھا کہ ایک جوتی پہنے ہوئے چل رہا ہے تو آپؐ نے اُسے منع فرمایا اور فرمایا کہ یا آدمی دو نو جوتیاں پہنے یا ایک بھی نہ پہنے۔ مسلم شہریوں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ راستوں یا لوگوں کے جمع ہونے کی جگہوں میں کوئی غلاظت نہ پھینکیں اور ان کو گندہ نہ کریں۔ رسُول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس شخص پر خدا کی ناراضگی نازل ہوتی ہے جو راستوں میں پاخانہ کرتا ہے یا درختوں کے نیچے جہاں لوگ آکر بیٹھتے ہیں۔

اِسی طرح مسلم شہری کا یہ بھی فرض ہے کہ راستوں اور پبلک جگہوں کو صاف رکھنے کی کوشش کرے اور جسقدر مدد ان کے صاف کرنے میں دے سکتا ہے دے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو شخص راستہ میں سے لوگوں کو ایذا دینے والی چیزیں ہٹاتا ہے اس پر خدا کا فضل نازل ہوتا ہے۔

مُسلم شہری کا ایک یہ بھی فرض ہے کہ اگر وہ چیزیں فروخت کرے تو ضرر رساں چیزوں کو فروخت نہ کرے۔ مثلاً سڑی ہوئی یا موسم کے لحاظ سے بیماریاں پیدا کرنیوالی چیزوں کو۔ اس کیلئے یہ کہنا کافی نہیں کہ لوگ جان کر اور سوچ سمجھ کر ان چیزوں کو لیتے ہیں۔ بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ خود لوگوں کی صحت کا خیال رکھے اور ایسی چیزوں کو فروخت ہی نہ کرے۔

مُسلم شہری کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ پبلک جگہوں پر بلند آواز سے لڑے اور جھگڑے نہیں اور لوگوں کے امن اور آرام میں خلل نہ ڈالے۔ اور اسکا یہ بھی فرض ہے کہ ایسی جگہیں کہ جنکو لوگ استعمال کرتے ہیں انکو گندہ نہ کرے۔ مثلاً کھڑے پانی میں پیشاب نہ کرے یا اَور کوئی غلاظت ان میں نہ پھینکے۔ اور اس کا یہ بھی فرض ہے کہ گندہ کلام منہ پر نہ لائے اور نہ پبلک جگہوں پر کوئی ایسا فِعل کرے جو لوگوں کو ایذ دیتا ہو۔ مثلاً ننگا نہ پھرے یا اَور ایسی ہی کوئی حرکت نہ کرے۔

پھر اِسلام ہمیں یہ بھی سکھاتا ہے کہ ایک مُسلم شہری کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ لوگوں کو اچھی باتیں سِکھاتا رہے اور بد باتوں سے روکتا رہے مگر نرمی سے اور محبت سے سِکھائے تا لوگ جوش میں آکر حق سے اَور بھی دور نہ ہو جائیں۔ اور مُسلم شہری کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ لوگوں کو علم سِکھائے اور

جو کچھ اُسے معلوم ہوا ہے چھپائے نہیں بلکہ لوگوں تک اسکا فائدہ عام کرے۔ کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی علم کو چھپاتا ہے اور باوجود لوگوں کے پوچھنے کے ظاہر نہیں کرتا اس کے منہ میں قیامت کے دن آگ کی لگام ہوگی۔ اِس حکم کا یہ مطلب نہیں کہ جو ایجادیں وغیرہ لوگ کریں انکو لوگوں پر ظاہر کردیں اور خود فائدہ نہ اٹھائیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ علم کو دنیا سے ضائع نہونے دیں اور اسکو چھپائیں نہیں۔ ورنہ فائدہ اٹھانا جائز اور درست ہے۔ اور پیٹنٹ یا رجسٹری کے رواج سے تو علوم کی حفاظت کا ایک دروازہ کھل ہی گیا ہے۔

مُسلم شہری کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ بہادر بنے لیکن ظالم نہ ہو۔ وہ نہ کمزوروں پر۔ نہ عورتوں پر نہ بچوں پر۔ نہ اَور کسی پر ظلم کرے بلکہ وہ جانوروں تک پر ظلم نہ کرے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ عبد اللہ رضؓ جو حضرت عمر رضؓ خلیفہ ثانی کے لڑکے تھے انہوں نے ایکدفعہ چند نوجوانوں کو دیکھا کہ زندہ جانوروں پر نشانہ لگا رہے ہیں۔ جب ان لوگوں نے آپکو دیکھا تو بھاگ گئے۔ آپ رضؓ نے فرمایا۔ خدا ان پر ناراض ہوا جنہوں نے یہ کام کیا۔ خدا ان پر ناراض ہوا جنہوں نے یہ کام کیا۔ مَیں نے رسُول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے آپؐ نے فرمایا خدا اس پر ناراض ہوا جِس نے کسی جاندار چیز کو نشانہ بنایا یعنی باندھ کر یا پَر وغیرہ توڑ کر۔ ورنہ یوں شکار اسلام میں منع نہیں۔

اِسلام کا یہ حکم کیسا لطیف ہے اسے تیرہ سَو سال سے وہ تعلیم دیجاتی رہی ہے جو ابھی بعض متمدن ممالک کے ذہنوں میں داخل نہیں ہوئی۔ کیونکہ تھوڑا ہی عرصہ ہوا بعض مغربی ممالک میں زندہ کبوتروں پر نشانے لگانے کی ایک لہر چلی تھی۔ اور بعض جگہ اسے جبراً روکنا پڑا تھا۔

اِسی طرح لکھا ہے کہ رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گدھے کو دیکھا کہ اس کے منہ پر داغ دیا ہوا تھا۔ آپؐ نے اسے نہایت ناپسند فرمایا۔ اور فرمایا کہ منہ پر جانور کو زیادہ تکلیف ہوتی ہے آیندہ داغ ران پر دیا جائے۔ اور آپؐ کے اس حکم سے ہی ران پر داغ دینے کا رواج چلا۔ اسی طرح آپؐ نے دیکھا کہ کسی نے قُمری کے بچوں کو پکڑ لیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس طرح اسے بچوں کی وجہ سے تکلیف نہ دو۔ فوراً بچے اڑا دو۔ اور آپؐ نے فرمایا۔

کہ جانوروں پر رحم کرنے اور بھوک میں کھلانے اور پیاس میں پلانے پر بھی خدا تعالےٰ رحم کرتا ہے۔

پھر مُسلم شہری کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کی جانوں کو خطرے میں نہ ڈالے۔ چنانچہ رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس علاقہ میں کوئی وبائی بیماری ہو وہاں کے لوگ دوسرے شہروں میں نہ جائیں اور دوسرے لوگ اس علاقہ میں نہ آئیں۔ کیا ہی لطیف حکم ہے جسے آج قرنطینہ کے نام سے ایک نئی ایجاد قرار دیا جا رہا ہے۔ حالانکہ اس حکم کی ابتدا اسلام سے شروع ہوئی ہے۔ اگر اس حکم پر لوگ عمل کریں تو نہ قرنطینہ کے قیام کی ضرورت رہتی نہ سرکاری نگرانیوں کی۔ خود بخود ہی وبائیں دب سکتی ہیں۔

مُسلم شہری کا یہ بھی فرض ہے کہ جسوقت وہ اپنے ہمسایہ کو مصیبت میں اور مشکل میں دیکھے اور اسکے پاس مال ہو تو وہ اپنے مال سے اسے بقدر ضرورت قرض دے اور اسوقت جبکہ وہ مصیبت میں مبتلا ہے اس سے یہ حساب نہ کرنے بیٹھے کہ تو مجھے اس کے بدلہ میں کیا دیگا۔ کیونکہ اس کے اخلاق وسیع اور اسکا حوصلہ بلند ہونا چاہیئے۔ اسے تکلیف اور دکھ کے اوقات میں لوگوں کا مددگار ہونا چاہیئے۔ اور اپنے بھائیوں کی مدد اسے اپنا فرض سمجھنا چاہیئے۔ اسے محنت سے اپنی روزی کمانی چاہیئے۔ نہ کہ صرف روپیہ قرض دیکر اور لوگوں کو انکی تکلیف کیوقت اپنے قبضہ میں لا کر یا اسراف کی عادت پیدا کرکے۔

مُسلم شہری کا ایک یہ بھی فرض ہے کہ وہ قومی اور ملکی فرائض کے لئے قربانی کرنے کے لئے تیار رہے۔ اور اپنی ذمہ واری کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے۔ کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ۔ جو شخص اپنے مال کی حفاظت کے لئے مارا جاتا ہے وہ خدا کے حضور میں مقبول ہے۔ اور قرآن کریم فرماتا ہے کہ تم لوگ کیوں لڑنے سے انکار کرتے ہو حالانکہ تمہارے بھائی اور بہنیں دوسرے لوگوں کے ظلم کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔

مُسلم شہری کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ کسی کو ہلاک ہوتا دیکھے تو اسکو بچائے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو کہا گیا ہے کہ اس پر سخت عذاب اور خدا تعالےٰ کی ناراضگی نازل ہوگی۔ رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی کو قتل ہوتا ہوا دیکھتا ہے اور خاموش کھڑا رہتا ہے اور اس کے بچانے کیلئے

کوشش نہیں کرتا وہ خدا کی لعنت کے نیچے ہے پس ڈوبتوں کو بچانا۔ آگوں کو بجھانا۔ زلزلوں۔ کانوں کے پھٹنے۔ مکانوں کے گرنے۔ ریلوں کے ٹکرانے اور بجلیوں کے گرنے کے وقت لوگوں کی مدد کرنی اور ہر ایک مصیبت میں جس میں اسکی مدد لوگوں کی جان بچا سکتی ہے۔ انکی جان کو بچانا ایک مُسلم کا فرض ہے ورنہ وہ خدا کے حضور میں جوابدہ ہوگا۔ اور وہ خدا کے فضل کو کبھی حاصل نہیں کرے گا۔

اِسی طرح ایک مُسلم شہری کا فرض ہے کہ وہ اپنے بھائی کی طرف ہنسی کے ساتھ بھی ہتھیار کا منہ نہ کرے۔ یہ حکم رسُول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے لوہے کے ہتھیاروں کے متعلق دیا ہے پس بارود سے چلنے والے ہتھیاروں کے متعلق تو اور بھی سختی سے یہ حکم چسپاں ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس حکم پر عمل نہ کرنے کے سبب سے سینکڑوں آدمیوں کی محض غلطی سے جانیں جاتی رہتی ہیں۔

پھر مُسلم شہری کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ کبھی ہمت نہ ہارے اور مایوس نہ ہو۔ بلکہ مصائب اور تکالیف میں ایک پہاڑ کیطرح کھڑا رہے۔ حوادث کی آندھیاں چلیں اور آفات کی موجیں اُٹھ اُٹھ کر اسے ٹکرائیں مگر وہ مقابلہ سے نہ گھبرائے بلکہ انکو دبانے کی کوشش کرے۔ یہانتک کہ یا اسے موت آجائے یا وہ ان مشکلات کو زیر کرکے اپنے لئے کامیابی کا راستہ کھول لے۔ وہ بزدلی سے اپنی ذمہ واریوں سے بچنے کے لئے خودکشی نہیں کرتا۔ کیونکہ اسکا مذہب اسے اس بزدلی سے روکتا ہے۔ اور نڈر اور بہادر بننے کی تعلیم دیتا ہے۔

یہ ہے ایک مُسلم شہری۔ مگر اسوقت میری مراد مسلم شہری سے وہ مُسلم نہیں جو اپنے مذہب کو بھول کر مغرب کیطرف ایک پیاسے کیطرح دیکھ رہا ہے۔ بلکہ اُس مُسلم سے میری مراد ہے جو آج سے تیرہ سَو سال پہلے کا تھا اور جسے اب پھر **مسیح موعود** علیہ السلام دنیا میں لائے ہیں۔

یتامیٰ کے متعلق احکام

عام مُسلم شہری کے فرائض کی چند مثالیں بیان کرنے کے بعد اب میں وہ احکام بیان کرتا ہوں جو تمدن کا ایک زبردست جزو ہیں لیکن عام طور پر لوگ انکی طرف توجہ نہیں

کرتے۔ میری مراد ان احکام سے یتامیٰ کے حقوق ہیں۔ کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جس کے یتامیٰ کا پورا انتظام نہ ہو۔ اسلام نے اس شاخ تمدن کے احکام کو بھی نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔

یتامیٰ کیلئے حکم ہے کہ انکا کوئی گارڈین مقرر کیا جائے جو قریبیوں کی موجودگی میں سب سے قریبی رشتہ دار ہونا چاہیئے۔ ان کے اموال کو بالکل محفوظ رکھا جائے جو گارڈین مقرر ہو اگر غریب ہو تو بقدر محنت اسے کچھ معاوضہ دیا جائے۔ اگر امیر ہو تو مفت کام کرے۔ یتیموں کو جاہل نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ جو پیشہ ان کے مناسب حال ہو انکا آبائی پیشہ یا جس کیطرف انکو خاص رغبت ہو ان کو سکھایا جائے۔ ان کے اخلاق کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔ نہ تو اسقدر آزاد رکھا جائے کہ ان کے اخلاق بگڑ جائیں اور نہ اسقدر سختی کیجائے کہ ان کے طبعی قوٰے بالکل دب جائیں اور ترقی کرنے کا مادہ ہی بالکل جاتا رہے۔ ان سے معاملہ کرتے ہوئے محبت اور پیار کے پہلو کو خاص طور پر مدنظر رکھا جائے کیونکہ ان کے دل نرم ہوتے ہیں۔ اور وہ اس نعمت سے جو سب سے زیادہ قیمتی ہے یعنی والدین کی محبت، اس سے محروم ہوتے ہیں۔ جب وہ بالغ ہو جائیں تو اسوقت سے حکومت ان کی عقل اور تجربہ کا خیال رکھنا شروع کرے۔ اور اگر انمیں اپنے مال کی حفاظت کی صلاحیت دیکھے اور جس وقت دیکھے ان کے مال ان کے سپرد کر دے۔ لیکن اگر ان کی عقل میں فتور معلوم ہو یا عقل میں اسقدر کمزوری معلوم ہو کہ وہ اپنے اموال کی حفاظت ہی نہیں کر سکتے تو ان کو ان کی جائداد نہ دی جائے بلکہ وہ برابر زیر نگرانی رہے اور اسمیں سے ان کے کھانے کپڑے وغیرہ کے ضروری اخراجات ادا کئے جایا کریں۔

لین دین کے معاملات

تمدنی معاملات میں سے ایک اہم شاخ آپس کے لین دین کے تعلقات بھی ہیں۔ کیونکہ ہمیشہ انسان پر ایسے وقت آتے رہتے ہیں کہ وہ ان اوقات میں دوسروں سے مدد لینے کا محتاج ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اس کی یہ حالت عارضی ہوتی ہے وہ اس مدد کو واپس

بھی کرنا چاہتا ہے۔ اس حالت کا علاج اسلام نے قرض یا رہن بتایا ہے یعنی چاہیئے کہ جو شخص امداد کا محتاج ہو اسکو مالدار لوگ حسب ضرورت اور قابلیت ادائگی قرض دیں خواہ کوئی چیز رکھ کر یا یونہی۔ اس کے لئے اسلام نے یہ حکم دیئے ہیں کہ قرض کے معاملہ کو تحریر میں لایا جائے اور یہ امر اختیاری نہیں بلکہ اسلام نے اس کو فرض مقرر کیا ہے کیونکہ تمدن کی خرابی میں بہت کچھ دخل قرضوں کے جھگڑوں کا بھی ہوتا ہے۔ اور فرمایا کہ اگر قرض لینے والا ان پڑھ ہے تو وہ دوسرے سے لکھوائے۔ اور اس تحریر پر کم سے کم دو گواہوں کی گواہی ثبت ہو۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ قرض کی ادائگی کے لئے وقت مقرر کیا جائے کیونکہ یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض دفعہ اسوجہ سے فساد پڑ جاتا ہے کہ قرض دینے والا سمجھتا ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں روپے واپس مل جائینگے۔ اور لینے والا خیال کرتا ہے کہ میں جلدی روپیہ مہیا نہیں کر سکتا۔ پھر فرمایا کہ قرض لینے والے کو چاہیئے کہ وقت پر قرض ادا کر دے۔ لیکن اگر ان واقعات کے ذریعہ سے جو اس کے اختیار میں نہ تھے وہ قرض ادا کرنے پر قادر نہیں تو پھر قرض دینے والے کو چاہیئے کہ میعاد کو بڑھا دے اور اس پر سہولت کا زمانہ آنے تک وصولی کو پیچھے ڈال دے لیکن اگر قرض وصول کرنیوالے کو خود بھی سخت ضرورت پیش آ جائے تو چاہیئے کہ مسلمانوں میں سے کوئی شخص اسجگہ کے صاحب مقدرت لوگوں سے چندہ جمع کر کے قرضہ ادا کر دے۔ مگر شرط یہ ہے کہ قرضہ لینے والے کو کوئی سچی مجبوری ہو اس کی کسی غفلت یا شرارت کا دخل نہو۔ اور اگر کوئی قرض لینے والا مر جائے پیشتر اس کے کہ قرض ادا کرے تو اس کی جائداد میں سے قرض ادا کیا جائے۔ اور اگر جائداد بھی نہو تو رشتہ دار اسکا قرض ادا کریں۔ اور اگر رشتہ دار بھی نہوں تو حکومت اسکا قرض ادا کرے۔

حکومت کو خاص حالات میں قرضوں کی ادائگی کا ذمہ وار قرار دیکر اسلام نے قرض کے طریق کو نہایت آسان کر دیا ہے۔ اس حکم کی وجہ سے مالدار لوگوں پر اپنے غریب بھائیوں کی مدد کرنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ اس حکم سے لوگ ناجائز فائدے بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اول تو کوئی شخص پسند نہیں کریگا کہ وہ اپنا روپیہ کسی کو اس خیال سے دیدے کہ اگر یہ بے جائداد کے مر گیا تو مجھے روپیہ حکومت دے دیگی۔ دوسرے چونکہ حکومت یہ دیکھیگی کہ قرض ضروری تھا اور جائز تھا اور مرنیوالا اپنی سچی مجبوریوں کی وجہ سے اسکو ادا نہیں کر سکا۔ قرض دینے والے کو یہ خطرہ بھی لگا رہیگا

کہ شاید میرا روپیہ نہ ملے اور وہ حقیقی ضروریات پر ہی قرض دیگا۔

ایسے اموال فروخت نہ کریں جو ناقص مصالح سے بنے ہوئے ہوں اور انکو معلوم ہو کہ یہ ناقص ہیں۔ گو انکی شکل اچھی ہو۔ اسی طرح یہ بھی منع ہے کہ ظاہری نقص کو چھپا کر رکھے مثلاً اگر غلہ گیلا ہو گیا ہے تو جائز نہیں کہ اوپر خشک غلہ رکھکر گیلے غلہ کو چھپا لے۔ اور اسی طرح یہ جائز نہیں کہ مثلاً پھٹے ہوئے تھان کے ناقص حصہ کو دبا کر رکھے بلکہ چاہیئے کہ نقص کو گاہک پر ظاہر کر دے۔ اور اگر کوئی بلا نقص کے اظہار کے سودا فروخت کرتا ہے تو گاہک کا حق ہوگا کہ مال واپس کر کے اپنی قیمت لے لے۔ اور پھر ایک ہدایت یہ ہے کہ سودا ہو چکنے کے بعد اور مال وصول کر لینے اور روپیہ دینے کے بعد بیع فسخ نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح یہ حکم ہے کہ مال کی دو قیمتیں مقرر نہ کرے مثلاً یوں نہ کرے کہ ہوشیار آدمی کو زیادہ مال دے اور بچہ یا ناواقف کو کم۔ کیونکہ گو اسکا اختیار ہے کہ جو چاہے اپنے مال کی قیمت مقرر کرے مگر اسکو یہ حق نہیں جس سے جو قیمت چاہے لے لے۔ ہاں اگر کوئی خریدار ایسا ہے کہ اس سے کوئی خاص ذاتی تعلق ہے تو اسکے ساتھ رعایت کر سکتا ہے۔ جیسے رشتہ دار یا استاد یا کوئی ہمسایہ۔ تاجر وغیرہ۔

اسیطرح اسلام حکم دیتا ہے کہ تاجر جب کسی چیز کو فروخت کرے تو یا تو اسے لکھ لے یا اس پر گواہ مقرر کرے تا ایسا نہ ہو کہ ایک شخص پہلے کسی کے پاس ایک چیز فروخت کرے اور پھر خریدار پر چوری کا الزام لگا دے یا قیمت کی وصولی کا دعویٰ دوبارہ کر دے یا چوری کی چیز فروخت کر دے۔ اور جب خریدار پکڑا جائے تو تاجر اس کے پاس بیچنے سے انکار کر دے۔ پس اسلام ان سب باتوں کو روکتا ہے۔

اِسی طرح اسلام حکم دیتا ہے کہ جو چیز کوئی خریدے اسکو بغیر وزن کئے یا دیکھے دوسرے کے آگے فروخت نہ کرے۔ کیونکہ اسمیں جھگڑوں کا دروازہ کھلتا ہے۔ کیونکہ خرید میں چونکہ دو واسطے پڑ جائینگے ہر اک بیچنے والوں میں سے یہ کہیگا کہ میں نے تو چیز اچھی دی تھی دوسرے نے خراب کر دی ہوگی پس اسلام کہتا ہے کہ دونا تاجر متواتر بے دیکھے اور وزن کئے کوئی چیز فروخت نکریں۔

اسیطرح اسلام حکم دیتا ہے کہ جھوٹے مقابلہ سے قیمت نہ بڑھائی جائے۔ مثلاً یہ نہ کیا

جائے کہ تاجر ایک اپنے ساتھی کو سکھا کر کھڑا کر دے۔ اور وہ ایک چیز کے زیادہ دام دینے پر تیار ہو جائے اور اسطرح گاہک کو یہ بتایا جائے کہ اب اس چیز کی قیمت بڑھ گئی ہے اور لوگ اسے زیادہ قیمت پر خریدنے کے لئے تیار ہیں۔ اور نہ نیلام کے وقت جھوٹی بولی دلوا کر قیمت کو بڑھایا جائے۔

اِسیطرح اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ باہر سے آنیوالے تاجروں کو شہر سے باہر جا کر نہ ملا جائے بلکہ پہلے انکو منڈی میں آنے دیا جائے تا انکو اصل بھاؤ معلوم ہو جائے۔ اور نہ ان کو کوئی نقصان ہو اور نہ خرید و فروخت میں کوئی فساد ہو۔

اِسی طرح اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ غیر معین اشیاء کی خرید و فروخت نہ کی جائے بلکہ چیز کو دیکھ کر خریدا جائے۔ خواہ خود خواہ اپنے کسی ایجنٹ کی معرفت۔ یہ نہ کیا جائے کہ جوئے کیطرح چیزیں خریدی جائیں۔ مثلاً اس طرح بیع نہ کریں کہ فیصلہ کر لیں کہ جس تھان کو کنکری لگ جائے وہ ایک پہلے سے مقرر کی ہوئی قیمت پر خریدار کا ہو جائیگا۔ اور نہ اسی قسم کے ذرائع کو استعمال کر کے خرید و فروخت کریں۔ اس حکم سے اسلام نے وہ غیر طبعی طریق جو لاٹری کے نام سے موسوم ہے اسکو بالکل روک دیا ہے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ طریق واقع میں فطرت صحیحہ کے مخالف نہیں؟ یہ طریق یقیناً ایک جوئے کی قسم ہے اور ایسا ہی بُرا ہے جیسے کہ جوئے کی کوئی ادنےٰ سے ادنےٰ قسم ۔

کانفرنسوں مجلسوں اور دعوتوں کے متعلق احکام اور آداب

آپس کے برادرانہ تعلقات جو خاندانی تعلقات کہلا سکتے ہیں اور جن کی اقسام میں اِسوقت بیان کر رہا ہوں۔ انمیں سے ایک قسم مجالس اور دعوتوں کے آداب بھی ہیں۔ برادری کے اکثر کام کانفرنسوں مجلسوں اور دعوتوں کے ذریعے ہی طے ہوتے ہیں۔ اور ان اجتماعوں کا انسانی تمدن پر ایک نہایت وسیع اور گہرا اثر پڑتا ہے۔ پس میں اِس حصہ کے متعلق جو احکام اسلام نے دیئے ہیں انکو بھی بیان کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

دعوتوں کے متعلق تو اسلام کے احکام یہ ہیں۔ کہ جو لوگ دعوت میں بلائے جائیں

انکو چاہیئے کہ جہاں تک ہوسکے دعوت کو قبول کریں۔ کیونکہ دعوت محبت کی زیادتی کے لئے ہوتی ہے اور بے محل انکار محبت کو قطع کرتا ہے۔ پھر حکم ہے کہ دعوت کے موقع پر کوئی شخص بن بلائے نہ جائے۔ اور کوئی شخص کسی کے ساتھ چلا جائے تو چاہیئے کہ جس کے ساتھ وہ جائے وہ پہلے صاحب خانہ سے اجازت لے لے۔ اسی طرح یہ حکم ہے کہ کھانے کیوقت سے پہلے جاکر لوگ نہ بیٹھیں بلکہ مقررہ وقت پر جائیں۔ کھانے کیوقت صفائی کا خیال رکھیں۔ ہاتھ دھوکر بیٹھیں۔ حرص کے ساتھ نہ کھائیں۔ اور اپنے آگے سے کھائیں۔ کھانا کھاتے وقت کھانے کی مذمت نہ کریں۔ نہ اس قسم کی تعریف کریں کہ اس سے رذالت اور خوشامد ٹپکتی ہو۔ جب کھانا کھا چکیں۔ تو ہاتھ دھوئیں۔ اور دعا کریں جسمیں صاحب خانہ اور اس کے رشتہ داروں کے لئے جنہوں نے اس کھانے کے تیار کرنے میں تکلیف اٹھائی تھی۔ اللہ تعالےٰ سے فضل اور برکت طلب کریں۔ اگر صاحب خانہ کیطرف سے ایسی کوئی درخواست یا التجا ہو تو وہاں بیٹھے نہ رہیں۔ بلکہ جلد فارغ ہوکر رخصت ہوجاویں۔

کانفرنسوں اور مجالس کے متعلق اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ صرف تین قسم کی انجمنیں اور کانفرنسیں مفید ہوسکتی ہیں۔

اول مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ۔ جن انجمنوں کا کام غرباء کی خبرگیری اور حاجتمندوں کی حاجت روائی ہو۔ دوسرے مَنْ أَمَرَ بِمَعْرُوفٍ جو علوم اور فنون کی تحقیق اور ترویج اور تعلیم اور اشاعت کی غرض سے بنائی گئی ہوں۔ اور تیسرے مَنْ أَمَرَ بِإِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ جو فسادوں اور جھگڑوں کے مٹانے کے لئے بنی ہوں۔ خواہ اہلی فسادوں کے دور کرنے کے لئے خواہ ملکی خواہ قومی خواہ بین الاقوامی فسادوں کے دور کرنے کے لئے خواہ ملکوں یا قوموں کے سیاسی انتظامات چلانے کے لئے کہ وہ بھی اصلاح کا ہی کام کرتے ہیں۔ (نساء ع ۱۷)

ان کانفرنسوں اور انجمنوں کے انتظامات کے متعلق اسلام یہ تعلیم دیتا ہے۔ اول جب کسی قسم کی کوئی مجلس ہو تو چاہیئے کہ سب لوگ اس امر کو مدنظر رکھیں کہ اس جگہ پر بہت سے لوگ جمع ہوں گے اور ایسی جگہوں میں کثرت انفاس سے بُو پیدا ہوجاتی ہے اس کو ہم اور

نہ بڑھائیں۔ وہ کوئی بُودار چیز کھاکر جس سے منہ میں سے بُو آنے لگتی ہو۔ جیسے پیاز لہسن وغیرہ یا حقہ اور سگرٹ وغیرہ قسم کی چیزیں استعمال کرکے نہ جائیں تا باقی ساتھیوں کو تکلیف نہ ہو۔

دوسرے ایسے موقع پر خوب صفائی کرکے اور نہا دھوکر اور اگر ہوسکے تو خوشبو لگا کر جانا چاہیئے۔ تاکہ طبیعت میں نشاط پیدا ہو اور ہوا صاف ہو۔

تیسرے مجلس کا حلقہ بڑا بناکر بیٹھیں تا ایکدوسرے کے تنفس سے لوگ تکلیف نہ اٹھائیں۔

چوتھے یہ کہ جسکو کوئی متعدی مرض ہو وہ ان جگہوں میں نہ جائے جن میں لوگ جمع ہوتے ہیں کیونکہ اس طرح ان لوگوں کو اس مرض کے لگنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس حکم کی اس قدر تاکید ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک کوڑھی کو حج بیت اللہ سے روکدیا اور کہا کہ اپنے گھر میں زیادہ بیٹھا کرو۔ اختلاط کی جگہوں میں نہ جایا کرو تاکہ لوگوں کو بیماری نہ لگے۔

پانچویں جب کوئی شخص کلام کرنے کے لئے کھڑا ہو تو لوگوں کو چاہیئے کہ اس کیطرف منہ کرکے توجہ سے کلام سنیں اور اس کی بات کو قطع نہ کریں اور دوران تقریر میں شور نہ کریں خواہ وہ کسقدر ہی طبیعت کے برخلاف کیوں نہ ہو۔

چھٹے یہ کہ جب بولیں آہستگی اور وقار سے بولیں۔ ایسی طرز پر کلام نہ کریں کہ لوگ سمجھ ہی نہ سکیں۔

ساتویں یہ کہ جب مجلس میں کوئی اور شخص آجائے تو اس کے لئے جگہ بنادیں۔

آٹھویں یہ کہ اگر کسی شخص کو کوئی ضرورت پیش آجائے تو وہ اجازت لیکر جائے۔ بلا اجازت صدر وہاں سے باہر نہ نکلے۔

نویں یہ کہ جب کوئی شخص عارضی طور پر جائے اور پھر اسکے واپس آنے کا ارادہ ہو تو اسکی جگہ پر کوئی اور نہ بیٹھے۔

دسویں یہ کہ دو شخص جو پاس پاس بیٹھے ہوں اور یہ معلوم ہو کہ کسی غرض سے پاس بیٹھے ہیں تو خواہ ان کے درمیان کوئی جگہ خالی بھی ہو وہاں نہ بیٹھے۔

گیارہویں یہ کہ جس مجلس میں تین آدمی ہوں وہ ایسی حالت میں آپس میں کلام

کریں کہ تیسرے آدمی کے دل میں وسوسہ پیدا ہو کہ یہ شاید میرے متعلق بات کرتے ہیں۔

بارھویں یہ کہ کلام ترتیب سے کریں یکدم باتیں شروع نہ کریں۔

تیرھویں یہ کہ جب کلام شروع کریں صدر کو مخاطب کریں۔

یہ مختصر نقشہ اُن تمدنی احکام کا ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے یا آپ کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق ہم نے اسلامی تعلیم سے اخذ کیا ہے۔

پس یہ سچا اسلامی تمدنی نقشہ ہے اور ساتھ ہی خالص احمدی نقشہ ہے۔

اہلی زندگی کے متعلق اسلامی تمدنی احکام بیان کر چکنے کے بعد اب میں اُن احکام کو بیان کرتا ہوں جو اسلام نے حکومت اور رعایا کے تعلقات یا اُمراء اور غرباء کے تعلقات کے متعلق بیان فرمائے ہیں۔

تمدن کی دوسری قسم

یعنے

حکومت اور رعایا یا امیر اور غریب کے متعلق احکام

جب میں یہ کہتا ہوں کہ امیر اور غریب تو میری مراد اس سے وہ فاقہ زدہ لوگ نہیں ہیں جو لوگوں کے صدقہ اور احسان پر پلتے ہیں۔ بلکہ اس سے میری مراد وہ لوگ ہیں جو اسقدر سرمایہ نہیں رکھتے کہ بنی نوع انسان کے کسی حصہ کو اپنا ماتحت بنا کر رکھ سکیں۔ اور میں نے امیر اور غریب کے الفاظ جان بوجھ کر چنے ہیں۔ اس لئے کہ جو مضمون میں آگے بیان کرنے لگا ہوں وہ انہی ناموں سے اچھی طرح بیان ہو سکتا ہے۔

اس ہیڈنگ کے ماتحت سب سے پہلے یہ سوال ہوتا ہے کہ اسلام حکومت کی کیا تعریف کرتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک حکومت اُس نیابتی فرد کا نام ہے جسکو لوگ اپنے مشترکہ حقوق کی نگرانی سپرد کرتے ہیں۔ اس مفہوم کے سوا اسلام میں اور کوئی مفہوم اسلامی نقطہ نگاہ کے مطابق نہیں اور سوائے نیابتی حکومت کے اسلام اور کسی

حکومت کا قائل نہیں۔ قرآن کریم نے اس مفہوم کو ایک نہایت ہی عجیب لفظ کے ساتھ ادا کیا ہے۔ اور وہ لفظ امانت ہے۔ قرآن کریم حکومت کو امانت کہتا ہے۔ یعنی وہ اختیار لوگوں نے کسی شخص کو دیا ہو۔ نہ وہ جو اُس نے خود پیدا کیا ہو یا بطور ورثہ کے اس کو مل گیا ہو۔ یہ ایک لفظ ہی اسلامی حکومت کی تمام کیفیات کو بیان کرنے کے لئے کافی ہے۔

قرآن کریم میں حکومت کا ذکر بادشاہ سے شروع کر کے رعایا کیطرف نہیں چلایا گیا۔ بلکہ ملک کے لوگوں سے شروع کر کے حاکم کیطرف لیجایا گیا ہے۔ میرے نزدیک اسکا پورا لطف حاصل نہیں ہوگا جبتک میں اس آیت کو ہی پیش نہ کردوں جس میں اسلامی حکومت اور اس کے فرائض کو نہایت ہی مختصر لیکن محیط الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (نساء۔ ع ۸) اللہ تعالےٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ حکومت کی امانتوں کو ان کے حق دار لوگوں کے سپرد کرو۔ اور جب اے حاکمو! تم حاکم ہو جاؤ تو انصاف کے ساتھ حکمرانی کرو۔ اللہ تعالےٰ جس امر کی تم کو نصیحت کرتا ہے وہ بہت اچھی ہے۔ اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

اس آیت میں پہلے تو عامۃ الناس کو مخاطب کیا ہے کہ حاکم بنانا تمہارے اختیار میں ہے۔ تمہارے سوا اور کوئی شخص حاکم بنانے کا مجاز نہیں۔ گویا ورثہ کے ذریعہ سے کوئی شخص حاکم نہیں بن سکتا۔ کسی شخص کو حق نہیں کہ محض کسی کا بیٹا ہونے کے سبب سے لوگوں کی گردنوں پر حکومت کا جُوآ رکھے۔ دوسرا امر یہ بتایا کہ یہ حکومت کے حقوق ایک قیمتی چیز ہیں۔ جس طرح کہ امانت قیمتی ہوتی ہے۔ پس کسی ایسے شخص کے سپرد نہ کرنا جو اس کے قابل نہ ہو۔ بلکہ اسی شخص کے سپرد کرنا جو دیانتداری سے اس امانت کو محفوظ رکھے۔

تیسرا حکم یہ دیا ہے کہ چونکہ حکومت کوئی مستقل چیز نہیں بلکہ اُن حقوق کو کسی شخص کے سپرد کر دینے کا نام ہے جنکو بوجہ بہت سے لوگوں کے اشتراک کے لوگ فرداً فرداً ادا نہیں کر سکتے۔ اس لئے اسکو امانت خیال کرنا چاہیئے کیونکہ وہ حقوق و فرائض جنکے مجموعے کا نام

حکومت ہے کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں۔ بحیثیتِ مجموعی جماعت انکی مالک ہے۔

چوتھا حکم حاکم کو یہ دیا گیا ہے کہ جو کچھ تم کو دیا جاتا ہے وہ چونکہ بطور امانت کے ہے اسکو اسی طرح محفوظ بلا خراب یا تباہ کرنے کے اپنی موت کیوقت واپس دینا ہو گا۔ یعنی حکومت کی پوری حفاظت اور اہلِ ملک کے حقوق کی نگرانی رکھنی ہوگی۔ اور یہ تمہارا اختیار نہ ہوگا۔ کہ اس حق میں کوئی نقصان کر دو۔

پانچواں امر اس آیت سے یہ نکلتا ہے کہ حکام کو چاہیئے کہ دورانِ حکومت میں لوگوں کے حقوق کو پوری طرح ادا کریں اور کسی قسم کا فساد پیدا نہ کریں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اس معاملہ میں کمزوری دکھائینگے اور دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی پھر بادشاہت کیطرف رجوع کریں گے۔ مگر فرماتا ہے کہ جو نصیحت ہم نے کی ہے کہ وراثت کی بادشاہت کے قریب بھی نہ جاؤ بلکہ انتخاب کے ساتھ بہترین دماغوں کو حکومت کے لئے منتخب کیا کرو۔ وہی اچھی اور مفید ہے۔ اور اللہ تعالےٰ سننے والا دیکھنے والا ہے یعنی دنیا کی مصیبتوں کو دیکھ کر اور انکی دعاؤں کو سُن کر ہم نے یہ طریقِ حکومت تم کو بتایا ہے۔ پس اسکی ناقدری اور ناشکری نہ کرنا۔

مذکورہ بالا آیت سے یہ تو واضح ہو گیا کہ اسلامی حکومت انتخابی ہوتی ہے اور ساتھ ہی نیابتی بھی یعنی یہ سمجھا جاتا ہے کہ بادشاہ ملک کے لوگوں کا ان کی مجموعی حیثیت میں نہ بحیثیت افراد نائب ہے۔ مگر اب میں اسلامی حکومت کا ایک مختصر نقشہ کھینچ دیتا ہوں جس سے اس کے تمام پہلو ذہن میں مستحضر ہو سکیں۔

اِسلام کا یہ حکم ہے کہ مسلمان مل کر ایک ایسے شخص کو جسے وہ اس کام کے لائق سمجھیں منتخب کریں کہ وہ حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے۔ اس شخص کا انتخاب مغربی ممالک کے پریزیڈنٹوں کیطرح چند سال کے لئے نہیں ہوتا بلکہ ساری عمر کیلئے ہوتا ہے۔ اور اس انتخاب کے بعد پھر اللہ تعالےٰ ہی اسکو اس منصب سے برخواست کر سکتا ہے یعنی اُسے وفات دے کر۔ اس شخص کے ہاتھ میں تمام وہ طاقتیں اور اختیارات ہوتے ہیں جو حکومت کو حاصل ہوتے ہیں۔ مگر اس شخص کا فرض ہوتا ہے کہ اپنی ساری عمر کو ملک کی بہتری کے لئے صرف کر دے کہ

اپنی بڑائی کے حصول کے لئے۔ اسکا حق بیت المال پر سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ وہ اپنے ملک کی ضروریات پر صرف کرے۔ اپنے لئے وہ آپ گزارہ مقرر نہیں کر سکتا بلکہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کی مجلس شوریٰ اس کے لئے گزارہ مقرر کرے۔ اس کا فرض ہے کہ ایک مجلس شوریٰ کے ذریعہ سے ملک کی عام رائے کو معلوم کرتا رہے اور جب ضرورت ہو عام اعلان کر کے تمام افراد سے انکی رائے دریافت کرے۔ تاکہ اگر کسی وقت ملک کے نمائندوں اور ملک کی عام رائے کی مخالفت ہو جائے تو ملک کی عام رائے کا علم ہو سکے۔ اس سے امید کیجاتی ہے کہ کثرت رائے کا احترام کرے۔ لیکن چونکہ یہ ہر قسم کی سیاسی جنبہ داری سے بالا ہو چکا ہے اور حکومت میں اسکو ذاتی کوئی فائدہ نہیں۔ اس لئے اسکی رائے کی نسبت یقین کیا گیا ہے کہ بالکل بے تعصب ہوگی اور محض ملک و ملت کا فائدہ اسے مدنظر ہوگا۔ اور اس لئے بھی کہ ملک کی عام رائے کا نائب ہونیکے سبب سے یہ ایمان لایا جاتا ہے۔ اور اسلام وعدہ کرتا ہے کہ اسے خدا تعالیٰ کی طرف سے خاص نصرت حاصل ہوگی پس اسکو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ کسی خاص ضرورت سے جو نہایت اہم ہو مشیر کاروں کی کثرت رائے کے فیصلہ کو رد کر دے تو وہ ایسا کر سکتا ہے پس وہ خود مختار ہے ان معنوں میں کہ وہ شوریٰ کے فیصلہ کو مسترد کر سکتا ہے۔ اور وہ پابند ہے ان معنوں میں کہ وہ اسلام کے مقرر کردہ نظام کے ماتحت ہے جسے بدلنے کا اسے کوئی اختیار نہیں۔ اور مجبور ہے اس پر کہ بغیر مشورہ کے کوئی فیصلہ نہ کرے اور اس پر کہ حکومت کو موروثی ہونے سے بچائے۔ اور وہ منتخب ہے ان معنوں میں کہ خدا تعالےٰ لوگوں کے ذریعے سے اسے منتخب کراتا ہے۔ اور نیابتی حیثیت رکھتا ہے ان معنوں میں کہ اس سے امید کی جاتی ہے کہ وہ سوائے کسی غیر معمولی ضرورت کے اہم امور میں کثرت رائے کے خلاف نہ جائے۔ اور یہ کہ اسکو اپنی ذات کے لئے بیت المال پر کوئی تصرف نہ ہو۔ اور وہ آسمانی طاقت رکھتا ہے ان معنوں میں کہ اسکو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ خدا تعالےٰ کی خاص نصرت اسے حاصل ہوتی ہے۔

ان اصول کے علاوہ باقی تفاصیل شوریٰ کے انتخاب اور گورنروں کے انتخاب کے متعلق ضروریاتِ وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلام نے جان بوجھ کر چھوڑ دی ہیں تاکہ انسانی دماغ کو فروعات میں اپنے طور پر غور کرنے اور ترقی کرنے کا موقع ملے جو خود انسانی عقل کے

ارتقاء کے لئے ضروری امر ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ اے مسلمانو! ہر اک تفصیل رسول سے نہ پوچھا کرو کیونکہ بعض باتیں خدا تعالیٰ خود چھوڑ دیتا ہے تا تمہارے اجتہاد کے لئے بھی ایک میدان باقی رہے۔ اگر سب باتیں قرآن ہی بتا دے اور تمہاری دماغی ترقی کے لئے کوئی میدان نہ چھوڑے تو یہ امر تم کو تکلیف اور دکھ میں ڈالنے کا موجب ہوگا اور تمہاری ترقیات کے لئے حارج۔

بیشک حکومتوں کے اور طریق بھی دنیا میں موجود ہیں لیکن ہر اک شخص جو اسلامی طریق حکومت پر غور کریگا اسکو تسلیم کرنا ہوگا کہ اس سے بہتر اور کوئی طریق نہیں۔ اس طریق میں ایک طرف تو بہترین نیابتی طریق حکومت شامل ہے اور دوسرے اسکو پارٹی فیلنگز سے بھی بالکل بالا کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اسلامی حاکم کسی خاص پارٹی کی مدد یا نصرت کا محتاج نہیں ہوتا۔ پس وہ صرف ملکی فائدہ کو مدنظر رکھتا ہے۔ عمر بھر کے لئے مقرر ہونے کے سبب سے بہترین دماغ ناقابل عمل اور متروک نہیں کئے جاتے بلکہ ملک کا ایک ایک شخص آخر تک ملک کی خدمت میں لگا رہتا ہے۔

گورنروں کا انتخاب گو خلیفہ کے اختیار میں ہے مگر اس میں بھی لوگوں کی عام رائے کا خیال رکھنا ضروری سمجھا گیا ہے۔ ہم لوگوں کے نزدیک یہی طریق حکومت حقیقی ہے۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ جُوں جُوں لوگ احمدیت میں داخل ہوتے چلے جائینگے اپنی مرضی سے بلا کسی جبر کے خود اِس طریق حکومت کی عمدگی کو تسلیم کر لینگے۔ اور بادشاہ بھی ملک کے فائدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے موروثی حقوق کو خوشی سے ترک کر دینگے۔ اور اپنے حق کو اسی حد تک محدود رکھیں گے جس حد میں کہ ملک کے دوسرے افراد کے حقوق محدود کئے گئے ہیں۔

چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے صرف روحانی خلافت دیکر بھیجا تھا اِس لئے آئندہ جہانتک ہو سکے آپکی خلافت اُس وقت بھی جب کہ بادشاہتیں اس مذہب میں داخل ہونگی سیاسیات سے بالا رہنا چاہتی ہے۔ وہ لیگ آف نیشنز کا اصلی کام سرانجام دیگی اور مختلف ممالک کے نمائندوں سے مل کر ملکی تعلقات کو درست رکھنے کی کوشش کریگی اور خود مذہبی۔ اخلاقی۔ تمدنی اور علمی ترقی اور اصلاح کیطرف متوجہ رہیگی تاکہ پچھلے زمانہ کی طرح اس کی توجہ کو سیاست ہی اپنی طرف کھینچ نہ لے۔ اور دین و اخلاق کے اہم امور بالکل نظرانداز نہ ہو جائیں۔

جب مَیں نے کہا وہ جہانتک ہو سکے، تو میرا یہ مطلب ہے کہ اگر عارضی طور پر کسی ملک کے لوگ کسی مشکل سے رفع کرنے کے لئے استمداد کریں تو انکے ملک کا انتظام نیابتاً خلافت روحانی کرا سکتی ہے۔ مگر ایسے انتظام کو کم سے کم عرصہ تک محدود رکھا جانا ضروری ہوگا۔

حقوق و فرائضِ حکومت اسلامی

اِسلامی حکومت کی شکل بیان کرنے کے بعد اب مَیں اُن حقوق کو بیان کرتا ہوں جو اسلام حکومت کو دیتا ہے۔ اور اُن فرائض کو بھی جو اسلام حکومت پر عاید کرتا ہے۔

سب سے پہلا فرض جو اسلام حکومت پر مقرر کرتا ہے یہ ہے کہ حکومت رعایا کے فوائد اور منافع اور ضروریات اور اتفاق اور اخلاق اور حفاظت اور معیشت اور مسکن کی ذمہ دار ہے چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کُلّکم راعٍ وکُلّکم مسئولٌ عن رعیّتہ۔ الامام راعٍ ومسئولٌ عن رعیّتہ والرّجل راعٍ فی اھلہ ومسئولٌ عن رعیّتہ والمرأۃ راعیۃٌ فی بیت زوجھا ومسئولۃ عن رعیتھا والخادم راعٍ فی مال سیّدہ ومسئولٌ عن رعیّتہ فکلّکم راعٍ ومسئولٌ عن رعیّتہ (متفق علیہ) تم میں سے ہر ایک مثل گڈریے کے ہے اور اُن لوگوں یا چیزوں کے متعلق پورا ذمہ وار ہے جو اس کے سپرد کئے گئے ہیں۔ بادشاہ کے سپرد ایک جماعت کیگئی ہے اور وہ ان کا ہر طرح ذمہ وار اور جوابدہ ہے۔ اور ہر مرد کے سپرد ایک خاندان ہے اور وہ اس خاندان کا ذمہ وار اور جوابدہ ہے۔ اور عورت کے سپرد اولاد کی تربیت اور گھر کی حفاظت ہے اور وہ اس کی ذمہ وار اور جوابدہ ہے۔ اور نوکر کے سپرد اس کے آقا کی جائداد اور مال ہے اور وہ اسکا ذمہ وار اور جوابدہ ہے۔

اِس حکم سے ظاہر ہے کہ اسلام نے بادشاہ کو مثل گڈریے کے قرار دیا ہے۔ جس کے سپرد مالک ایک ریوڑ کرتا ہے پس جس طرح اُس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اُسے بکھرنے اور پراگندہ نہ ہونے دے۔ بھیڑیے کے حملہ سے بچائے۔ اسکی صحت کا خیال رکھے۔ خوراک کا خیال رکھے۔

مکان کا خیال رکھے۔ غرض ہر قسم کی ضرورتوں کا خیال رکھے۔ اسی طرح حکومتِ اسلامیہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے علاقہ کے لوگوں کو تفرقہ اور فساد اور ایک دوسرے کے خلاف ظلم اور بیرونی حملوں سے بچائے۔ اور انکی تمام ضروریات کا فکر رکھے خواہ وہ علوم کے متعلق ہوں خواہ تربیت کے۔ خواہ خوراک کے خواہ رہائش کے۔ خواہ صحت کے خواہ اور کسی قسم کی ہوں۔

یہ تعلیم تو عام ہے۔ اس کے علاوہ تفصیلی فرائض یہ ہیں۔ کہ اسلامی حکومت اس امر کی ذمہ وار رکھی گئی ہے کہ وہ ہر اک شخص کے لئے خوراک۔ لباس اور مکان مہیا کرے۔ یہ ادنے سے ادنے ضروریات ہیں جن کا پورا کرنا حکومت کے ذمہ ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ چیز ہی جس کی حفاظت اس کے سپرد کی گئی ہے زندہ نہیں رہ سکتی۔ مکان اور خوراک کے بغیر جسمانی زندگی محال ہے۔ اور لباس کے بغیر اخلاقی اور تمدنی زندگی محال ہے۔

اصُولی احکام جن کو مَیں پہلے بیان کر چکا ہوں ان کا جو مفہوم مسلمانوں نے سمجھا اور جس طرح ان پر تفصیلی ضروریات کے مطابق عمل کیا۔ وہ میرے نزدیک مثالوں سے اچھی طرح سمجھ میں آجائیگا۔

مَیں نے بتایا ہے کہ انسانی ضروریات کا ان لوگوں کے لئے مہیا کرنا جو انکو مہیا نہیں کر سکتے اسلامی حکومت کا فرض ہے۔ اِس کے متعلق حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ نہایت ہی مؤثر اور کاشفِ حقیقت ہے۔ ایکدفعہ حضرت عمرؓ خلیفۂ ثانی باہر تجسس کر رہے تھے کہ کسی مسلمان کو کوئی تکلیف تو نہیں۔ مدینہ دار الخلافہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں صرار نامی ہے وہاں دیکھا کہ ایک طرف سے رونے کی آواز آرہی ہے۔ اُدھر گئے تو دیکھا ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے رو رہے ہیں۔ اس سے پُوچھا کہ کیا بات ہے؟ اُس نے کہا کہ دو تین وقت کا فاقہ ہے کھانے کو کچھ پاس نہیں۔ بچے بہت بیتاب ہُوئے تو خالی ہنڈیا چڑھادی تا یہ بہل جائیں اور سو جائیں۔ حضرت عمرؓ یہ بات سُنکر فوراً مدینہ کی طرف واپس آئے۔ آٹا۔ گھی۔ گوشت اور کھجوریں لیں اور ایک بوری میں ڈال کر اپنے خادم سے کہا کہ میری پیٹھ پر رکھدے۔ اس نے کہا حضور مَیں جو موجود ہوں۔ میں اُٹھا لیتا ہوں۔ آپؓ نے جوابدیا بیشک تم اس کو تو اٹھا کر لے چلوگے مگر قیامت کے دن میرا بوجھ کون اٹھائیگا؟ یعنی ان کی روزی کا خیال رکھنا میرا فرض تھا اور اس

فرض میں مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے اس لئے اسکا کفارہ یہی ہے کہ میں خود اٹھا کر یہ اسباب لے جاؤں اور ان کے گھر پہنچاؤں۔

چونکہ سارے ملک کی خبر ملنی مشکل ہوتی ہے اس لئے اسلامی حکومت میں یہ انتظام ہوتا تھا کہ سب ملک کی مردم شماری کیجاتی تھی اور پیدائش اور موت کے رجسٹر مقرر کئے گئے تھے اور انکی غرض آجکل کی حکومتوں کی طرح حکومت کے خزانوں کا بھرنا نہیں بلکہ خزانوں کا خالی کرنا ہوتی تھی۔ ان رجسٹروں کے ذریعے سے ملک کی عام حالت معلوم ہوتی رہتی تھی۔ اور جو لوگ محتاج ہوتے انکی مدد کیجاتی۔

مگر اسلام جہاں غرباء کی خبر گیری کا حکم دیتا ہے وہاں جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں سُستی اور کاہلی کو بھی مٹاتا ہے۔ ان وظائف کی یہ غرض نہ تھی کہ لوگ کام چھوڑ بیٹھیں بلکہ صرف مجبُوروں کو یہ وظائف دئے جاتے تھے۔ ورنہ سوال سے لوگوں کو روکا جاتا تھا۔ ایکدفعہ حضرت عمرؓ نے ایک سائل دیکھا اسکی جھولی آٹے سے بھری ہوئی تھی۔ آپؓ نے اس سے آٹا لیکر اونٹوں کے آگے ڈال دیا۔ اور فرمایا اب مانگ۔ اسی طرح یہ ثابت ہے کہ سوالیوں کو کام کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

دوسرا فرض حکومت کا عدل کا قائم کرنا ہے۔ حکومت کا کام ہے کہ قضاء کا اعلےٰ درجہ کا انتظام کرے۔ اسلام نے اسکا خاص طور پر حکم دیا ہے۔ اور قضاء کے لئے یہ احکام مقرر کئے ہیں کہ وہ کسی کی رعایت نہ کریں۔ رشوت نہ لیں۔ ان کے پاس کوئی سفارش نہ کیجائے۔ اور نہ وہ سفارش کو قبول کریں۔ شہادت اور ثبوت پر مقدمہ کا فیصلہ کریں۔ شہادت اور ثبوت مدعی سے طلب کریں ورنہ مدعیٰ علیہ سے قسم لیں۔ شہادت کے موقع پر دیکھ لیں کہ شہادت دینے والے لوگ ثقہ اور معتبر ہیں جھوٹے اور اوباش نہیں ہیں۔ قاضیوں کے متعلق حکم دیا کہ وہ لائق اور کام کے قابل ہوں۔ قاضیوں کے فیصلہ کے متعلق یہ حکم دیا کہ گو قاضی غلطی کر سکتا ہے۔ مگر چونکہ فی مابین اختلافات کا فیصلہ انسانوں نے ہی کرنا ہے جو غلطی سے پاک نہیں ہیں۔ اور چونکہ اگر جھگڑا کسی جگہ پر جاکر ختم نہ ہو تو فساد بڑھتا ہے اس لئے قاضیوں کے فیصلہ کو سب فریق کو قبول کرنا ہوگا خواہ اسکو غلط مانیں یا صحیح۔ اور جو شخص اس امر میں چون وچرا کرے

اور قضاء کے فیصلہ کی ہتک کرے وہ ہرگز ایک مُسلم شہری نہ سمجھا جائے۔ کیونکہ وہ نظام سِلسلہ کو درہم برہم کرتا ہے۔ کمزوروں اور ناسمجھوں کو اپنے حقوق کے سمجھنے میں مدد دینے کے لئے مُفتیوں کا ایک سِلسلہ جاری کیا جو قانون کے واقف ہوں۔ مگر شرط یہ رکھی کہ یہ مفتی صرف حکومت ہی مقرر کر سکتی ہے۔ اپنے طور پر کوئی شخص مفتی نہیں بن سکتا۔

ان فیصلوں کا اجراء حکومت کے اختیار میں رکھا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ ان کے اجراء میں رحم یا لحاظ سے کام نہ لیا جائے خواہ کوئی بڑا آدمی ہو خواہ چھوٹا حتیٰ کہ رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میری بیٹی چوری کرے تو میں اسکو بھی سزا دینے سے دریغ نہیں کرونگا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے لڑکے کو ایک جرم میں خود اپنے ہاتھ سے کوڑے لگائے۔

ایک فرض حکومت کا یہ مقرر کیا گیا ہے کہ ملک کی عزت اور آزادی کی حفاظت کرے۔ قرآن میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ اے مسلمانو! سرحدوں پر ہمیشہ مضبوط چوکیاں بنائے رکھو جو دوسری حکومتوں کے مقابلہ میں ملک کی حفاظت کریں اور امن اور جنگ میں برابر استقلال سے اس امر کا تعہد کرو۔

ایک فرض حکومت کا حفظانِ صحت کا خیال ہے۔ چنانچہ راستوں اور پبلک جگہوں وغیرہ کی صفائی کے متعلق قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتا ہے وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ علاوہ قلبی اور جسمانی صفائی کا خیال رکھنے کے گندگی اور غلاظت کو عام طور پر دُور کر۔ یعنی اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ پبلک صفائی کا خیال رکھے۔ رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ صحابہؓ کو مقرر فرماتے تھے کہ وُہ آوارہ کتوں کو ماردیں تا ان کے جنون کی وجہ سے لوگوں کو نقصان نہ پہنچے۔

ایک فرض اسلامی حکومت کا یہ ہے کہ وہ ملک کی تعلیم کا انتظام کرے۔ اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں رسُول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں سے ایک فرض تعلیم مقرر فرمایا ہے۔ فرماتا ہے وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (سُورہ جمعہ۔ ع ۱) احکام ضروریہ اور ان کی حکمت کا سکھانا اس رسُولؐ کا کام ہے۔ کتاب سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ صرف قرآن کریم مراد ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں علم ہیئت۔ علم نباتات۔ علم تاریخ۔ علم الاخلاق۔ علم طب۔ علم حیوانات وغیرہ کا ذکر ہے

اور انکی طرف توجہ دلائی ہے۔ پس کتاب کے سکھانے میں ان علوم کیطرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ (ابن ماجہ) ہر مسلمان پر علم کا پڑھنا فرض ہے۔ اور آپؐ ہمیشہ اس امر کا خیال رکھتے تھے۔ بدر میں جو پڑھے لکھے لوگ قید ہوئے آپؐ نے ان سے معاہدہ کیا کہ بجائے روپیہ دے کر آزاد ہونے کے وہ مسلمان بچوں کو پڑھائیں۔

ایک فرض حکومتِ اسلام کا یہ ہے کہ وُہ اُن لوگوں کی مدد کرے جو پیشہ تو جانتے ہیں لیکن ان کے پاس کام کرنے کو روپیہ نہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں اسلامی بیت المال میں سے ایک حصہ ایسے لوگوں کے لئے مقرر کیا ہوا ہے۔

ایک فرض یہ ہے کہ وہ اندرونی امن کو قائم رکھے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ اسلامی حکومت کا فرض مقرر کرتا ہے کہ وہ امن کو قائم رکھے۔ اور سخت مذمت ان لوگوں کی بیان کرتا ہے جو لوگ فساد کرتے ہیں۔ اور فرماتا ہے کہ ایسے حاکم جن کی غفلت یا ظلم سے فساد پھیلتا ہے۔ خدا تعالےٰ کے حضور میں سخت مجرم ہیں۔ رسول کریمؐ نے اسلامی حکومت کا یہ نقشہ کھینچا ہے کہ ایک عورت اکیلی سینکڑوں میل کا سفر کرتی چلی جائے اور اسکو کسی قسم کا خطرہ نہ ہو۔

ایک فرض اسکا یہ مقرر کیا گیا ہے کہ وہ ملک کی خوراک کا انتظام رکھے۔ ابتدائی خلفاء کے زمانہ میں اس امر کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور خلفاء خوراک کے جمع رکھنے کا تعہد کرتے تھے اور جب غلہ کی کمی ہوتی تھی تو ہر شخص کے لئے پرچی جاری کرتے تھے جسکے ذریعہ سے وُہ سرکاری سٹوروں میں سے غلہ خرید سکے تا ایسا نہ ہو کہ بعض لوگ زیادہ غلہ جمع کرلیں اور باقی محروم رہیں۔

ایک فرض یہ مقرر کیا ہے کہ راستوں کی درستی کا خیال رکھیں تاکہ سفروں اور اِدھر اُدھر جانے میں آسانی ہو۔ چنانچہ ابتدائی زمانہ اسلام میں جبکہ گاڑیاں نہیں تھیں صرف پیدل لوگ چلتے تھے یہ حکم تھا کہ راستے کم سے کم بیس فٹ چوڑے بنائے جائیں۔ مگر یہ ایک اصول بتایا گیا ہے کہ راستے چوڑے رکھوانے چاہئیں۔ اس زمانہ میں چونکہ گاڑیاں اور موٹریں بکثرت چلتی ہیں اس لئے آجکل اسی نسبت سے راستوں کو زیادہ چوڑا رکھوانا ضروری ہوگا۔

ایک یہ فرض مقرر کیا ہے کہ بادشاہ ملک کے اخلاق کی نگرانی رکھے۔ اور تعلیم و تربیت کے

ذریعہ سے ملک کی اخلاقی حالت کو اچھا کرتا ہے اور خراب نہونے دے۔

بالآخر ایک یہ فرض اسلام نے حکومت کا رکھا ہے کہ یُزَکِّیْهِمْ۔ لوگوں کو بلند کرے اونچا کرے۔ یعنی انکی ہر قسم کی ترقی کو مدنظر رکھے۔ اس عام حکم میں تمام زبانوں کی ضرورتوں کو شامل کرلیا ہے جو علوم جدیدہ بھی معلوم ہوں انکو ملک میں رائج کرنا اور تحقیق و تجسس کی طرف لوگوں کو مائل کرنا جو تمدنی سوالات نئے پیدا ہوں انکو شریعت کے دائرہ کے اندر حل کرنا یہ اسلامی حکومت کا فرض ہے۔

رعایا کے فرائض

حکومت کے ان فرائض کے مقابلہ پر رعایا کے بھی اسلام نے فرض مقرر کئے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ رعایا کے لوگ اپنی حکومت کے خیر خواہ رہیں۔ اس سے تعاون کریں۔ اور اس کے احکام کی پوری طرح فرمانبرداری کریں خواہ وہ ان کے منشار کے مخالف ہی کیوں نہوں۔ مگر شریعت نے اسلامی حاکم کو سیاستاً گو ایک فوقیت دی ہے۔ بحیثیت انسانی اسکو کوئی علیحدہ رتبہ نہیں دیا۔ اس کو یہ حق ہے کہ ملک کی بہتری کے لئے بعد مشورہ کے احکام جاری کرے۔ مگر اسکا یہ حق نہیں کہ ذاتی طور پر لوگوں پر حکومت کرے۔ بلکہ اگر ذاتی معاملات میں خلیفہ اور کسی شخص کا جھگڑا ہو جائے مثلاً کسی مالی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو اسے اسیطرح عدالت سے اپنا فیصلہ کرانا ہوگا جسطرح دوسرے لوگ فیصلہ کراتے ہیں اور اسکو کوئی خاص رعایت حاصل نہوگی۔ حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی کا ایکدفعہ ایک جھگڑا ابی بن کعبؓ سے ہوگیا تھا۔ قاضی کے پاس معاملہ پیش ہوا۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کو بلوایا۔ اور آپکے آنے پر اپنی جگہ ادب سے چھوڑ دی۔ حضرت عمرؓ فریق مخالف کے پاس جا بیٹھے۔ اور قاضی سے فرمایا کہ یہ پہلی بے انصافی ہے جو آپ نے کی ہے۔ اسوقت مجھ میں اور میرے فریق مخالف میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ مگر یہ دعاوی انہی امور کے متعلق چل سکتے ہیں جو خلافت کے کام سے علیحدہ ہوں۔

آقا اور مُلازمین کے تعلقات

اسلام سے پہلے آقا اور ملازم کی حیثیت ایک بادشاہ اور رعایا کی حیثیت ہی سمجھی جاتی تھی۔ اور اسوقت بھی باوجود خیال کے بدل جانیکے عملاً یہی نظارہ ہمیں نظر آتا ہے۔ مگر اسلام اسکا علاج ہمیں بتاتا ہے۔ وہ یہ اصول قائم کرتا ہے کہ ایک آقا جس طرح روپیہ دیتا ہے اسی طرح ایک نوکر اپنا وقت اور اپنی جان دیتا ہے۔ اس لئے لوگوں کا حق نہیں کہ وہ ان سے جابر بادشاہوں والا سلوک کریں۔ اور جب کہ اسلام نے بادشاہوں کے ان حقوق کو بھی منسوخ کر دیا جو عادتاً اور رسماً ان کو حاصل تھے تو پھر آقا اور ملازم کے ان غیر منصفانہ تعلقات کو وہ کب جائز رکھ سکتا تھا۔ جو اسلام سے پہلے دنیا میں قائم تھے۔ چنانچہ اسلام ہمیں حکم دیتا ہے کہ آقا اپنے ملازم کو گالی نہ دے اور نہ مارے۔ بلکہ ملازم تو الگ رہا غلام کے متعلق بھی اسلام یہی حکم دیتا ہے۔ کہ نہ اسکو گالی دیجائے اور نہ مارا جائے۔ (اس جگہ ضمناً میں اس امر کا بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلامی احکام غلامی کے متعلق بھی لوگوں کو سخت غلط فہمی ہے۔ اسلام اس طرح غلامی کو جائز نہیں قرار دیتا جس طرح کہ دوسرے مذاہب جائز قرار دیتے ہیں۔ اسلامی احکام کی رو سے کسی قوم میں سے غلام بنانا صرف اسی وقت جائز ہوتا ہے (۱) جبکہ وہ اس لئے کسی دوسری قوم سے لڑے کہ اس سے جبراً اسکا مذہب چھڑا دے (۲) جب کہ وہ لوگ جنکو غلام بنایا گیا ہو عملاً ایسی ظالمانہ اور خلاف انسانیت جنگ میں شامل ہوں۔ (۳) جب کہ وہ لوگ جن کو غلام بنایا گیا ہو اس مظلوم قوم کا جس سے وہ اس کی جان سے پیاری چیز مذہب چھڑانا چاہتے تھے خرچ جنگ ادا کرنے کے لئے تیار نہوں۔ اگر یہ باتیں نہوں یعنی جنگ دُنیاوی ہو یا وہ شخص جسکو غلام بنایا گیا ہے جنگ میں شامل نہو یا جنگ میں تو شامل ہو مگر خرچ جنگ میں سے اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے تیار ہو تو ایسے شخص کو غلام بنانے یا غلام رکھنے کو اسلام ایک خطرناک جرم قرار دیتا ہے۔ اور ہر ایک شخص خیال کرسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس لئے تلوار اٹھاتا ہے کہ دوسرے سے جبراً اس کا مذہب چھڑوادے جس کی نسبت اس دوسرے شخص کا یہ یقین ہے کہ وہ نہ صرف اس کے اس دنیا میں کام آنیوالا ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی ہمیشہ اسی مذہب نے اس کو ابدی ترقیات

دلاتی ہیں اور پھر جب پکڑا جائے تو اس خرچ کو ادا کرنے سے وہ خود یا اسکی قوم کے لوگ انکار کردیں جو اُس قوم کو کرنا پڑا تھا جس پر ایسا ظالمانہ حملہ کیا گیا تھا۔ تو وہ ضرور اس امر کا مستحق ہے کہ اس کی آزادی اس سے چھین لیجائے۔ اسلام درحقیقت ایسے شخص کو جو مذہب بزور شمشیر پھیلانا چاہتا ہے۔ اور اپنی طاقت کے گھمنڈ پر دوسرے کے عقائد میں دخل دینا چاہتا ہے انسانیت سے خارج قرار دیتا ہے۔ اور بنی نوع انسان کے لئے اسے ایک خطرناک وجود قرار دیتا ہے۔ اس لئے اُسوقت تک کہ اس کے اندر حقیقی ندامت پیدا ہو اسے اس کی آزادی سے محروم کرتا ہے۔

ایک صحابیؓ فرماتے ہیں کہ ہم سات بھائی تھے ہمارے پاس ایک لونڈی تھی۔ ہم میں سے سب سے چھوٹے بھائی نے اس کے ایک تھپڑ مار دیا۔ رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ اسے آزاد کر دو۔ (مُسلِم)

اِسی طرح ایک اور صحابی رضؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ ایک غلام کو مارنے لگا۔ مجھے اپنے پیچھے سے ایک آواز آئی جسے مَیں پہچان نہ سکا۔ اتنے میں مَیں نے دیکھا کہ رسُول کریم صلعم چلے آرہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اے ابو مسعود! جسقدر تجھ کو اس غلام پر مقدرت حاصل ہے اس سے کہیں زیادہ تجھ پر خدا کو مقدرت حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں ڈر کے مارے میرے ہاتھ سے کوڑا جا پڑا۔ اور مَیں نے کہا۔ یا رسول اللہؐ یہ غلام خدا کے لئے آزاد ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ اگر تُو اسے آزاد نہ کرتا تو آگ تیرا منہ جھلستی۔ (مُسلِم)

اِسی طرح رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے نوکر سے وہ کام نہ لے جو وہ کر نہیں سکتا۔ اور اگر زیادہ کام ہو تو خود ساتھ لگ کر کام کرائے۔

اِسی طرح آپؐ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کا نوکر کھانا پکا کر اس کے سامنے رکھے تو اصل حق تو یہ ہے کہ وہ اسے ساتھ بٹھا کر کھلائے۔ اگر ایسا نہ کر سکے تو کم سے کم اسمیں سے اس کو حصہ دیدے۔ کیونکہ آگ کی تکلیف تو اسی نے اٹھائی ہے۔

مزدوری کے متعلق آپؐ فرماتے ہیں کہ مزدور کا پسینہ سُوکھنے سے پہلے اسکی مزدوری اسکو ادا کردیجائے۔ اور اس کے حق کے متعلق فرماتے ہیں کہ جو شخص مزدور کو اس کا حق ادا نہیں کرتا قیامت کے دن میں اس کی طرف سے اس سے جھگڑونگا جس سے یہ نتیجہ نکلتا

ہے کہ اگر کوئی مالک مزدور کی مزدوری نہ دے تو حکومت کا فرض ہے کہ اسکو دلوائے۔

اِسی طرح ایک حق مزدور کا شریعت نے یہ مقرر کیا ہے کہ اگر اسکو مزدوری کافی نہیں دیجاتی تو وہ حکومت کے ذریعہ سے اپنی دادرسی کرائے۔ اور اگر مزدور سیاسی یا تمدنی حالات کی وجہ سے مجبور ہوں کہ اس آقا کیساتھ کام کریں تو حکومت کا فرض ہوگا کہ دونو فریق کا حال سُنکر مناسب فیصلہ کرے۔

اُمراء اور غرباء اور حکّام کے تعلقات اور اختیارات پر ایک اجمالی نظر

یہ ایک اہم سوال ہے کہ مختلف لوگوں کے حقوق کا توازن کس طرح قائم رکھا جائے؟ اور اسوقت کے تمدن کے سب سے پیچیدہ مسائل یہی ہیں۔ اس لئے میں ان سب مسائل پر ایک اجمالی نظر ڈالتا ہوں۔ تاکہ اسلام نے ان مشکلات کا جو حل تجویز کیا ہے وہ آپ لوگوں کے ذہن میں آجائے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ تمام دُنیا خواہ زمین ہو خواہ سورج خواہ چاند خواہ ستارے یہ سب انسان کے فائدے اور نفع کے لئے پیدا کئے گئے ہیں پس یہ سب چیزیں اسلامی اصُول کے ماتحت تمام بنی نوع انسان کے درمیان مشترک ہیں اور سب بحیثیت مجموعی ان کے مالک ہیں۔

مگر اس اصل کے ساتھ ایک اور اصل بھی ہے جسے اسلام پیش کرتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ یہ دیکھے کہ کون کیسا عمل کرتا ہے اور یہ کہ خدا تعالےٰ نے انسان کی فطرت کے اندر یہ مادہ رکھا ہے کہ وہ مقابلہ کرکے دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ خود اسلام اس مقابلہ کیطرف رغبت دلاتا ہے۔ اور فرماتا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ اے مسلمانو! ایک دوسرے سے نیک کاموں میں مقابلہ کرو۔ اور ایکدوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

جب مقابلہ ہوگا اور کوئی آگے نکل جائیگا اور کوئی پیچھے رہ جائیگا۔ تو لازماً کوئی زیادہ انعام لیجاویگا اور کوئی کم فائدہ حاصل کریگا اور کوئی بالکل محروم رہجائیگا۔ پس اس فرق کو اسلام تسلیم کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ یہ فرق ہمارا ہی پیدا کیا ہوا ہے۔ اور اس پر تم کو آپس میں چڑنا نہیں چاہیئے۔ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (نساء ع ۵) اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر جو فضیلت دی ہے اس کے متعلق اپنے دل میں یہ خیال نہ کرو کہ ہم دوسروں سے چھین لیں۔ مطلب یہ کہ خدا تعالیٰ کے کام حکمت والے ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے بلاوجہ ایسا نہیں کیا بلکہ کارخانۂ عالم اسی سے چلتا ہے اور اسی طرح چل سکتا ہے۔ اگر تم اس نظام میں خلل ڈالو گے یعنی وہ لوگ جو اس طرح مقابلہ میں آگے بڑھ گئے ہیں انکو ان کے انعامات سے محروم کردو گے تو یہ سب مقابلہ اور کوشش بند ہوجائیگی اور ساتھ ہی دنیا کی ترقی بھی بند ہوجائیگی۔

مگر لوگوں کا حق قایم رکھ کر پھر فرماتا ہے کہ اے وہ لوگو جن پر خدا تعالیٰ نے فضل کیا ہے اور تم کو ترقی دی ہے تمہارا فرض ہے کہ تم ان بھائیوں کو جو پیچھے رہ گئے ہیں آگے بڑھاؤ اور ان کو اپنے ساتھ شامل کرو۔ کیونکہ تم کو خیال رکھنا چاہیئے کہ جس مال پر تم قابض ہو اسمیں درحقیقت ان غرباء کا بھی حصہ تھا۔ پس آگے نکل جانے کی وجہ سے تم کو یہ نہیں کرنا چاہیئے کہ ان غرباء کو محروم کردو۔ بلکہ تم کو یہی خوشی اپنا انعام سمجھنا چاہیئے کہ تمہارے کئی بھائی جو تمہاری ہی طرح اس دنیا کے حصہ دار ہیں تمہارے ذریعے سے پرورش پا رہے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ نے تم کو اس درجہ پر پہنچایا ہے کہ تم بھی اسکی طرح اس کی مخلوق کی ربوبیت کرو۔ فرماتا ہے وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ (نور ع ۴) اور دو محتاجوں کو خدا تعالیٰ کے مال سے جو اس نے تم کو دیا ہے یعنی بطور امانت تمہارے پاس ہے ورنہ اس میں دوسروں کا حق شامل ہے۔

ان اصول سے آپ لوگ سمجھ گئے ہوں گے کہ اسلام کے نزدیک افراد کا مقابلہ نہایت ضروری ہے اور اس مقابلہ کو زندہ رکھنے کے لئے دیانتداری سے وہ لوگ جو کچھ کمائیں انکے پاس رہنا ضروری ہے۔ ہاں چونکہ اسمیں علاوہ ان کی محنت کے دوسرے لوگوں کے حقوق شامل ہیں۔ کیونکہ سب بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے زمین اور اس کے اندر کی چیزیں پیدا کی گئی ہیں۔ اس لئے چاہیئے کہ وہ لوگ کچھ رقم بطور حق ملکیت باقی حصہ داروں کو ادا کردیں۔

مگر جب اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ اس مقابلہ کا جاری رکھنا دنیا کی ترقیات کے لئے ضروری ہے۔ تو ساتھ ہی ایک اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں تو پھر مقابلہ کے راستوں کا سب بنی نوع انسان کے لئے کھلا رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ اور اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ جو امور ایسے ہوں کہ ان کے سبب سے عام مقابلہ بند ہو کر چند محدود لوگوں میں مقابلہ آجائے اور باقی سب لوگ مقابلہ سے خارج کئے جا کر صرف تماشا دیکھنے والے بنجائیں اُن کی اصلاح کیجائے۔ اسلام اس سوال کی اہمیت تسلیم کرتا ہے اور اس کا جواب اثبات میں دیتا ہے۔ اور مندرجہ ذیل طریق تجویز کرتا ہے جس سے (۱) مقابلہ بھی جاری رہتا ہے (۲) جو لوگ ترقی کریں اور خاص محنت کریں انکو ان کی محنت اور کوشش کا پھل بھی مل جاتا ہے اور افراد کی ملکیت قایم رہتی ہے (۳) جسقدر حصہ ان آگے نکل جانیوالوں کی ترقی میں باقی لوگوں کی مملوکہ اشیاء یا ان کی محنتوں کا تھا وہ بھی لوگوں کو دلایا جاتا ہے (۴) تمام بنی نوع انسان کے لئے ترقی کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ کسی خاص قوم یا خاص خاندانوں میں محدود نہیں رہتا۔ بلکہ ادنےٰ سے ادنےٰ آدمی کے لئے بھی اعلےٰ سے اعلیٰ ترقی حاصل کرنے کا موقع موجود رہتا ہے اور کسی جماعت کو نسلاً بعد نسلٍ دوسرے لوگوں پر حکومت حاصل نہیں ہوتی (۵) تمام بنی نوع انسان کی ضروریات بھی بلا تکلف پوری ہوتی رہتی ہیں۔ وہ طریق یہ ہیں:-

اوّل۔ اسلام اس امر کا مدعی ہے کہ جسقدر اشیاء دنیا میں موجود ہیں ان میں سب بنی نوع انسان شریک ہیں۔ اور اسوجہ سے دنیا میں حقیقی ملکیت کوئی نہیں۔ زید کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کی ملکیت ان معنوں میں نہیں کہ دوسروں کا اسمیں بالکل حصہ ہی کوئی نہیں۔ بلکہ اسکی ملکیت وہ اسوجہ سے کہلاتا ہے کہ اس میں اسکا حصہ دوسروں کی نسبت زیادہ ہوگیا ہے۔ کیونکہ اس نے محنت کرکے اسکو حاصل کیا ہے ورنہ اسمیں اور لوگوں کے حصے بھی شامل ہیں۔ چنانچہ اسلام امراء کے مال میں غرباء کا حق قرار دیتا ہے۔ فرماتا ہے۔ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (ذاریات ع ۱) اُمراء کے مال میں انکا جو بول سکتے ہیں یعنی انسانوں کا بلکہ اُن حیوانوں کا بھی جو نہیں بول سکتے بطور حق کے حصہ ہے۔

اسی طرح فرماتا ہے۔ قریبیوں کو اور مسکینوں کو اور مسافروں کو ان کے حق دو۔ (روم ع ۴)

پس وہ حکم دیتا ہے کہ روپیہ کو بند رکھنا درست نہیں کیونکہ اس طرح لوگ اپنے حق سے محروم رہجاتے ہیں۔ اور وہ مجبور کرتا ہے کہ لوگ روپیہ کو یا خرچ کریں یا کام پر لگائیں۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں لوگ اس روپیہ سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ اگر وہ خرچ کریگا تو بھی روپیہ چکر کھانے لگیگا۔ اور لوگوں کو فائدہ ہوگا۔ اور اگر کسی کام پر لگائیگا تو بھی کچھ لوگ بہ طور ملازمت کے فائدہ اٹھائینگے۔ کچھ وہ لوگ جن سے لین دین ہوگا فائدہ اٹھائینگے۔ اگر کوئی شخص ایسا نہ کرے تو اس کے حق میں فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَ یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَیَکْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ اَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا (سورۂ نساء ع ۶) اللہ تعالےٰ پسند نہیں کرتا متکبروں اور اترانے والے لوگوں کو جو روپیہ بند کرکے رکھ چھوڑتے ہیں۔ اور لوگوں کو بھی کہتے ہیں کہ تم بھی ایسا ہی کرو۔ اور جو کچھ خدا نے اپنے فضل میں سے دیا ہے اسکو چھپا چھوڑتے ہیں۔ ان کو ایسا نہیں چاہیئے۔ اگر یہ اس نصیحت کو قبول نہ کرینگے تو انکو رسوا کرنے والا عذاب آئیگا۔ یعنی اگر وہ اس طرح اپنے اموال کو چھپاتے اور جمع کرتے چلے جائیں گے تو ان کی قوم ذلیل ہو جائیگی اور وہ بھی ساتھ ہی ذلیل ہونگے۔

اب دوسری صورت جو اموال کے خرچ کرنے کی ہے۔ اسمیں یہ نقص ہو سکتا تھا کہ لوگ اپنی جانوں پر سب روپیہ خرچ کردیں اور اسراف سے کام لیں اسکا علاج اسلام نے یہ کیا ہے کہ ہر قسم کی عیّاشیوں کو روک دیا ہے۔ اسلام کھانے میں اسراف کو پہننے میں اسراف کو۔ مکان بنانے میں اسراف کو غرض کہ ہر چیز میں اسراف کو منع کرتا ہے۔ اس وجہ سے ایک مسلمان جو اسلام کے احکام پر عمل کرتا ہے اپنی ذات پر اسقدر روپیہ خرچ ہی نہیں کر سکتا کہ جس سے دوسرے لوگوں کے حقوق تلف ہو جائیں۔

لیکن چونکہ ہو سکتا تھا کہ بعض لوگ باوجود اسلام کے اس حکم کے کہ روپیہ جمع نکیا کریں۔ بلکہ اسکو خرچ کریں یا کام میں لگائیں روپیہ جمع کرتے رہیں۔ اور چونکہ خالی اس حکم سے لوگوں کے وہ حقوق جو تمام اموال میں اسلام تسلیم کرتا ہے پوری طرح نہیں ادا ہو سکتے تھے اس لئے اسلام نے حکم دیا ہے کہ جس قدر جائداد کسی انسان کے پاس سونے چاندی کے سکّے یا اموال تجارت

کی قسم کی ہو اور اس پر ایک سال گزر چکا ہو۔ اس پر حکومت اس سے اڑھائی فیصدی ٹیکس سالانہ لیا کرے جو ملک کے غربا اور محتاجوں پر خرچ کیا جائے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو الفاظ اس صدقہ کی غرض کے متعلق استعمال فرمائے ہیں ان میں آپؐ صاف طور پر ظاہر فرماتے ہیں۔ کہ یہ مال اس غرض سے امراء سے لیا جاتا ہے کہ ان کے اموال میں غرباء کا حصّہ شامل تھا۔ آپؐ فرماتے ہیں انّ اللّٰہ افترض علیہم صدقۃ تؤخذ من اغنیائہم وتردّ علٰی فقرائہم (عن ابن عباس متفق علیہ) اللہ تعالےٰ نے لوگوں پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو اُن کے مالداروں سے لیجائیگی اور ان کے غرباء کی طرف لوٹائی جائیگی "لوٹائی جائیگی" کے الفاظ صاف طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ اس ٹیکس کو غرباء کا حق سمجھا گیا ہے۔ اور یہ قرار دیا گیا ہے کہ امراء کی دولت میں غرباء کے حقوق اور انکی محنت بھی شامل ہے۔ مگر چونکہ ان کے حقوق کا معیّن اندازہ مشکل تھا۔ اس لئے ایک قاعدہ مقرر کر دیا کہ جس کے مطابق ان سے زکوٰۃ لے لی جایا کرے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ ٹیکس جسے زکوٰۃ کہتے ہیں آمدن پر نہیں ہے بلکہ سرمایہ اور نفع سب کو ملا کر اس پر لگایا جاتا ہے۔ اور اسطرح اڑھائی فیصدی درحقیقت بعض دفعہ نفع کا پچاس فیصدی بنجاتا ہے۔ اس حکم کی موجودگی میں کوئی شخص مال کو بے وجہ جمع نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ اس صورت میں اسکا مال تھوڑے ہی عرصہ میں ٹیکس کی ادائیگی میں ہی خرچ ہو جائیگا۔

قرآن کریم میں بھی اس امر کا اشارہ پایا جاتا ہے کہ زکوٰۃ کی غرض درحقیقت امراء کے مالوں کو پاک کرنا ہے۔ یعنی ان کے مالوں میں جو ملک کے دوسرے لوگوں کی محنت اور ان کے حقوق کا ایک حصّہ شامل ہو گیا ہے اسکو ادا کرکے خالص انکا حق علٰحدہ کر دینے کے لئے یہ ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ ع ۱۳) لوگوں کے مالوں سے صدقہ لے اور اس طرح انکو پاک کر یعنی ان کے مال اس ذریعہ ہر قسم کی ملونی سے پاک ہو جائیں گے اور دوسروں کے حق ان سے الگ ہو جائیں گے۔ پھر فرماتا ہے چاہیئے کہ یہ مال جو امراء سے وصول کئے جائیں ان سے غرباء کو ترقی کی طرف لیجایا جائے۔

زکوٰۃ کے حکم سے اسلام نے ان تمام حقوق کو ادا کر دیا ہے جو امرار کے مال میں غربار کیطرف سے شامل تھے اور اس طرح سرمایہ اور مزدوری میں صلح کرا دی ہے۔ کیونکہ علاوہ مناسب مزدوری کے جو کارکن حاصل کرتے ہیں۔ اسلام ان کے اور ان کے غریب بھائیوں کیخاطر امرار سے اڑھائی فیصدی ٹیکس کل جائداد پر وصول کرتا ہے۔

گو اس ٹیکس کی وصولی سے مالی پہلو تو حل ہو جاتا ہے مگر یہ سوال رہ جاتا ہے کہ امرار نے غربار یا درمیانی درجہ کے لوگوں کے لئے ترقی کا کوئی راستہ کھلا چھوڑا ہی نہیں پھر وہ ترقی کسطرح کریں؟ اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ تمام بنی نوع انسان کا حق ہے کہ ان کے لئے ترقی کا راستہ کھلا رکھا جائے۔ وہ اس امر کو ناپسند کرتا ہے کہ کوئی شخص دوسروں کا راستہ روک کر کھڑا ہو جائے۔ ایک دوڑ جو کئی آدمیوں میں ہو رہی ہو اس میں ہر ایک شخص یکساں ہمدردی کے ساتھ ہر اک دوڑنے والے کو دیکھے گا۔ مگر اس کے ساتھ کسی کو ہمدردی نہیں ہو سکتی جو آگے ہو کر اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے کہ کوئی دوسرا آگے نہ بڑھ سکے۔ اگر اسکو جائز رکھا جائے تو مقابلہ وہیں بند ہو جائیگا۔ اور چند لوگ جو پہلے آگے نکل چکے ہیں سب ترقیات اپنے ہی ہاتھ میں رکھیں گے اور کسی دوسرے کو حصہ نہ دیں گے۔ اسلام اسکی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اور اس نے اس نقص کی جڑ کو کاٹ کر ترقی کا راستہ سب کے لئے کھولدیا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو اس نقص کے باعث کہ بعض ملکوں میں چند گھرانوں میں تمام ترقیات محدود ہو گئی ہیں تین ہیں:-

(۱) جائداد کا تقسیم نہ ہونا بلکہ صرف بڑے لڑکے کے قبضہ میں رہنا۔ اور مال کے متعلق باپ کو اختیار ہونا کہ جسقدر چاہے جسکو چاہے دیدے۔

(۲) سود کی اجازت جس کیوجہ سے ایک ہی شخص یا چند افراد بغیر محنت کے جسقدر چاہیں اپنے کام کو وسعت دے سکتے ہیں۔

(۳) منافع کی زیادتی۔

ان تین نقائص کیوجہ سے بہت سے ممالک میں لوگوں کے لئے ترقیات کے راستے بالکل محدود ہو گئے ہیں جائدادیں چند لوگوں کے قبضہ میں ہیں۔ اور اسوجہ سے غربار کو جائدادیں پیدا کرنے کا موقع نہیں۔

سود کی وجہ سے جو لوگ پہلے ہی اپنی ساکھ بٹھا چکے ہیں وہ جسقدر چاہیں روپیہ لے سکتے ہیں چھوٹے سرمایہ دار کو انکا مقابلہ کرنیکی طاقت نہیں منافع کی زیادتی کیوجہ سے دولت ایک آبشار کی طرح چند لوگوں کے گھروں میں جمع ہو رہی ہے۔

اسلام نے ان نقائص کے مٹانے کے لئے تین ہی علاج کئے ہیں۔ اوّل ورثہ کے تقسیم کئے جانے کا حکم دیا ہے۔ کسی شخص کا اختیار نہیں ہے کہ اپنی جائداد کسی ایک شخص کو دے جائے۔ تاکہ ایک طبقہ کے پاس دولت محفوظ رہے۔ اسلام حکم دیتا ہے کہ مطابق شریعت تمام اولاد ماں باپ بیوی۔ یا خاوند یا بھائیوں بہنوں میں ہر مرنے والے کی جائداد تقسیم ہو جانی چاہیئے۔ اس تقسیم کے بدلنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ اس حکم کیوجہ سے ایک اسلامی شریعت پر چلنے والے ملک میں ایک شخص جو بڑی ترقی کر جاتا ہے اسکی اولاد محض اسکی ترقی کے سہارے پر نہیں بیٹھ سکے گی۔ بلکہ اس کی جائداد چونکہ چھ سات جگہ تقسیم ہو جائیگی۔ مکان بھی اور زمینیں بھی اور مال بھی۔ اس لئے سب کو پھر نئے سرے سے محنت کرنی پڑیگی۔ اور چونکہ زمینیں تقسیم ہوتی چلی جائینگی۔ دو تین نسلوں میں وہ اتنے چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو جائیں گی کہ ایک معمولی مزدور بھی ان میں سے ایک حصہ خریدنے پر قادر ہو سکیگا۔ اور اپنی آئندہ ترقی کی بنیاد اس پر رکھ سکیگا۔ غرض تقسیم جائداد کے سبب سے کوئی نسلی دیوار نہیں کھڑی ہو سکیگی۔

دوسری روک غربار کے راستہ میں سود ہے۔ سود کے ذریعہ سے وہ تاجر جو پہلے سے ساکھ بٹھا چکے ہیں جسقدر روپیہ کی انکو ضرورت ہو آسانی سے بنکوں سے لے سکتے ہیں۔ اگر انکو اس طرح روپیہ نہ مل سکتا تو وہ یا تو دوسرے لوگوں کو اپنی تجارت میں شامل کرنے پر مجبور ہوتے یا اپنی تجارت کو اس پیمانہ پر نہ بڑھا سکتے کہ بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے روک بن سکیں اور ٹرسٹس اور ایسوسی ایشنز قائم کر کے دوسرے لوگوں کے لئے ترقی کا دروازہ بالکل روک دیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ..... کہ مال ملک میں مناسب تناسب سے تقسیم رہتا اور خاص خاص لوگوں کے پاس حد سے زیادہ مال جمع نہ ہو سکتا جو ملک کی اخلاقی ترقی کے لئے مہلک اور غربار اور درمیانی طبقہ کے لوگوں کے لئے تباہی کا موجب ہوتا ہے۔

تیسری صورت جو نفع کی زیادتی کی تھی اسکا اسلام نے ایک تو اس ٹیکس کے ذریعہ سے

انتظام کیا ہے جو غربا کی خاطر امرا سے لیا جاتا ہے۔ اس ٹیکس کے ذریعہ سے اتنی رقم امرا سے لیجاتی ہے کہ ان کے پاس اسقدر روپیہ اکٹھا ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کے زور سے ملک کا سارا روپیہ جمع کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ جسقدر روپیہ ان کے پاس ہوگا اسمیں سے ہر سال انکو غریبوں کا ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔

دوسرے شریعت نے یہ انتظام کیا ہے کہ غربا میں سے ہوشیار اور ترقی کرنیوالے لوگوں کو اس ٹیکس میں سے اسقدر سرمایہ دیا جائے کہ وہ اپنا کام چلا سکیں۔ اس ذریعہ سے نئے نئے لوگوں کو ترقی کرنے کا موقع ملیگا اور کسی کو شکایت کا موقع نہیں رہیگا۔

تیسرے اسلام نے اُن ترکیبوں سے منع کر دیا ہے جن کے ذریعہ سے لوگ ناجائز طور پر زیادہ نفع حاصل کرتے ہیں چنانچہ اسلام اس امر کو گناہ قرار دیتا ہے کہ کوئی شخص تجارتی مال کو اس لئے روک رکھے کہ تا اسکی قیمت بڑھ جائے اور وہ زیادہ قیمت پر فروخت ہو پس اس اصل کو مدنظر رکھتے ہوئے ٹرسٹس کی قسم کے تمام ذرائع جن سے نفع کو زیادہ کیا جاتا ہے اسلامی تعلیم کے مطابق ناجائز ہوں گے اور حکومت انکی اجازت نہ دیگی۔

اب ایک سوال یہ رہجاتا ہے کہ اگر سُود بند کیا جائیگا تو تمام تجارتیں تباہ ہو جائیں گی مگر یہ امر درست نہیں۔ سُود سے کبھی تجارتیں تباہ نہونگی۔ اَب بھی سُود کیوجہ سے تجارتیں نہیں چل رہیں۔ بلکہ اس وجہ سے سُود کا تعلق تجارت کے ساتھ ہے کہ مغربی ممالک نے اس طریق کو نشو نما دیا ہے۔ اگر وہ اپنی تجارتوں کی بنیاد شروع سے سُود پر نہ رکھتے تو آج یہ بے امنی کی صُورت نظر آتی اور نہ تجارتوں سے سُود کا کوئی تعلق ہوتا۔ آج سے چند سَو سال پہلے مسلمانوں نے ساری دُنیا سے تجارت کی ہے۔ اور اپنے زمانہ کے لحاظ سے کامیاب تجارت کی ہے۔ مگر وہ سُود بالکل نہیں لیتے تھے۔ وُہ بوجہ سُود نہ لینے کے ادنے ادنے غربا سے روپیہ شراکت کے طور پر لیتے تھے۔ اور ملک کے اکثر حصہ کو ان تجارتوں سے فائدہ پہنچتا تھا۔

پس سُود کیوجہ سے تجارتیں نہیں چل رہیں۔ بلکہ سُود پر چونکہ ان کی بنیاد رکھی گئی ہے اِس لئے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سُود پر چل رہی ہیں۔ بیشک شروع میں دِقتیں ہونگی لیکن جس طرح سُود پر بنیاد رکھی گئی ہے اسیطرح اس عمارت کو آہستگی سے ہٹایا بھی جا سکتا ہے۔

سُود اس زمانہ کی وہ جونک ہے جو انسانیت کا خون چوس رہی ہے۔ غربار اور درمیانی درجہ کے لوگ بلکہ امرا بھی اس ظلم کا شکار ہو رہے ہیں مگر بہت سے لوگ اس چیتے کیطرح جسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی زبان پتھر پر رگڑ رگڑ کر کھا گیا تھا۔ ایک جھوٹی لذت محسوس کر رہے ہیں جس کے سبب سے وہ اسکو چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔ اور اگر چھوڑنا چاہتے ہیں تو سوسائٹی کا بہاؤ انکو الگ ہونے نہیں دیتا۔

اِس کے دو خطرناک اثر ملکوں کے امن کے خلاف پڑ رہے ہیں۔ ایک اس کے ذریعہ سے دولت محدود ہاتھوں میں جمع ہو رہی ہے۔ دوسرے اسکی وجہ سے جنگیں آسان ہوگئی ہیں میں نہیں سمجھتا کہ دنیا کا کوئی انسان بھی اس جنگ عظیم کی جو پچھلے دنوں ہوئی ہے جرأت کر سکتا تھا۔ اگر سُود کا دروازہ اس کے لئے کھلا نہ ہوتا جسقدر روپیہ اس جنگ پر خرچ ہوا ہے مختلف ممالک اس روپے کے خرچ کرنے کے لئے کبھی تیار نہ ہوتے اگر اُسکا بوجھ براہِ راست ملک کی آبادی پر پڑ جاتا۔ اسقدر عرصہ تک جنگ محض سُود کیوجہ سے جاری رہی۔ ورنہ بہت سی سلطنتیں تھیں جو اس عرصہ سے بہت پیشتر جسمیں پچھلی جنگ جاری رہی جنگ کو چھوڑ بیٹھتیں کیونکہ ان کے خزانے ختم ہو جاتے اور ان کے ملک میں بغاوت کی ایک عام لہر پیدا ہو جاتی۔ یہ سُود ہی تھا جس کیوجہ سے اُسوقت تک لوگوں کو بوجھ محسوس نہیں ہوا۔ لیکن اب کمریں اس کے بوجھ کے نیچے جھکی جا رہی ہیں۔ اور غالباً کئی نسلیں اس قرضہ کے اتارنے میں مشغول چلی جائیں گی۔ اگر سُود نہ لیا جاتا۔ تو جنگ کا نتیجہ وہی ہوتا جو اب ہوا ہے یعنی وہی اقوام جیت جاتیں جو اب جیتی ہیں۔ مگر فرانس اسقدر تباہ نہ ہوتا۔ جرمنی اسطرح برباد نہ ہوتی۔ آسٹریا اس طرح ہلاک نہ ہوتا۔ انگلستان پر یہ بار نہ پڑتا۔ اوّل تو جنگ چھیڑنے ہی کی حکومتوں کو جرأت نہ ہوتی اور اگر جنگ چھڑ بھی جاتی تو ایک سال کے اندر جوش مدہم ہو کر کبھی کی صلح ہو چکی ہوتی۔ اور آج دنیا شاہراہ ترقی پر چل رہی ہوتی۔ حکومتیں آجکل آلات جنگ کے کم کرنے پر زور دے رہی ہیں۔ یہ بھی ایک اچھی بات ہے مگر آلات تو ارادے کے ساتھ فوراً ہی بنجاتے ہیں۔ جس چیز کے **توڑنے کی ضرورت ہے وہ سُود** ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ سُود جنگ کے پیدا کرنے کا موجب ہے۔ اور آج ہم اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ دیکھ رہے ہیں۔

پس جنگیں خواہ اندرونی ہوں خواہ بیرونی تبھی بند ہونگی اور ملکوں میں امن تبھی قایم ہوگا جب سُود کے رواج کو تمدن کے دائرہ سے باہر نکال دیا جائیگا۔ بیشک تب دودھ کی نہریں چلیں گی۔ اور امیر غریب پر ظلم نہیں کرسکیگا اور بادشاہتیں بادشاہتوں پر چڑھائی کرنے سے ڈرینگی۔ اور تبھی جنگ کی طرف مائل ہونگی جب انکو یقین ہوگا کہ ان کے ملک کی عزت خطرہ میں ہے اور یہ کہ لوگ اس کے بچانے کے لئے ہر ایک قربانی کے لئے تیار ہیں حاکم اپنا دل خوش کرنے کے لئے کبھی جنگ نہیں کرسکیں گے۔

ایک نقص اور ہے جسکی وجہ سے بعض لوگوں کے ہاتھ میں مال زیادہ جمع ہو جاتا ہے اور وہ کانوں کی دریافت ہے۔ اس کا علاج اسلام نے یہ کیا ہے کہ کانوں میں سے پانچواں حصہ گورنمنٹ کا مقرر کیا ہے۔ اور جو مال کانوں کے مالک جمع کریں اور اس پر سال گزر جائے اسپر زکوٰۃ الگ ہے۔ گویا اس طرح حکومت کانوں میں حصہ دار ہو جاتی ہے۔ اور غرباء کے لئے ایک کافی رقم مل جاتی ہے جس سے ان کے حقوق ادا کئے جا سکتے ہیں۔ اگر کوئی شخص جسکی زمین میں سے کان نکلی ہو اس سے فائدہ اٹھانے کی توفیق نہ رکھے تو چونکہ گورنمنٹ کا بھی اس میں حصہ ہے گورنمنٹ مناسب معاوضہ دیکر اُسے خرید سکتی ہے۔ یا اور کسی کے پاس اس کے حصہ کو فروخت کرنے کی اجازت دے سکتی ہے۔ اس طرح کانوں کی وجہ سے جو نظام تمدن میں نقص ہے وہ بھی دور ہو جاتا ہے ؛

حکومتوں کے آپس کے تعلقات

حکومتوں اور رعایا۔ اور امراء اور غرباء کے تعلقات کے بیان کرنے کے بعد اب میں اُن تعلیمات کو بیان کرتا ہوں جو اسلام نے بین الاقوامی تعلقات کے متعلق دی ہیں :-

یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلامی تعلیمات کا مطمح نظر تو یہ ہے کہ دنیا میں سے ملکی حکومتوں

کو اڑا کر ساری دنیا میں ایک ہی حکومت قایم کردی جائے تاکہ لڑائیوں اور جھگڑوں کا خاتمہ ہو جائے۔ اسلام مختلف ممالک کو اسقدر اندرونی آزادی دیتا ہے کہ اسلامی سیاسیات کے ماتحت وہ نہایت آسانی سے اپنے قومی اغراض اور خصوصیات کو پورا کرسکتے ہیں اور پھر بھی ایک کل کا جزو بن سکتے ہیں۔ مگر اسلام اس مقصد کے حصول کے لئے کسی قسم کی جسمانی جدوجہد کرنیکی اجازت نہیں دیتا۔ بلکہ اسے صرف لوگوں کی اپنی رائے اور ارادے پر چھوڑ دیتا ہے۔ اور مسلمان حکومتوں کو بھی پابند نہیں کرتا۔ جبتک دنیا میں یہ روح پیدا نہ ہو کہ لوگ مقامی امور کو اپنی اپنی مرضی کے مطابق طے کر کے باقی امور میں ایک ہو جائیں اور لڑائی کیطرف میلان اور ایک دوسرے کے خلاف تیاریاں اور جوش اعلیٰ مقاصد کے لئے قربان کردے جاویں اسوقت تک ہمیں موجودہ حالت پر قانع رہنا چاہیئے۔ اور میں اسکے مطابق جو قانون اسلام نے مقرر کئے ہیں انکو بیان کرتا ہوں۔

دیکھا جاتا ہے کہ تمام لڑائیاں اور جھگڑے ایک دوسرے کے ملک پر طمع کی نظر رکھنے یا آپس میں ایک دوسرے سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسلام اس کے متعلق یہ دو حکم دیتا ہے جو اس سلسلہ جنگ و جدال کو بالکل مٹا دیتے ہیں۔ اول فرماتا ہے وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ (طٰہٰ ع ۸) اور اے مسلم تو اپنی آنکھوں کو دنیاوی منافع کی طرف جو تمہارے سوا دوسری اقوام کو ہم نے دئے ہیں۔ تاکہ اُن کے اعمال کی آزمائش کریں۔ اٹھا اٹھا کر نہ دیکھ۔ اور تیرے رب نے جو تجھے دیا ہے وہی تیرے لئے اچھا ہے اور زیادہ دیر تک رہنے والا ہے۔ یعنی مرنے کے بعد بھی وہی کام آئے گا۔ اور جو دوسری اقوام پر تعدی کر کے مال لوگے تو وہ نفع نہیں دے گا اور نہ قایم رہے گا۔

دوسرا باعث اس قسم کے ناجائز فوائد اٹھانے کا آپس کی دشمنیاں ہوتی ہیں۔ کوئی قومی مغائرت یا نفرت دل میں ہوتی ہے۔ یا کسی وقت کسی قوم سے کوئی تکلیف پہنچی ہوتی ہے پھر صلح بھی ہو جاتی ہے اور معاملہ رفع دفع بھی ہو جاتا ہے۔ مگر ایک قوم اس کو دل میں رکھ

لیتی ہے اور آہستہ آہستہ دوسری حکومت کو کمزور کرتی چلی جاتی ہے۔ اور دباؤ یا دھوکے سے اسکے ناجائز فوائد اٹھانے شروع کر دیتی ہے تاکہ اُسے نقصان پہنچائے۔ اسلام اسے ناپسند کرتا ہے اور صرف سچائی کا معاملہ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ کُوْنُوْا قَوَّامِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (مائدہ ع ۲) اے مومنو! اپنے تمام کاموں کو خدا کے لئے کرو اور انصاف سے دنیا میں معاملہ کرو۔ اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس امر پر نہ اکسائے کہ تم عدل کا معاملہ نہ کرو۔ تم بہر حال انصاف کا معاملہ کرو یہ بات تقویٰ کے مطابق ہے۔ اللہ تعالےٰ کو اپنی ڈھال بناؤ۔ اللہ تعالےٰ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔

اِن دونو احکام کے ماتحت کوئی حقیقی مسلمان حکومت بین الاقوامی تعلقات کو خراب کرنیکا موجب نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ دوسری قوموں کے مالوں اور حکومتوں کی طرف کبھی طمع کی نگاہ نہ ڈالیں۔ اور نہ صرف یہ کہ من حیث الفرد با اخلاق ہوں بلکہ چاہیئے کہ من حیث القوم بھی با اخلاق ہوں۔

باہمی معاہدات کے متعلق اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ معاہدات کی اسقدر پابندی کرو کہ جس قوم سے تمہارا معاہدہ ہے اس سے جس جس قوم کا معاہدہ ہے وہ بھی اگر عملاً جنگ میں شامل نہو تو خواہ وہ ایک برسرِجنگ قوم کا حصہ ہی ہو تم اس سے جنگ نہ کرو۔ ایک قوم جو معاہدہ کر چکی ہے اگر اس سے شرارت کا خطرہ ہے۔ تو حکم دیتا ہے کہ باوجود اسکی شرارت کے یہ نہ کرو کہ اچانک اس پر حملہ کر دو اور موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ بلکہ اس کو پہلے نوٹس دو کہ ہم معاہدہ کو ختم کرتے ہیں کیونکہ تمہاری طرف سے معاہدہ کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔ اس کا اعلان کر کے پھر بھی اگر وہ باز نہ آئیں تو پھر بیشک جنگ کر سکتے ہو۔ یونہی نہیں۔

مگر امن کے قیام کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ہر ایک ملک جنگ کے لئے تیار رہے تا شریر اور کمینہ دشمن اس کی کمزوری کو دیکھ کر اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھانا چاہے پس فرمایا کہ تو دوسرے کے ملک سے ناجائز فائدہ نہ اٹھانا چاہو لیکن دوسری اقوام جب نا۔۔۔ موجود

ہیں جنگ کا خطرہ ہے پس اپنے طور پر دفاع کے لئے پوری طرح تیار رہو۔ تا تمہاری کمزوری دوسرے کو جنگ کی تحریک نہ کر دے۔

اگر جنگ ہو جائے تو اسوقت کے لئے حکم دیتا ہے کہ عورتوں۔ بچوں۔ اور اپنی عمر کو مذہبی کاموں کے لئے وقف کر دینے والوں اور بوڑھوں کو کچھ نہ کہو۔ صرف ان لوگوں کو مارو اور لڑائی میں مارو جو جنگ کر رہے ہوں۔ اور اگر کوئی ہتھیار رکھ دے اور کہے کہ میں نہیں لڑتا تو پھر اسکو قتل کرنا ناجائز ہوگا۔ کسی ملک کا بیفائدہ نقصان بھی نہ کرو۔ جبتک کوئی بھی صورت دشمن کے زیر کرنے یا اپنے بچانے کی ہے اس کے کھیتوں، درختوں اور مکانوں کو بچاؤ۔ اور بلا سبب اس غرض سے نقصان نہ پہنچاؤ کہ بعد میں انکی حکومت کمزور رہیگی۔ اور اگر کوئی قوم صلح کا پیغام دے تو اس خیال سے کہ اسکے دل میں شرارت ہے وہ صرف وقفہ چاہتی ہے صلح سے انکار نہ کرو۔ بلکہ جبتک شرارت ظاہر نہو جنگ کو مٹانے اور صلح کرنے کی کوشش کرو۔

جھگڑوں کو مٹانے کے لئے ایک عجیب حکم دیا ہے جسے آج ہم لیگ آف نیشنز کی شکل میں دیکھتے ہیں لیکن ابھی تک یہ لیگ ویسی مکمل نہیں ہوئی جس حد تک کہ اسلام اسکو لیجانا چاہتا ہے۔ اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰھُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰہِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (حجرات ع ۱) یعنی اگر دو قومیں مسلمانوں میں سے آپس میں لڑ پڑیں تو انکی آپس میں صلح کرا دو یعنی دوسری قوموں کو چاہیئے کہ بیچ میں پڑ کر ان کو جنگ سے روکیں اور جو وجہ جنگ کی ہے اس کو مٹائیں اور ہر ایک کو اس کا حق دلائیں۔ لیکن اگر باوجود اس کے ایک قوم باز نہ آئے اور دوسری قوم پر حملہ کر دے اور مشترکہ انجمن کا فیصلہ نہ مانے تو اُس قوم سے جو زیادتی کرتی ہے سب قومیں مل کر لڑو۔ یہانتک کہ خدا کے حکم کی طرف وہ لوٹ آئے یعنی ظلم کا خیال چھوڑ دے۔ پس اگر وہ اس امر کی طرف مائل ہو جائے تو ان دونو قوموں میں پھر صلح کرا دو مگر انصاف اور عدل سے۔ اور مروّت سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ انصاف

کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اِس آیت میں بین الاقوامی صلح کے قیام کے لئے مندرجہ ذیل لطیف گُر بتائے ہیں:۔
سب سے اوّل جب دو قوموں میں لڑائی اور فساد کے آثار ہوں معاً دُوسری قومیں بجائے ایک یا دوسری کی طرفداری کرنے کے ان دونو کو نوٹس دیں کہ وہ قوموں کی پنچایت سے اپنے جھگڑے کا فیصلہ کرائیں۔ اگر وہ منظور کرلیں تو جھگڑا مٹ جائیگا۔ لیکن اگر ان میں سے ایک نہ مانے اور لڑائی پر تیار ہو جائے تو دوسرا قدم یہ اٹھایا جائے کہ باقی سب اقوام اس کے ساتھ ملکر لڑیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ سب اقوام کا مقابلہ ایک قوم نہیں کرسکتی ضرور ہے کہ جلد اس کو ہوش آجائے اور وہ صلح پر آمادہ ہو جائے۔ پس جب وہ صلح کے لئے تیار ہو تو تیسرا قدم یہ اٹھائیں کہ ان دونو قوموں میں جن کے جھگڑے کیوجہ سے جنگ شروع ہوئی تھی صلح کرادیں۔ یعنی اس وقت اپنے آپکو فریق مخالف بناکر خود اس سے معاہدات کرنے نہ بیٹھیں بلکہ اپنے معاہدات تو جو پہلے تھے وہی رہنے دیں صرف اسی پہلے جھگڑے کا فیصلہ کریں جس کے سبب سے جنگ ہوئی تھی۔ اس جنگ کیوجہ سے نئے مطالبات قائم کرکے ہمیشہ کے فساد کی بنیاد نہ ڈالیں۔

چوتھے یہ امر مدنظر رکھیں کہ معاہدہ انصاف پر مبنی ہو۔ یہ نہ ہو کہ چونکہ ایک فریق مخالفت کرچکا ہے اس لئے اس کے خلاف فیصلہ کردو۔ بلکہ باوجود جنگ کے اپنے آپکو ثالثوں کی ہی صف میں رکھو فریق مخالف نہ بنجاؤ۔ اِن امور کو مدنظر رکھ کر اگر کوئی انجمن بنائی جائے تو دیکھو کس طرح دنیا میں بین الاقوامی صلح ہو جاتی ہے۔ سب فساد اسی امر سے پیدا ہوتا ہے کہ اول تو جب جھگڑا ہوتا ہے دوسری طاقتیں الگ بیٹھی دیکھتی رہتی ہیں۔ اور جب دخل دیتی ہیں تو الگ الگ دخل دیتی ہیں۔ کوئی کسی کے ساتھ ہو جاتی ہے اور کوئی کسی کے ساتھ اور یہ جنگ کو بڑھاتا ہے گھٹاتا نہیں۔ اگر دوسری طاقتیں آپس میں ملکر بغیر اپنے خیالات کے اظہار کئے کے پہلے یہ فیصلہ کرلیں کہ حکومتوں کی پنچایت کے ذریعہ اس جھگڑے کو طے کیا جائے۔ اور سب مل کر متفقہ طور پر ایک کو نہیں دونو کو یا جس قدر حکومتیں جھگڑ رہی ہوں سب کو توجہ دلائیں کہ لڑنے کی ضرورت نہیں بین الاقوامی مجلس میں اپنے خیالات پیش کرو۔ اور انصاف کے اس

اصل کو مدنظر رکھیں کہ وہ پہلے سے کوئی خیالات نہ قایم کرلیں جس طرح جج فریقین کی باتیں سننے سے پہلے کوئی رائے قایم نہیں کرتا پھر دونو فریق کی بات سُن کر ایک فیصلہ کریں جو فریق تسلیم نہ کرے سب ملکر اس سے لڑیں۔ اور جب وہ زیر ہو جائے تو اسوقت نئے مطالبات اپنی طرف سے نہ پیش کریں بلکہ پہلے ہی جھگڑے کو سُلجھادیں۔ کیونکہ اگر ایسے موقع پر شکست خوردہ قوم کو لُوٹنے کی تجویز ہوئی اور ہر ایک قوم نے مختلف ناموں سے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو لازماً ان فائدہ اٹھانے والی قوموں میں آپس میں بھی تباغض اور تحاسد بڑھیگا۔ اور جس قوم کو وہ زیر کرینگی اس کے ساتھ بھی نیک تعلقات پیدا نہیں ہوسکیں گے اور مجلس بین الاقوام سے دنیا کی حکومتوں کو سچی ہمدردی بھی پیدا نہ ہوسکیگی۔ پس چاہیئے کہ اس جنگ کے بعد صرف اسی جھگڑے کا تصفیہ ہو جس پر جنگ شروع ہوئی تھی نہ کہ کسی اَور امر کا۔

اب رہا یہ سوال کہ جو اخراجات جنگ پر ہوں گے وہ کس طرح برداشت کئے جاویں ہو تو اسکا جواب یہ ہے کہ اخراجات جنگ سب قوموں کو خود برداشت کرنے چاہئیں۔ اور یہ بوجھ ہرگز زیادہ نہیں ہوگا۔ اوّل تو اس وجہ سے کہ مذکورہ بالا انتظام کی صورت میں جنگیں کم ہو جائیں گی۔ اور کسی قوم کو جنگ کرنے کی جرأت نہوگی۔ دوسرے چونکہ اس انتظام میں خودغرضی اور بوالہوسی کا دخل نہ ہوگا سب اقوام اس کی طرف مائل ہو جائینگی اور مصارف جنگ اسقدر تقسیم ہو جائیں گے کہ انکا بوجھ محسوس نہوگا۔

تیسرے چونکہ اس انتظام کا فائدہ ہر اک قوم کو پہنچیگا کیونکہ کوئی قوم نہیں جو جنگ میں مبتلا ہونے کے خطرہ سے محفوظ ہو۔ اس لئے انجام کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ خرچ موجودہ اخراجات سے جو تیاری جنگ کی نیت سے حکومتوں کو کرنے پڑتے ہیں کم ہونگے۔ اور اگر بفرض محال کچھ زائد خرچ کرنا بھی پڑے تو جسطرح افراد کا فرض ہے کہ امن عامہ کے قیام کیخاطر قربانی کریں اقوام کا بھی فرض ہے کہ قربانی کرکے امن کو قائم رکھیں۔ وہ اخلاق کی حکومت سے بالا نہیں ہیں بلکہ اس کے ماتحت ہیں۔

میرے نزدیک سب فساد اسی اختلاف کیوجہ سے پیدا ہوتا ہے جو قرآن کریم کی پیش کردہ تجویز سے کیا جاتا ہے۔ (۱) یعنی آپس کے انفرادی سمجھوتوں کیوجہ سے جو پہلے

سے کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان کی بجائے سب اقوام کا ایک معاہدہ ہونا چاہیئے۔

(۲) جھگڑے کو بڑھنے دینے کے سبب سے۔

(۳) حکومتوں کے جنبہ داری کو اختیار کر کے ایک فریق کی حمایت میں دخل دینے کے سبب سے۔

(۴) شکست کے بعد اس قوم کے حصّے بخرے کرنے اور ذاتی فوائد اُٹھانے کی خواہش کے پیدا ہو جانے کے سبب سے۔

(۵) امن عامہ کے لئے قربانی کرنے کے لئے تیار نہ ہونے کے سبب سے۔

اِن پانچوں نقائص کو دور کر دیا جائے تو قرآن کریم کی بتائی ہوئی لیگ آف نیشنز بنتی ہے۔ اور اصل میں ایسی ہی لیگ کوئی فائدہ بھی دے سکتی ہے۔ نہ وہ لیگ جو اپنی ہستی کے قیام کے لئے لوگوں کی مہربانی کی نگاہوں کی جستجو میں بیٹھی رہے۔

اصل بات یہ ہے کہ کبھی بین الاقوامی جھگڑے دور نہ ہونگے جبتک اقوام بھی اپنے معاملات کی بنیاد اخلاق پر نہ رکھیں گی جس طرح کہ افراد کو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کاموں کی بنیاد اخلاق پر رکھیں اسی طرح حکومتوں کو بھی اخلاق کی نگہداشت کی طرف توجہ دلانی چاہیئے۔ فساد بعض اسباب سے پیدا ہوتے ہیں۔ پہلے انکی اصلاح کرنی چاہئے پھر خود جھگڑے کم ہو جائینگے۔ اور اگر باوجود اس اصلاح کے کسی وقت کوئی جھگڑا پیدا ہو جائے تو اس کے دور کرنے کے لئے اسلامی اصول پر ایک انجمن اصلاح بنانی چاہئیے جو اِن جھگڑوں کا فیصلہ کرے۔

وہ وجوہ جن سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں چند اخلاقی نقص ہیں:۔

(۱) یہ کہ حکومتوں اور رعایا کے تعلقات درست نہیں۔ اگر اسلامی نقطۂ نظر کو مدنظر رکھا جائے کہ ہر ایک ملک کی رعایا کا فرض ہے کہ یا تو اس حکومت سے تعاون کرے جس کے ماتحت وہ رہتی ہے۔ یا اس ملک کو چھوڑ کر چلی جائے تا دوسروں کا بھی امن برباد نہ ہو۔ تو کبھی کسی قوم کو دوسری قوم پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو۔ کیونکہ کوئی قوم اس امر کو پسند نہیں کریگی کہ ایک بنجر ملک پر قبضہ کرے۔

اور (۲) یہ نقص ہے کہ مختلف حکومتوں کو یہ یقین ہے کہ ان کی قومیں صرف اس خیال

سے کہ وہ انکی حکومتیں ہیں انکا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ اسلئے وہ بیخوف ہو کر دوسری قوموں پر حملہ کر دیتی ہیں۔ اگر مندرجہ ذیل اصل جسے اسلام نے پیش کیا ہے قبول کیا جائے کہ "تو اپنے بھائی کی مدد کر۔ اگر وہ مظلوم ہے تو دوسروں کے ظلم سے اسے بچا۔ اور اگر وہ ظالم ہے۔ تو اسکو اپنے نفس کے ظلم سے بچا۔" تو جنگوں میں بہت کچھ کمی آجائے۔ اِسوقت قومی تعصب اسقدر بڑھ گیا ہے کہ اپنی قوم کا سوال پیدا ہوتا ہے تو سب لوگ بلا غور کرنے کے ایک آواز پر جمع ہو جاتے ہیں۔ اور یہ نہیں سوچتے کہ اگر ہماری حکومت کی غلطی ہے تو ہم اس کو سمجھاویں۔ غرض ایک طرف غدّاری اور ایک طرف قومی تعصّب جنگوں کا بہت بڑا موجب ہیں۔ اور انکا دور ہونا نہایت ضروری ہے۔

دنیا جبتک اس گُر کو نہیں سمجھیگی کہ حُبّ الوطنی اور حُبّ الانسانیت کے دونو جذبات ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں اُسوقت تک امن نہیں ہو سکتا۔ اسلام نے کیا چھوٹے سے فقرے میں اس مضمون کو ادا کر دیا ہے اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا (متفق علیہ) یعنی "تو اپنے بھائی کی خواہ وہ ظالم ہو خواہ مظلوم مدد کر" مظلوم کی اسطرح کہ اسے دوسروں کے ظلم سے بچا۔ اور ظالم کی اِسطرح کہ تو اسکو ظلم کرنے سے بچا۔

کیا لطیف پیرایہ میں حُبّ الوطنی اور حُبّ الانسانیت کے جذبات کو جمع کر دیا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے ہم قوموں کو دوسری قوموں پر ظلم کرنے اور ان کے حقوق غصب کرنے سے روکتا ہے تو وہ حُبّ الوطنی کے خلاف کام نہیں کرتا۔ کیونکہ اس سے زیادہ حُبّ الوطنی اور کیا ہوگی کہ اپنے ملک کے نام کو ظلم کے دھبّہ سے بچائے اور پھر ساتھ ہی وہ حُبّ الانسانیت کے فرض کو بھی ادا کر رہا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ خود زندہ رہو اور دوسروں کو زندہ رہنے دو۔

(۳) تیسرا اخلاقی نقص یہ ہے کہ قومی برتری کا خیال بہت بڑھ گیا ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ (حجرات ع ۲) کوئی قوم دوسری قوم کو حقیر نہ سمجھے۔ شاید وہ کل کو اس سے اچھی ہو جائے۔ اور فرماتا ہے تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (آل عمران ع ۱۴) یہ دن ترقی و تنزّل کے

بدلتے رہتے ہیں۔ ایک قوم جو ترقی کیطرف جارہی ہو دوسری قوموں کو حقیر سمجھ کر فساد کا بیج نہ ڈالے کہ کل شاید اس کی باری آئے جیسے آج حقیر سمجھا جارہا ہے۔ جبتک کہ لوگ اسلام کی تعلیم کے مطابق یہ نہیں سمجھینگے کہ ہم سب ایک ہی جنس سے ہیں اور یہ کہ ترقی تنزّل سب قوموں سے لگا ہؤا ہے۔ کوئی قوم شروع سے ایک ہی حالت پر نہیں چلی آئی اور نہ آیندہ چلیگی۔ کبھی فساد دُور نہ ہوگا۔ لوگوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ قوموں کو زیر و زبر کرنے والے آتش فشان مادے دنیا سے ختم نہیں ہوگئے۔ نیچر جس طرح پہلے کام کرتی چلی آئی ہے اب بھی کررہی ہے پس جو قوم دوسری قوم سے حقارت کا معاملہ کرتی ہے وہ ظلم کا ایک نہ ختم ہونے والا چکر چلاتی ہے۔

مذہبی تعلقات

ایک اہم سوال تمدن میں مذہبی تعلقات کا ہے۔ اس کے متعلق مَیں اسقدر کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام سب مذاہب سے زیادہ مذہبی رواداری کا قائل ہے (۱) مثلاً اسلام حکم دیتا ہے کہ کسی مذہب کے بزرگوں کو گالیاں نہ دو۔

(۲) اسلام اس امر کی تعلیم دیتا ہے کہ سب اقوام میں نبی گذرے ہیں پس سب مذاہب ابتداءً اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہی آئے ہیں۔ اسوجہ سے کسی مذہب کو بکلّی خراب نہیں کہا جاسکتا۔

(۳) اسلام کہتا ہے کہ مذہب کے لئے جنگ جائز نہیں۔ کیونکہ راستی اور جھوٹ میں امتیاز ہوچکا ہے۔ اب وہی زندہ ہوگا جو سچائی سے زندہ ہوتا ہے۔ اور وہی مریگا جسے سچائی مارتی ہے۔ یہ ایک غلط خیال ہے کہ اسلام دین کو تلوار سے پھیلانے کی اجازت دیتا ہے۔ اسلام تو صاف طور پر کہتا ہے کہ ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور اسوقت تک لڑو جبتک وہ تم سے لڑتے ہیں۔ کیا جو مذہب اس امر کی تعلیم دیتا ہے وہ تلوار کا مؤید کہلا سکتا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے تلوار سے اسلام کو مٹانا چاہا خدا نے ان کو تلوار سے ہی مٹا

دیا اور دفاع کے طور پر تلوار چلانا ہرگز ناپسندیدہ نہیں ہوسکتا۔ اگر اسلام تلوار سے پھیلا تھا تو وہ تلوار چلانے والے کہاں سے آئے تھے؟ اور جس مذہب نے ایسے تلوار چلانے والے پیدا کرلئے تھے کہ جنہوں نے اپنا سب کچھ قربان کرکے باوجود سارے ملک کی مخالفت کے اسکو دنیا میں قایم کردیا اس مذہب کے لئے یہ کیا مشکل تھا کہ وہ دلائل کے زور سے دوسرے لوگوں سے بھی اپنی صداقت منوالیتا۔ یہ الزام اس مذہب پر جس نے سب سے پہلے رواداری کی تعلیم دی ہے ایک سخت ظلم ہے۔ اور خدا تعالےٰ نے اسی وجہ سے **مسیح موعود** علیہ السلام کو بغیر تلوار کے دنیا میں بھیجا ہے کہ تا آپؑ کے ذریعہ سے اسلام کو دنیا میں پھیلا کر یہ ثابت کرے کہ اسلام اپنی صداقت کے ذریعہ سے پھیل سکتا ہے۔ اور زیادہ دن نہیں گزرینگے کہ دنیا دیکھ لے گی کہ وہ سچ مچ پھیل گیا۔

تمدّن کے متعلق اس تعلیم کے بیان کرنے کے بعد جو اس زمانہ کے **موعود** کی معرفت ہمیں ملی ہے مَیں اس حصہ تعلیم کے بیان کرنے کی طرف توجہ کرتا ہوں جو حالاتِ مابعد الموت کے متعلق اِسلام نے دی ہے ؎

سوال چہارم

حالاتِ مابعد الموت

جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے خدا تعالےٰ کی ہستی کے بعد اگر کوئی سوال دنیا کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتا رہا ہے تو وہ "حالاتِ مابعد الموت" ہیں۔ اور واقع میں جو مذہب کہ مابعد الموت کے حالات پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا وہ ایک جسم بیجان ہے۔ اسلام نے اس مسئلہ پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ بلکہ اسقدر زور دیا ہے کہ دوسری اقوام نے اس کے اس اصرار کو بھی اس کے خلاف بطور حربہ کے استعمال کیا ہے۔ مگر یہ مسئلہ جسقدر اہم ہے اسیقدر

باریک اور قابلِ غور بھی ہے

ہم کبھی ایسے مسائل کی تہ کو نہیں پہنچ سکتے جبتک کہ الہام کی روشنی ہمیں ان کی طرف ہدایت نہ دے کیونکہ جو اِس دنیا میں ہے وہ اُس دنیا کے حالات معلوم نہیں کرسکتا مگر اُسی ہستی کے ذریعہ سے جس کے لئے سب جگہیں یکساں ہیں۔ یہ دنیا اور وہ دنیا انکے علاوہ اور جسقدر دُنیائیں ہیں سب اُس کے لئے آئینہ ہیں۔ کوئی چیز نہیں جو اس سے مخفی ہو پس وہی اُس جگہ کا حال بتلا سکتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جسقدر لوگوں نے اپنی عقل سے مابعد الموت حالات کو بیان کرنا چاہا ہے انہوں نے سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ اور دوسروں کو بھی ٹھوکر دی ہے۔ کوئی تو بعث بعد الموت کے بالکل منکر ہوگئے ہیں۔ کوئی اسے بالکل اس دنیا کی طرح ایک دوسری دنیا خیال کرتے ہیں۔ کوئی اسکو مان کر ارواح کو انعام اور جزا کے لئے واپس دنیا میں لاتے ہیں۔ کوئی اور مختلف خیالات اسکے متعلق پیش کرتے ہیں لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اسکے متعلق جو تعلیم دی ہے وہ ایسی عجیب اور ایسی جدید اور ایسی اعلیٰ ہے کہ یکدم عقل اس سے تسلّی پاتی ہے اور فطرت اس کی سچائی کو قبول کرتی ہے اور قانون قدرت اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اور جن کو مشاہدہ نصیب ہو وہ اسکی حقیقت کو بعینہٖ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں اور یقین کا مرتبہ حاصل کرتے ہیں۔ درحقیقت جس طرح مذہب کے دوسرے حصوں میں آپؑ کی تعلیمات نے جن کی بنیاد یقیناً قرآن کریم پر ہے ایک حیرت انگیز انکشاف پیدا کیا ہے اسی طرح اس حصہ میں بھی ایک پوشیدہ حقیقت کو آپؑ نے ظاہر کیا ہے اور ایک سربستہ راز کو کھول کر دنیا پر ایک عظیم الشان راز کھولا ہے۔ مگر چونکہ اگلا عالم لوگوں کی نظر سے بالکل مخفی ہے مختصر تشریح اس کی حقیقت بیان کرنیکے لئے کافی نہیں اور لمبی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس لئے میں اس جگہ ایک مختصر خاکہ کھینچنے پر کفایت کرونگا۔ کیونکہ نامکمل تشریح سے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ صرف اس علم کے متعلق آپؑ کی تعلیم کا ایک سرو پا انسان کے ذہن میں آجائے۔ پھر جس کے دل میں پیاس ہوگی وہ مزید تحقیق کرسکتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ مابعد الموت حالت کے متعلق بحث و تدقیق کے ساتھ ہی انسان

کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ کیا روح کوئی چیز ہے؟ اگر ہے تو کیا؟ اس کے متعلق اسلام کا جواب یہ ہے کہ روح فی الواقع ایک چیز ہے جس کے ذریعہ سے انسان ان لطیف علوم کو حاصل کرتا ہے جن کو حواس ظاہری سے انسان حاصل نہیں کرسکتا۔ وہ خدا اور انسان کے تعلق کا مقام ہے اور اس کے جلال کا تخت گاہ۔ اسے جسم سے ایسا عجیب تعلق ہے کہ اسکی مثال اور کسی چیز میں نہیں پائی جاتی۔ وہ دماغ کی قوت متفکرہ اور دل کی قوت منفعلہ کے ذریعہ سے انسانی جسم کی ظاہری قوتوں پر اپنا اثر ڈالتی ہے۔ اسیوجہ سے وہ اسقدر ظاہری حرکات سے متاثر نہیں ہوتی جسقدر کہ افکار اور جذبات سے۔ کیونکہ اسکا علاقہ زیادہ تر انہی دو جگہوں سے ہے۔ سائینس ابتک اس تعلق کو معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی جو رُوح اور قلب میں ہے۔ مگر صاحبِ تجربہ لوگ جانتے ہیں کہ رُوح کا قلب سے ایک باریک تعلق ہے جہاں سے دماغ کیطرف وہ تعلق بعض مخفی ذرائع سے اس طرح منتقل ہو جاتا ہے جس طرح کہ تیل بتّی کے ذریعہ سے اوپر چڑھ جاتا ہے۔ اور دماغ کے اعصاب آگے اسے قبول کرکے اس قابل بناتے ہیں کہ اس میں سے ایسی روشنی پیدا ہو جسے لوگ دیکھ سکیں اور ایک حقیقت کا اقرار کریں۔ یہ روح جیساکہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہیں باہر سے نہیں آتی۔ بلکہ رحمِ مادر میں جسم انسانی کی پرورش کے ساتھ ساتھ یہ بھی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اور درحقیقت جسم میں سے نکلا ہوا ایک خلاصہ ہے۔ اسکی مثال شراب کی سی ہے۔ جسطرح جو یا انگور اور ایسی ہی چیزوں میں سے جب انکو خاص ترکیب سے سڑایا جائے شراب نکل آتی ہے۔ اسی طرح جسم رحمِ مادری میں کچھ ایسی کیفیات سے گزرتا ہے کہ اسمیں سے ایک لطیف جوہر نکل آتا ہے جسے رُوح کہتے ہیں۔ جب یہ جوہر جسم سے اپنا تعلق کامل کرلیتا ہے تو اسوقت انسانی قلب حرکت کرنے لگتا ہے اور انسان زندہ ہو جاتا ہے۔ جسم سے نکلنے کے بعد اس جوہر کا وجود ایسا ہی مستقل ہوتا ہے جیسے شراب کا۔

غرض اسلام کے نزدیک رُوح مخلوق ہے۔ اور جسوقت بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اسوقت وہ پیدا ہوتی ہے۔ اور اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ انسانی رُوح پیدا ہونے کے بعد ضائع نہیں جاتی۔ اس کے بعد اس کے سامنے ایک غیر منقطع زمانہ ہے۔ جس حالت کو

موت کہتے ہیں وُہ روح کے جسم سے الگ ہونے کا ہی نام ہے جس کا لازمی نتیجہ دل کی دھڑکن کا بند ہونا اور جسم انسانی کا بیکار ہو جانا ہے۔ اسلامی اصول کے مطابق رُوح اپنی طاقتوں کے اظہار کے لئے ہمیشہ جسم کی محتاج ہے۔ اور جب کبھی جسم اسکی طاقتوں کے اظہار کے ناقابل ہو جاتا ہے وہ اسے چھوڑ دیتی ہے۔ جسوقت جسم روح کو چھوڑتا ہے اسکا نام موت ہوتا ہے جس کے معنے بے حرکت ہو جانے کے ہیں پس جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص مرگیا تو اسکے معنے صرف یہ ہوتے ہیں کہ اُس کی رُوح اسکے جسم سے جدا ہوگئی۔ ورنہ روح فنا نہیں ہوتی بلکہ زندہ رہتی ہے۔ اور اگر کوئی شخص خدا تعالےٰ کو قبول کرتا ہے اور اس کی طاقتوں پر یقین رکھتا ہے تو وہ یہ یقین ہی کب کر سکتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے یہ تمام کارخانہ عالم اِسی لئے بنایا ہے کہ انسان اسمیں پیدا ہو کر کچھ دنوں کھا پی کر یا اس دنیا کے اسرار قدرت دریافت کر کے فنا ہو جائے؟ یہ خیال کہ کوئی عاقل ہستی یہ تمام کارخانہ عالم یہ سورج چاند ستارے، زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں اور قدرت کے باریک در باریک اسرار بنا کر اس پر ایک ایسے انسان کو پیدا کریگی جو صرف ساٹھ ستّر یا سو سال زندگی بسر کر کے فنا ہو جائیگا ایک ایسا خیال ہے جسے عقل دھکے دیتی ہے۔ انسان کے لئے اس قدر کائنات کا پیدا کرنا اور اسپر عقل کے ذریعے سے اسے حکم بخشنا چاہتا ہے کہ اس کے لئے اس محدود زندگی کے علاوہ کچھ اور مقصد بھی مقرر کیا گیا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ وہ مقصد یہ ہے کہ انسان کو دائمی زندگی دیجائے۔ اور دائمی ترقیات کا راستہ اس کے لئے کھولا جائے۔ سورۂ مومنون میں اللہ تعالےٰ زمین و آسمان کی پیدائش اور قدرت کے کارخانہ اور انسان کی طاقتوں کا ذکر فرما کر دریافت کرتا ہے کہ باوجود اس کے تم خیال کرتے ہو کہ صرف اسی دنیا کی زندگی ہے اور موت کے بعد کوئی اور حیات نہیں؟ پھر آخر میں سوال کرتا ہے اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ۝ (مومنون ع ۶) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو یونہی بطور کھیل کے پیدا کیا ہے؟ اور ایک دائمی زندگی کا سلسلہ اور دائمی ترقیات کا سلسلہ جو بعد الموت جاری ہوگا تمہارے لئے مقرر نہیں کیا؟ ایسا نہیں۔ کیونکہ خدا تعالےٰ بلند شان والا ہے اور سچا بادشاہ ہے۔ وہ بلا غرض اور بلا حکمت کوئی کام نہیں کرتا۔ پھر وہ ایک ہی خدا ہے اور نہایت پاکیزہ

اور دلوں میں عزت پیدا کر دینے والی صفات کا مالک ہے پس یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے اس دنیا کو پیدا نہیں کیا۔ یا اس نے تو پیدا کیا ہے مگر اسکی کوئی اہم غرض نہیں رکھی۔

اس حقیقت کے اظہار کے بعد کہ اسلام کے نزدیک مرنے کے بعد بھی انسانی زندگی کا سلسلہ جاری رہتا ہے اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلام اس زندگی کی جو حقیقت ہمیں بتاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگلا جہان کوئی نئی دنیا نہیں ہے بلکہ اسی دنیا کا تسلسل ہے۔ یہ نہیں کہ انسان مر کر کسی وقت تک مردہ پڑا رہیگا۔ اور پھر اسکو زندہ کر کے اس کی نیکی اور بدی کے مطابق اس کو کسی اچھی یا بُری جگہ میں رکھا جائیگا۔ بلکہ درحقیقت انسانی رُوح اپنی پیدائش کے ساتھ ہی ایسی طاقتوں کو لیکر آتی ہے کہ اس کے بعد اس کے لئے فنا حرام ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کی صفت قیوم اسکو اپنے سایہ کے نیچے لے آتی ہے۔ اسوجہ سے وہ ہلاکت سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

پس موت ایک حالت سے دوسری حالت کیطرف انتقال کا نام ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ اور اس انتقال کی ضرورت قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ اگر موت نہ ہوتی تو انسانی روح کامل ترقیات بھی حاصل نہیں کر سکتی تھی کیونکہ انسان کی پیدائش ایسے طریق پر کیگئی ہے کہ جب کسی امر کا کامل انکشاف اسپر ہو جائے تو پھر وہ غلط راستہ پر نہیں چلتا۔ اور کامل انکشاف کے بعد کسی ثواب کا ملنا بھی عقل کے خلاف ہے۔ ہم کسی کو اس لئے انعام نہیں دیتے کہ وہ سورج کو جب وہ نصف النہار پر ہوتا ہے مانتا ہے۔ یا رات اور دن کا قائل ہے لیکن ہم مثلاً ایسے طالب علم کو جو امتحان میں بیٹھکر باریک سوالوں کو حل کرتا ہی انعام دیتے ہیں۔ یا ایسے لوگوں کو جو باریک اسرار قدرت کو دریافت کرتے ہیں معزز اور مکرم سمجھتے ہیں اور انکے درجہ کو بلند کرتے ہیں پس انعام صرف خاص محنت اور پوشیدہ باتوں کے نکالنے پر ملتا ہے اور ایسے کاموں کے کرنے پر ملتا ہے جنہیں انسان کو ہمت اور قوت سے کام لینا پڑے لیکن اگر انسانی ترقیات کا دروازہ اسی دنیا میں شروع ہو جاتا تو بعد میں آنیوالی نسلیں ان لوگوں کو دیکھکر جو اچھے کام کر کے بہت اعلیٰ ترقیات کو حاصل کر رہے ہوتے اور ان لوگوں کو دیکھ کر جو انبیاء کی مخالفت کیوجہ سے سخت آفات میں مبتلا ہوتے۔ خدا تعالےٰ کی ہستی پر اور انبیاء کی سچائی پر ایسا یقین کر لیتیں کہ آئندہ ان کے لئے ابتلاء اور امتحان کا کوئی موقع ہی نہ رہتا اور وہ مستحق بھی نہ رہتیں پس یہ ضروری تھا کہ ایمان کو اور اس کے ثمرات کو ایک حد تک ظاہر کیا جائے اور ایک حد تک مخفی رکھا جائے تاکہ وہ لوگ جو خدا تعالےٰ کے لئے محنت کرنیوالے ہیں

اور وہ لوگ جو دنیا کی لذت میں انہماک کرنیوالے ہیں ایک دوسرے سے ممتاز ہو جائیں اور اپنی اپنی قابلیت اور قربانی کے مطابق انعام یا سزا پائیں۔

غرض موت کی حکمت ان حالات کو انسان کی نظروں سے مخفی رکھنا ہے جو اسکے اعمال کے نتیجہ میں اسکو پیش آتے ہیں تاکہ وہ فکر اور غور اور عقل اور خشیت اللہ سے کام لیکر حقیقت تک پہنچے اور اس کی رُوح میں وہ آزاد قابلیت پیدا ہو جو صرف ایسی ہی کوشش کے نتیجہ میں پیدا ہوا کرتی ہے۔ دوسری غرض موت کی یہ ہے کہ انسانی رُوح ان قابلیتوں کو پیدا کر سکے جن کے بغیر اعلےٰ ترقیات حاصل نہیں ہو سکتیں۔ انسانی جسم ایسا کثیف ہے کہ دنیا کی لطیف چیزوں کا بھی مشاہدہ نہیں کر سکتا کجا یہ کہ اُن باریک طاقتوں کو دیکھ سکے جو اس دنیا کے مادے کی نسبت زیادہ لطیف مادوں سے بلکہ یُوں کہنا چاہیئے کہ ایک قسم کے رُوحانی اجزاء سے بنا ہُوا ہے پس رُوح کو جسم سے جدا کرکے موقع دیا جاتا ہے کہ وہ ان لطیف امور پر واقف ہو جو اسکی بے انتہا ترقیات کیلئے ضروری ہیں۔ پس جب رُوح جسم سے جدا ہوتی ہے تو اسیوقت وہ ایک اور سڑک پر قدم مارنے لگتی ہے۔ اور یہ نہیں کہ اسکو کسی خاص وقت تک کسی خاص کوٹھڑی میں بند کرکے رکھ چھوڑا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے امتحان کے نتیجہ کا انتظار کرے۔

درحقیقت یہ خیال عقلی ڈھکوسلوں کا نتیجہ ہے۔ بعض لوگوں نے انسانی زندگی کو ایک امتحان سے تشبیہ دیکر اس کی پوری صورت بعد الموت کے حالات میں بھی پیدا کر دی۔ اور جس طرح امتحان کے بعد پرچوں کے دیکھنے تک ایک وقفہ ہوتا ہے۔ انسان کی موت کے بعد ایک وقفہ تجویز کیا ہے اور پھر ایکدن مقرر کیا ہے جس دن کہ ان پرچوں کا نتیجہ سُنا دیا جائیگا اور کوئی فیل ہو جائیگا اور کوئی پاس۔ لیکن گو یہ بات تو درست ہے کہ انسانی زندگی کو امتحان کے ایام سے بھی ایک مشابہت ہے مگر یہ درست نہیں کہ امتحان کی سب صورتیں اسپر منطبق ہوتی ہیں۔ اس کی مشابہت اسقدر انسانی طریقۂ امتحان سے نہیں جسقدر کہ قانون قدرت کے ترقی بخش طریق عمل سے ہے۔

چنانچہ اسلام بعد الموت زندگی کو انسان کی ابتدائی زندگی سے تشبیہ دیتا ہے۔ یعنی جس طرح انسان نے نطفہ بلکہ نباتی اور حیوانی زندگی سے رحم مادر میں ترقی کی۔ اور پھر پیدا ہونے کے بعد ایک کمزوری کے زمانہ میں گزرا جس میں اس نے اس دنیا کے علوم اور عادات کو سیکھا۔

اسی طرح وہ مرنیکے بعد مختلف حالات میں سے گزرے گا۔ چنانچہ قرآن کریم جو لفظ رحم کے متعلق استعمال فرماتا ہے وہی اس مقام اور اس حالت کے متعلق استعمال فرماتا ہے جس مقام اور جس حالت میں انسان بعد الموت رکھا جاتا ہے پس مرنیکے بعد انسانی رُوح کی پہلی حالت اس نطفہ کیطرح ہوتی ہے جو رحم مادر میں قرار پاتا ہے۔ اور ان اعمال کے مطابق جو دنیا میں انسان نے کئے ہوتے ہیں اس کے اندر ایک تغیر پیدا ہونا شروع ہوتا ہے۔ اور جس طرح رحم مادر میں بچہ نشو و نما پاتے پاتے ایک ایسی حالت کو پہنچ جاتا ہے کہ اس میں سے ایک اور روح پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح انسانی رُوح مختلف حالات میں سے گزرتے گزرتے ایک ایسا تغیر پیدا کرتی ہے کہ اس کے اندر ایک اَور رُوح جو اس دنیا کی زندگی کی رُوح سے بہت اعلیٰ اور ارفع اور زیادہ قوتیں اَور تیز احساس رکھتی ہے پیدا ہو جاتی ہے اور پہلی رُوح اس کے لئے بمنزلۂ جسم کے ہو جاتی ہے جس کے ذریعے سے انسان ان امور کو جن کو انسان روحانی آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا جسمانی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ وہاں جسم اپنی لطافت میں اس دنیا کی رُوح کی سی کیفیت رکھتا ہے بلکہ یُوں کہنا چاہیئے کہ ایک نئے تغیر کے ماتحت وہ اسی روح سے تیار ہوتا ہے۔

اس تغیر کے بعد ایک اور تغیر روح میں پیدا ہوتا ہے جسے اس دنیا کی چیزوں سے بچہ کی پیدائش کے واقعہ سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ یہ وہ تغیر ہے جسے "حشر اجساد" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ زمانۂ قبر میں انسان کی نئی زندگی کے مناسب حال جسم اور روح تیار ہو گئے ہیں۔ جس طرح کہ رحم مادر میں جب بچہ کامل ہو جاتا ہے اور رُوح پیدا ہو جاتی ہے تو پھر وہ باہر آجاتا ہے۔ اسی طرح گویا وہاں وہ اسحالت قبر سے باہر آجائیگا۔

اس حشر اجساد کے بعد ایک دوسرا زمانہ اسلام یوم حشر کا بتاتا ہے جسے بچپن کی عمر سے تشبیہ دینی چاہیئے جس میں وہ اپنے علم اور اپنی عقل کو اپنی نئی زندگی کے لئے ترقی دیتا اور بڑھاتا ہے۔ اس زمانہ میں روحوں کی قوتیں اُس زمانہ سے جو زمانۂ قبر کہلاتا ہے زیادہ نشوونما یافتہ ہوتی ہیں مگر پھر بھی کامل نہیں ہوتیں۔ مگر اس دن کے اثرات اور تغیرات کے بعد وہ کامل ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی حالت اس بالغ بچہ کیطرح ہو جاتی ہے جو اب دنیا کی کیفیات کو پورے طور پر محسوس کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ اس حالتِ کمال کو آخری فیصلہ کے نام سے موسوم کرتے

ہیں جس کے بعد انسان اس آخری حالت کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے جسے جنت یا دوزخ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

اِن تینوں زمانوں میں انسان اپنی رُوحانی حالت کے مطابق سُکھ یا دُکھ پاتا رہتا ہے۔ یعنی پہلی پیدائش کے زمانہ میں بھی جنت یا دوزخ کے دُکھ یا سُکھ اسکو اپنے احساسات کے مطابق پہنچتے رہتے ہیں۔ اس زمانہ میں بھی جو یوم حشر کہلاتا ہے اور بچپن کی عمر سے مشابہ ہے وہ دُکھ یا سُکھ جس سے اس نے اس دنیا میں مناسبت پیدا کر لی تھی پاتا رہتا ہے گو قبر کی حالت سے زیادہ۔ اور پھر آخر میں جب اس کی نئی پیدائش بالکل مکمل ہو جاتی ہے تو اس کی آخری حالت اس دنیا کے جوان انسان کے مشابہ ہوتی ہے جس نے اپنے احساسات اور ادراکات کو کامل کر لیا اور اسے اس آخری اور دُکھ یا سُکھ کے کامل احساسات والی حالت کیطرف منتقل کر دیا جاتا ہے جسے جنت یا دوزخ کہتے ہیں۔

پس زندگی کا زمانہ کبھی ختم نہیں۔ جزا سزا میں کوئی وقفہ نہیں۔ صرف نئی حالتوں کے ساتھ مطابقت حاصل کرنے کے لئے روح کو دو ایسے زمانوں میں سے گزرنا پڑتا ہے جو آخری اور مکمل حالت سے ادنٰے درجہ کے ہیں لیکن اس تک پہنچنے کے لئے ضروری ہیں۔ انسانی روح برابر ترقیات کی طرف قدم مارتی چلی جاتی ہے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِیْنَ (نحل ع ۴) اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ ۙ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (نحل ع ۴) وہ لوگ جن کی فرشتے رُوح قبض کرتے ہیں درآنحالیکہ وہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے۔ وہ لوگ فرشتوں کو صلح کا پیغام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو کوئی برا کام نہیں کر رہے تھے۔ وہ کہیں گے کہ ہاں ہاں تم برے کام کرتے تھے۔ اللہ تعالےٰ تمہارے اعمال کو جانتا ہے۔ جاؤ دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ اور اسمیں رہو پس تکبر کرنے والوں کا کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔ اور جن لوگوں کی

فرشتے اس حالت میں رُوح قبض کرینگے کہ وہ پاک ہونگے اور فرشتے انکو کہینگے تم پر سلامتی ہو۔ جاؤ اپنے اعمال کے سبب سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اِنّما القبر روضة من ریاض الجنّة او حفرة من حُفَرِ النار (ترمذی جلد ۲ صفحہ ۶۹) ایک قبر جنت کا باغیچہ ہوتی ہے اور ایک قبر دوزخ کا گڑھا ہوتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ انسانی روح برابر زندگی کی حالت میں رہتی ہے اور اس سڑک پر مرنیکے ساتھ ہی چل پڑتی ہے جو اس نے اپنے اعمال سے اپنے لئے تیار کی تھی۔

مذکورہ بالا حدیث میں جو قبر کا لفظ آیا ہے اس سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیئے کہ اس سے وہ مٹی کی قبر مراد ہے جس میں جسم رکھا جاتا ہے۔ نہیں۔ بلکہ اس سے مراد وہ مقام ہے جسمیں ارواح رہتی ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۙ (سورہ عبس ع ۱) ہر انسان کو خدا تعالےٰ مار کر قبر میں ڈالتا ہے۔ اب یہ بات ظاہر ہے کہ ہر اک شخص قبر میں داخل نہیں کیا جاتا بلکہ بہت سے لوگ جلائے جاتے ہیں بعض کو جانور کھا جاتے ہیں۔ بعض سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں۔ پس اس قبر سے مراد وہ مقام ہے جہاں ارواح رہتی ہیں۔ نہ یہ قبر جسمیں بیجان جسم پڑا ہوتا ہے۔ تا افتراق و تحلیل کے ابدی قانون کو اپنے اوپر پورا کرے ✦

ثواب و عذاب اُخروی جسمانی ہیں یا رُوحانی؟

اس امر کے بتانے کے بعد کہ اسلام انسانی روح کی ما بعد الموت حالت کیا بتاتا ہے اب میں اس سوال کے متعلق اسلام کی تعلیم بتانا چاہتا ہوں کہ اگلے جہان کی نعمتیں یا سزائیں جسمانی ہیں یا روحانی؟

سو یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام کے نزدیک اگلے جہان کی کیفیات جسمانی بھی ہیں اور رُوحانی بھی۔ جسمانی تو وہ ان معنوں میں ہیں کہ روح انسانی معًا ترقی کر کے اپنے لئے ایک

جسم تیار کریگی۔ پس وہاں کی لذات اور تکالیف اسی طرح مرئی صورت میں متمثل ہونگی جس طرح کہ اس دنیا میں ہم چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ اور روحانی ان معنوں میں کہ وہ اس مادہ کی نہیں ہونگی جس مادہ کی کہ اس دنیا کی چیزیں ہیں اور یہ ہو بھی کب سکتا ہے کیونکہ اس دنیا سے روح کو دوسرے جہان میں منتقل تو اسی وجہ سے کیا گیا ہے کہ وہ ان لطیف طاقتوں کو حاصل کرے جنکے ذریعے سے وہ ان لطائف کو معلوم کر سکے جنکو یہ جسم معلوم نہیں کر سکتا۔ اب اگر وہاں اسی قسم کے میوے اور اسی قسم کے دودھ اور اسی قسم کے شہد ہوتے ہیں اور اسی قسم کی آگ اور اسی قسم کا دھواں ہونا ہے جیسے کہ اس دنیا میں ہے تو روح کو جسم سے جدا کرنیکی کیا ضرورت تھی پھر تو چاہیئے تھا کہ جسم ہی کے ساتھ اسکو اٹھا لیا جاتا اور جبکہ وہاں کا جسم بھی موجودہ روحانی حالت کے مشابہ ہے تو اس کی غذائیں دودھ اور شہد اور اس کی سزا آگ اور گرم پانی کس طرح بن سکتے ہیں کیا اسوقت انسانی روح یہاں کی آگ اور یہاں کے پانی اور یہاں کے میووں کو استعمال کر سکتی ہے کہ وہاں وہ ان کو استعمال کر سکے گی۔

غرض یہ درست نہیں کہ مرنیکے بعد انسان اسی دنیا کی قسم کی چیزوں سے عذاب یا ثواب دیا جائیگا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہاں لطیف روحانی اجسام کے ساتھ بعض چیزیں متمثل ہو کر انسان کے سامنے پیش ہونگی۔ بدوں کے سامنے سزا کی چیزیں اور نیکوں کے سامنے نیکی کی چیزیں۔ کیونکہ زندگی کی حقیقت کامل طور پر محسوس نہیں ہو سکتی۔ جب تک لطیف چیز اپنی لطافت کے مطابق ایک جسم نہ رکھے۔ ہر اک روح ایک جسم کی محتاج ہے۔ ادنیٰ روح کثیف جسم کی اور اعلیٰ روح لطیف جسم کی۔ پس چونکہ ارواح وہاں بھی ایک جسم رکھینگی۔ یہ بات ضروری ہے کہ انکے سامنے چیزیں اسی طرح محسوسات خارجیہ کے ذریعہ سے پیش ہوں جسطرح کہ اس دنیا میں پیش ہوتی ہیں۔ مگر چونکہ وہ جسم روحانی ہونگے اور اس قسم کے نہیں ہونگے اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ متمثلات بھی اس دنیا کی چیزوں کے مقابلہ میں روحانی ہوں لیکن جس طرح اس دنیا میں علاوہ جسمانی کیفیتوں کے ایک روحانی کیفیات بھی ہوتی ہیں اسی طرح اس دنیا کی اس اعلیٰ اور نئی پیدا شدہ روح کے لئے اس دنیا کی روحانی حالتوں سے اعلیٰ روحانی حالتیں ہونگی۔ ثواب کی بھی اور عذاب کی بھی۔ پس اگلے جہان کی نعمتیں بھی اور

عذاب بھی جسمانی اور روحانی ہونگے۔ اسی طرح جس طرح اس دنیا میں دکھ اور سکھ کی حالت جسمانی اور روحانی دونو طرح کی ہوتی ہے لیکن اس دنیا کی حالتیں اس دنیا کی حالتوں سے اعلیٰ ہونگی۔ وہاں کی جسمانی حالت یہاں کی روحانی حالت کے مشابہ ہوگی اور روحانی حالت بہت ہی ارفع اور اعلیٰ ہوگی۔

قرآن کریم بے شک مابعد الموت حالات کے متعلق سزا کے لئے آگ اور سردی اور طوقوں وغیرہ کا ذکر کرتا ہے۔ اور انعام کے طور پر سائیوں اور پانیوں اور دودھ اور شہد کا ذکر کرتا ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی فرماتا ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (سجدہ ع۲) یعنی کوئی نفس نہیں جان سکتا کہ اسکے لئے بسبب اس کے اعمال کے کس قسم کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان تیار کیا گیا ہے؟ اسی طرح حدیث میں ہے کہ جنت کی نعمتیں ایسی ہیں کہ لا عين رأت ولا اذن سمعت ولا خطر على قلب بشر (مشکوٰۃ باب صفۃ الجنۃ ص۴۹۵) نہ آنکھوں نے دیکھیں نہ کانوں نے سنیں اور نہ انسان کا ذہن ان کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اب اگر وہاں اس دنیا کی نعمتیں ہونگی تو گو وہ کیسی ہی اعلیٰ ہوں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان ان کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ پس یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ وہ نعمتیں بالکل ہی اور قسم کی ہیں اور اسی طرح وہاں کے عذاب بھی۔

اسی طرح اللہ تعالےٰ ایک جگہ فرماتا ہے کہ جنتیوں کے سامنے جب جنت کے میوے رکھے جائیں گے تو وہ کہیں گے هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ یہ تو وہ نعمت ہے جو ہمیں پہلے دی گئی تھی۔ اللہ تعالےٰ اس قول کے متعلق فرماتا ہے وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا وہ ملتی جلتی چیزیں دیئے جائیں گے۔ یعنی وہ چیزیں دنیا کی سی چیزیں نہیں ہونگی مگر اپنی ظاہری شکلوں میں ان سے مشابہ ہونگی۔

اصل بات یہ ہے کہ روح گو جسم کیطرح جسمانی چیزوں کو استعمال نہیں کرتی لیکن جسم کے سرور سے حصہ ضرور لیتی ہے اور اسی طرح جسم کی تکالیف سے حصہ لیتی ہے پس چونکہ دنیاوی چیزوں سے وہ مانوس ہے اسکی خوشی اور اس کے رنج کو مکمل کرنیکے لئے وہاں کی چیزیں دنیاوی

چیزوں کی شکل میں متمثل ہونگی۔

قرآن کریم نے مابعد الموت کی رُوحانی حالتوں کے سمجھنے کے لئے ایک لطیف مثال دی ہے اس سے انسان اچھی طرح اس جہان کی کیفیت کو اس حد تک کہ اس دنیا کی قوتوں کے ساتھ سمجھ میں آسکتی ہے سمجھ سکتا ہے۔ فرماتا ہے اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْھَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰٓی اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۝ (زمر ع ۵) اللہ تعالےٰ رُوح قبض کرتا ہے لوگوں کی موت کے وقت اور جو نہیں مرتا اسکی نیند میں۔ پس روک رکھتا ہے اُس رُوح کو جس پر موت کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے۔ اور واپس کر دیتا ہے دوسری کو ایک مدت مقررہ تک کیلئے۔ اس میں بہت سے نشانات ہیں اس قوم کے لئے جو فکر کرتی ہے۔ یعنی خواب کی حالت میں بھی رُوح کا تعلق جسم سے عارضی طور پر الگ ہوتا ہے اور اسپر انسان مابعد الموت حالت کا قیاس کر سکتا ہے۔ چونکہ یہ علیحدگی عارضی ہوتی ہے اس لئے دماغ کے ساتھ اس کا تعلق قائم رہتا ہے اور اس وجہ سے انسان ان کیفیتوں کو یاد رکھ سکتا ہے جو رُوح کو جسم سے علیحدگی کے وقت پیش آتی ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ فکر کرنیوالے ہیں ان کیلئے اسمیں بہت بڑے فوائد ہیں یعنی وہ اس کے ذریعہ سے رُوح کی کیفیت اور اس کے اعمال اور مابعد الموت کے حالات کو سمجھ سکتے ہیں۔

اب خواب کی حالت پر غور کر کے دیکھو۔ اس میں گو جسم آرام سے سویا ہُوا ہوتا ہے مگر انسان اپنے آپکو دوسری شکلوں میں دیکھتا ہے اور مختلف جگہوں کی سیر کر لیتا ہے اور جن چیزوں کو دیکھتا ہے وہ جسم رکھتی ہیں۔ مگر ان کا جسم ویسا نہیں ہوتا جس قسم کا کہ ان مادی چیزوں کا۔ ہاں کبھی کبھی وہ جسم ایسا کامل ہو جاتا ہے کہ اس کے آثار جسم پر بھی نمودار ہو جاتے ہیں۔ اور جو صاحب تجربہ ہیں وہ اسے جانتے ہیں۔ مَیں نے خود اسکا کئی بار مشاہدہ کیا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ میں روزے میں تھا اور مجھے پیاس کی سخت تکلیف تھی۔ جب وہ تکلیف حد سے بڑھ گئی تو مَیں نے دُعا کی اور مَیں نے دیکھا کہ معاً ایک غنودگی کی حالت مجھ پر طاری ہوئی اور ایک پیاس بجھانے والی چیز میرے مُنہ میں ڈالی گئی۔ یہ کیفیت ایک سیکنڈ کی تھی اسکے بعد وہ حالت بدل گئی۔ اور مَیں نے دیکھا کہ وہ پیاس

کی حالت بالکل جاتی رہی اور یوں معلوم ہُوا کہ جس طرح خوب پانی پی لیا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایسے بہت سے تجربات لکھے ہیں۔ حتیٰ کہ آپ نے عین بیداری میں رُوحانی جسم کے ساتھ حضرت مسیح ناصریؑ کو دیکھا ہے اور دیر تک ان سے مسیحیت کی خرابیوں اور انکی اصلاح کے متعلق گفتگوئیں کی ہیں۔ اور ایکدفعہ تو آپ نے انکے ساتھ مل کر کھانا بھی کھایا ہے۔ اب یہ باتیں ان لوگوں کیلئے جو ان علوم سے واقف نہیں ایک وہم اور دماغ کی خرابی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں مگر جو لوگ صاحب تجربہ ہیں اور رُوحانی علوم کے ماہر ہیں وہ ان کیفیتوں کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ میری مُراد رُوحانی علوم سے اسجگہ دماغی کیفیات نہیں ہیں جو مسمریزم وغیرہ کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ بالکل الگ چیز ہیں اور ان کا رُوحانی حالتوں سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ رُوحانی حالتوں کی کیفیات ہی اَور ہیں۔

غرض یہ کہ خواب کا عالم اور کشف کا عالم عالمِ اُخروی کے لئے بطور مثال کے ہے۔ اور اس پر انسان اس عالم کا قیاس کر سکتا ہے جس طرح خواب میں سب چیزیں رُوحانی ہوتی ہیں مگر پھر ایک جسم بھی رکھتی ہیں۔ اسی طرح اگلے جہان میں ہوگا کہ وہاں کی چیزیں جسم تو رکھینگی لیکن وہ جسم رُوحانی ہوگا۔ اور انکے علاوہ ان سے اعلیٰ کیفیات خالص رُوحانی ہونگی۔

قرآن کریم اس واقع کی حقیقت یہ بیان کرتا ہے کہ اسی دُنیا کے اعمال متمثل ہو کر وہاں انسان کے سامنے آئینگے۔ وہاں کا پانی نہیں ہوگا مگر اس دنیا کا عمل بر شریعت اور دودھ نہیں ہوگا مگر علم الٰہی جو اس دنیا میں حاصل کیا گیا تھا۔ اور میوے نہیں ہونگے مگر وہی لذت اور سرور جو خدا تعالیٰ کی اطاعت میں رُوح اس دُنیا میں محسوس کرتی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰہُ طٰٓئِرَہٗ فِیْ عُنُقِہٖ وَنُخْرِجُ لَہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ کِتٰبًا یَّلْقٰہُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ کِتٰبَکَ کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْبًا ۝ (بنی اسرائیل ع ۲) ہر ایک انسان کے ساتھ اسکے عمل لگے چلے جاتے ہیں وہ کبھی اس سے جدا نہیں ہوتے۔ گو انکے اثرات مخفی ہوتے ہیں لیکن قیامت کے دن ہم ان اعمال کو اس طرح کر دینگے گویا وہ ایک کتاب ہے جسے وہ کھولکر پڑھ رہا ہے یعنی اسوقت وہ اپنے اثرات کو ظاہر کر دینگے اور ایک ایک عمل جو انسان نے اس دُنیا میں کیا تھا وہ اپنا نتیجہ وہاں ظاہر کریگا اور اُس دُنیا کی

زندگی کو اپنے مطابق ڈھالیگا۔ پھر فرماتا ہے ہم انسان سے کہیں گے اب اپنی یہ کتاب پڑھتا رہ۔ یعنی ان اعمال کے مطابق ترقی یا تنزل حاصل کر اور اُن کا نتیجہ بھگت ہمیں تیرا حساب لینے کی ضرورت نہیں۔ تیرا نفس خود تجھ سے حساب لیتا رہیگا۔ یعنی جو اثرات تیرے اعمال نے پیدا کئے ہیں وہ تیرے لئے سزا کے طور پر بھی اور انعام کے طور پر بھی کافی ہیں ہمیں کسی نئی سزا اور جزا کے دینے کی ضرورت نہیں۔ دیکھو یہ آیت کس وضاحت سے بتاتی ہے کہ اگلے جہان کی نعمتیں اور سزائیں اسی دنیا کے اعمال کے تمثلات ہیں۔

ایک دوسری جگہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ کَاْسٍ کَانَ مِزَاجُهَا کَافُوْرًا ۝ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا ۝ (الدہر ع ۱۰) نیک لوگ وہاں ایسے پیالوں سے پئیں گے جنکا اثر کافوری ہوگا یعنی وہ ناجائز جوشوں کو دبانے والے ہونگے۔ ایسے چشموں سے وہ پیالے بھرے جائینگے جو چشمے کہ مومنوں نے بڑی محنت سے پھوڑے ہیں یعنی دُنیا میں جو عمل وہ کرتے رہے ہیں وہی بطور مثال اس وقت چشموں کی صورت میں ظاہر ہونگے وہ کوئی الگ شئے نہیں۔

اسی طرح قرآن کریم فرماتا ہے وَمَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی (بنی اسرائیل ع ۸) جو شخص اس دنیا میں اندھا ہو وہ اگلے جہان میں بھی اندھا ہوگا یعنی جس نے اس دُنیا میں اللہ تعالےٰ کو اپنی روحانی آنکھوں سے نہیں دیکھا وہاں چونکہ یہی رُوح بمنزلہ جسم کے ہوگی وہ اپنے آپ میں اندھوں کی قسم کی ایک کیفیت محسوس کریگا۔

ایک اور جگہ فرماتا ہے وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْۤ اَعْمٰی وَقَدْ کُنْتُ بَصِیْرًا ۝ قَالَ کَذٰلِکَ اَتَتْکَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا ۚ وَکَذٰلِکَ الْیَوْمَ تُنْسٰی (طٰہٰ ع ۷) ایسا شخص جو اس دُنیا میں میری یاد سے بے پروا رہتا ہے اور مجھے تلاش کرنیکی طرف توجہ نہیں کرتا وہ ایسی زندگی بسر کریگا جو اسکی روحانی طاقتوں کو بالکل محدود کرتی چلی جائیگی۔ اور آخر نتیجہ یہ نکلیگا کہ اسکی رُوح جب اپنی طاقتوں کو مکمل کریگی اور وہ وقت آئیگا جو دوسری روحانی زندگی کیلئے بمنزلہ پیدائش کے ہو تو وہ اندھا ہوگا۔ گویا نئی پیدائش میں

وہ اندھا ہی پیدا ہوگا۔ تب وہ گھبرا کر کہے گا کہ خدایا یہ کیا ہوا؟ کہ میں تو اس دُنیا میں سوجاکھا تھا اب تُو نے مجھے اندھا کیوں پیدا کیا ہے۔ اسپر اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ اسی طرح تُو نے میرے کلام کو ترک کردیا تھا پس آج ہم نے بھی تجھے تیرے اعمال کے مطابق نتیجہ نکلنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ اگلے جہان کا اندھاپن اس دُنیا کے روحانی اندھے پن کے سبب سے ہوگا۔

پس صاف ثابت ہے کہ اسلام کے نزدیک اگلے جہان کے تمام دُکھ اور سُکھ کے سامان گو ایک قسم کا جسم رکھیں گے مگر ہونگے اس دُنیا کے اعمال کے تمثلات نہ کہ کوئی نئی چیز تفصیلی طور پر بھی جو چیزیں اگلے جہان کی بتائی ہیں ان سے یہی امر معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں فرماتا ہے کہ جنت میں ایک قسم کی شراب ملیگی۔ مگر فرماتا ہے کہ وہ شراب ایسی ہوگی کہ دلکو پاک کریگی۔ اب یہ امر ظاہر ہے کہ جسمانی چیز دلکو پاک نہیں کرسکتی۔ پس شراب سے مراد وہی محبت الٰہی ہے جو اس دُنیا میں انسان کو خدا تعالےٰ سے حاصل تھی۔ وہی اگلے جہان میں شراب کی شکل میں دکھائی جائیگی جس طرح کہ خواب میں انسان روحانی حالتوں کو جسمانی شکلوں میں دیکھتا ہے۔ چنانچہ جب اس شراب کو انسان پیئے گا تو چونکہ محبت الٰہی ہی اس شکل میں متمثل ہوگی کوئی مادی شراب نہ ہوگی اسلئے اسکے دل پاک ہونگے اور خدا کی محبت اور بھی بڑھے گی۔

خلاصہ کلام یہ کہ اسلام نے اگلے جہان کی نعمتوں اور اگلے جہان کی سزاؤں کو جہاں جسمانی قرار دیا ہے وہاں انکو ساتھ ہی روحانی بھی قرار دیا ہے۔ اور درحقیقت یہی کیفیت اصلی اور صحیح کیفیت ہے۔ جن لوگوں کو اصل حقیقت معلوم نہ تھی انہوں نے یا تو انکو جسمانی ہی قرار دے دیا ہے یا صرف قلبی کیفیات سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ دونوں امور عقل کے خلاف ہیں۔ نہ وہاں جسمانی چیزیں ہو سکتی ہیں اور نہ خالص قلبی احساسات اس غرض کو پورا کرسکتے ہیں۔ اور نہ کوئی لطیف شئے جو مخلوق ہو بغیر ایک اپنی نسبت کثیف جسم کے رہ سکتی اور اپنی طاقتوں کا اظہار کرسکتی ہے ؎

اگلے جہان کے عذاب اور ثواب کہاں اور کس صورت میں ہونگے؟

ایک سوال یہ ہے کہ عالم آخرت کے عذاب اور عقاب کہاں ہونگے؟ اور کس صورت میں ہونگے؟ اس سوال کا جواب اسلام نہایت ہی لطیف پیرایہ میں دیتا ہے جس کے مقابلہ میں دوسرے ادیان بالکل خاموش ہیں۔ اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ دوزخ درحقیقت اُن عذابوں کا نام ہے جو حواس سبعہ کے ذریعہ سے محسوس ہونگے چنانچہ اللہ تعالےٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ ۔ لِكُلِّ بَابٍ مِنْهَا جُزْءٌ مَقْسُومٌ ۔ دوزخ کے سات دروازے ہونگے۔ اور ان سات دروازوں میں سے ہر اک میں سے دوزخی کا ایک حصہ گزریگا لیکن چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم دوزخی ہو یا جنتی ہر اک انسان کو مکمل ظاہر کرتا ہے۔ یہ نہیں بتاتا کہ اس کے ٹکڑے کئے جائینگے۔ اسلئے سات دروازوں سے انسان کا ایک ایک ٹکڑا داخل ہونا درحقیقت اس امر پہ دلالت کرتا ہے کہ دوزخ کو سات حواس کے ذریعہ سے انسان محسوس کریگا پس گویا سات دروازوں کے ذریعہ سے وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔ اور ہر اک دروازہ میں سے اس کا ایک حصہ داخل ہوگا یعنی ایک حصہ بینائی کے ذریعہ سے ایک حصہ شنوائی کے ذریعہ سے ایک حصہ قوت شامہ کے ذریعہ سے ایک حصہ قوتِ ذوق کے ذریعہ سے۔ ایک حصہ قوتِ لامسہ کے ذریعہ سے ایک حصہ قوت حاسہ کے ذریعہ سے جسے سنس آف ٹمپریچر کہتے ہیں یعنی حسِ حرارت اور حس برودت کے ذریعہ سے اور ایک قوت فاعلیہ کے ذریعہ سے جسے مسکولر سنس کہتے ہیں ان ساتوں ہی حسّوں سے انسان تمام گناہ کرتا ہے۔ یا تو آنکھ کے ذریعہ سے گناہ کرتا ہے کہ بُری چیزوں کو دیکھتا ہے یا بدی کی نگاہ ڈالتا ہے۔ یا کان کے ذریعہ سے گناہ کرتا ہے کہ غیبتیں سنتا ہے فحش سنتا ہے۔ یا ناک کے ذریعہ سے گناہ کرتا ہے کہ جس چیز کو نہیں سونگھنا چاہیئے تھا اسے سونگھتا ہے یا ذوق کے ذریعہ سے کرتا ہے کہ ایسی چیزوں کو کھاتا ہے جو نہیں کھانی چاہیئے تھیں۔ یا

لامسہ کے ذریعہ سے گناہ کرتا ہے کہ نرم بستر اور فرشوں کی خواہش اسکو بنی نوع انسان کے لئے مشقت اُٹھانے میں روک ہوتی ہے۔ یا پھر گرمی اور سردی کے ڈر کے مارے نیک کاموں میں سستی کرتا ہے اور یا سستی اور غفلت کے سبب سے اپنے جسم کو تھکان سے بچانے کے لئے نیک کاموں کو ترک کر دیتا یا ادھورا چھوڑ دیتا ہے۔

غرض سات ہی حواس ہیں جو انسان سے بدی کراتے ہیں اور یہی سات حواس انسان سے نیکیاں بھی کراتے ہیں پس جہنم کے سات دروازوں سے جن کے ذریعے سے انسان جہنم میں داخل ہوگا وہی سات حواس مراد ہیں جن کے واسطہ اور سبب سے انسان دُنیا میں گناہ کرتا تھا۔ عالم آخرت میں یہی اس کے عذاب چکھانے کا موجب ہونگے۔ کیونکہ بوجہ بدی کی عادت ہونے کے ان سات جسمانی حواس کے مقابلہ میں سات رُوحانی حواس کمزور اور بیمار ہو جائینگے۔ اور بیماری کی وجہ سے وہ اس دُکھ اور عذاب کو محسوس کرینگے جو اگلے جہان میں غلط کاروں کے لئے مقرر ہے۔ چنانچہ ان ساتوں قسم کے عذاب کا قرآن کریم میں ذکر ہے رؤیت کے عذاب کے متعلق فرماتا ہے وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ کاش! منکرین اسوقت کا نظارہ اپنے ذہنوں میں لاسکیں جب وہ عذاب کو دیکھیں گے یعنی ایسے نظارے ان کو دکھائے جائیں گے جنکی وجہ سے انکو تکلیف معلوم ہوگی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سانپ اور بچھو اور اسی قسم کی اور چیزیں ان کو نظر آئینگی۔

قوت سامعہ کے عذاب کے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے إِذَا رَأَتْهُمْ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ سَمِعُوا لَهَا تَغَيُّظًا وَزَفِيرًا (فرقان ع ۲) جب وہ دوزخ کے سامنے آئینگے تو اسکی تیز آواز اور چیخ سنیں گے یعنی اس کے شعلوں کی آواز نہایت ڈراؤنے طور پر نکلیگی جو خود ایک عذاب ہوگی

قوت شامہ اور ذائقہ کے متعلق فرماتا ہے۔ وَيُسْقَىٰ مِنْ مَاءٍ صَدِيدٍ ۔ يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهُ (ابراہیم ع ۳) وہ گندے اور میلے پانی پینے کو دیئے جائیں گے جن کو بدمزے اور بُو کے سبب سے وہ نگل نہیں سکیں گے۔

چھونے کے عذاب کے متعلق فرماتا ہے لَهُمْ مِنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِنْ

فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ (اعراف ع ۵) انکو اس جگہ بستر اور اوڑھنے بھی عذاب کے ہی ملیں گے یعنی انکی قوت لامسہ بھی عذاب پارہی ہوگی۔ اسی طرح فرماتا ہے وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا (فرقان ع ۲) جس وقت وہ جہنم میں ایک تنگ جگہ پر ڈالے جائیں گے جکڑ کر اسوقت ہلاکت کی دُعا کریں گے۔

گرمی اور سردی کے عذاب کے متعلق فرماتا ہے فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ (ص۔ ع ۴) اس عذاب کو چکھو گرمی اور سردی کا عذاب۔

مسکولرسنس کے عذاب کے متعلق فرماتا ہے وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (غاشیہ۔ ع ۱) اس دن کچھ منہ ذلیل ہونگے محنت کرینگے اور تھکیں گے نتیجہ کچھ نہ نکلے گا۔

غرض کہ ساتوں حواس کے عذاب قرآن کریم نے بیان فرمائے ہیں۔ اور اس سے مراد انکے ساتوں روحانی حواس کے خراب ہو جانے سے ہے جس کے باعث وہ عذاب میں مبتلا ہونگے چونکہ انہوں نے اس دنیا میں خدا کی نعمت یعنی حواس کو بُرے طور پر استعمال کیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ روحانی زندگی میں انکے حواس بالکل بیمار ہونگے اور ہر چیز ان کے لئے عذاب بنجائیگی انہی حواس کو جن لوگوں نے نیک طور پر استعمال کیا ہوگا انکے لئے وہ آرام کا موجب ہو جائیں گے کیونکہ صحیح استعمال سے چیز کی طاقت بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ نیکو کاروں کے جو انعام قرآن کریم نے بتائے ہیں وہ بھی ان ساتوں حواس سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر حس کو لذت حاصل ہوتی ہے کیونکہ وہ تندرست ہوگی۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ سورج کی خوشگوار روشنی جو آنکھوں کیلئے طراوت کا موجب ہوتی ہے اور دل اس سے فرحت حاصل کرتا ہے۔ وہ بیمار آنکھ والے کیلئے کیسی تکلیف دہ ہوتی ہے اور وہ اس سے کس قدر دُکھ اور تکلیف محسوس کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر اسکو جلد نہ روکا جائے تو قریب ہوتا ہے کہ بیمار کی آنکھ ہی ماری جائے یا وہ بیہوش ہو جائے۔ اسی طرح دیکھتے نہیں کہ وہ خوشگوار اور خوبصورت آواز جو طبائع کیلئے نہایت سرور بخش ہوتی ہے۔ اس شخص کیلئے جسکے کانوں میں نقص ہو یا سر درد ہو کس قدر تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔ وہی آواز جو بعض دوسروں کو نئی زندگی بخشتی ہے وہ ایسے لوگوں کی جان کے لئے وبال اور ناقابل برداشت ہو جاتی ہے

پھر کیا نہیں دیکھتے کہ انہی حواس کے نقص کی وجہ سے وہ ناک جو خوشبو سونگھنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے جب اسکی حس ذکی ہو جاتی ہے ہر خوشبو کو سونگھ کر تکلیف اٹھاتا ہے۔ اور بعض لوگوں میں تو یہ نقص اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ وہ عطر کی خوشبو سونگھتے ہی بیمار ہو جاتے ہیں اور ان کے سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ حالانکہ خوشبو ایک اعلیٰ درجہ کی نعمت ہے۔ پھر کیا نہیں دیکھتے کہ مُنہ کا مزہ جو انسان کے لئے ایک بہت بڑا انعام ہے جب خراب ہو جاتا ہے تو میٹھے کو کڑوا اور نمکین کو سخت شور محسوس کر کے انسان کے لئے کس قدر تکلیف کا موجب ہو جاتا ہے اور ہر چیز کی لذت کو خراب کر دیتا ہے۔ بلکہ ایک عذاب بنا دیتا ہے۔ پھر کیا نہیں دیکھتے کہ جب لمس کی حس میں فرق پڑ جاتا ہے تو نرم گدے جو دوسروں کے لئے آرام کا باعث ہوتے ہیں ایسے شخص کو پتھر سے زیادہ سخت اور کانٹوں کے بچھونے معلوم ہوتے ہیں اور آدمی ان پر پڑا لوٹتا ہے۔ پھر کیا نہیں دیکھتے کہ گرمی سردی کی حسوں میں جب نقص پیدا ہو جاتا ہے تو وہی سردی جو دوسرے لوگوں کے لئے راحت دے رہی ہوتی ہے ایسے شخص کے لئے آگ بنجاتی ہے اور وہ اپنے اوپر سے کپڑے اُتار اُتار کر پھینک رہا ہوتا ہے اور یہی شکایت کرتا ہے کہ میں جل گیا۔ حالانکہ پاس کے لوگ سردی محسوس کرتے ہیں۔ پھر کیا نہیں دیکھتے کہ گرمی کے موسم میں جسکی گرمی کی حس کو کسی بیماری کی وجہ سے صدمہ پہنچ جاتا ہے وہ سردی کے مارے کانپنے لگتا ہے اور کپڑے اوڑھتا ہے۔ حالانکہ دوسرے لوگ برف کا استعمال کر رہے ہوتے ہیں اور پنکھے جھلتے ہیں۔ اسی طرح کیا نہیں دیکھتے کہ جن لوگوں کی حس عاملہ خراب ہو جاتی ہے انکو وہی چلنا پھرنا جو دوسروں کے اندر نشاط پیدا کرتا ہے عذاب معلوم ہوتا ہے اور دو قدم چلنے سے پاؤں پھول جاتے ہیں۔ غرض یہ سب نظارے اس دُنیا میں موجود ہیں اور انسان ان نظاروں سے دوزخ کی کیفیت کو اچھی طرح معلوم کر سکتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جس طرح نیکی ایک مستقل وجود کا نام ہے اور بدی اس کے غلط استعمال کا نام ہے۔ اسی طرح نعمائے الٰہی اصل ہیں اور عذاب اس خرابی کا نتیجہ ہے جو انسان خود اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے دریافت کیا یا رسول اللہ! جب اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ جنت کا پھیلاؤ آسمان اور زمین کے برابر ہے تو

پھر دوزخ کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا جب دن آتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے؟ یہی حال جنت اور دوزخ کا ہے (حاکم) اب یہ مراد اس قول سے نہیں ہو سکتی کہ ایک زمانے میں سب لوگ دوزخ میں ہونگے اور ایک زمانہ میں سب لوگ جنت میں۔ جس طرح کہ ایک وقت رات آتی ہے اور دوسرے وقت دن۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ رات بھی ساری دنیا پر آتی ہے اور دن بھی ساری دنیا پر چڑھتا ہے مگر وہ جو سورج کے نیچے آجاتے ہیں انکے لئے دنیا پر دن ہو جاتا ہے اور دوسروں کے لئے رات۔ اسی طرح وہ لوگ جو خدا کے فضل کے نیچے آجائینگے ان کے لئے وہ جگہ جنت ہو جائیگی دوسروں کے لئے دوزخ۔ پس جو لوگ خدا تعالےٰ کے فضل سے حواس سبعہ درست رکھتے ہوں گے وہ جنت کی لذتیں محسوس کرینگے اور جو لوگ ان حواس کو خراب کر چکے ہونگے ان کے لئے یہی نعمتیں عذاب و سخت عذاب ہونگی۔ نیک تو اسی قدر گرمی محسوس کریگا جو اسکے لئے خوشی کا موجب ہوگی۔ لیکن بد ایسی شدید آگ محسوس کریگا کہ وہ اپنے شعلوں سے اسکو جھلس دیگی۔ جس طرح ایک بیمار آگ دیکھتا ہے اور اسکی گرمی بھی محسوس کرتا ہے۔ نیک ٹھنڈے پانی کے مشابہ روحانی نعمتوں کو حاصل کریگا۔ لیکن جب بد کو پانی ملیگا وہ اس کو ایسا سخت گرم پائے گا کہ اُس کے مُنہ کو جھلس دے گا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ہر شخص کیلئے جنت اور دوزخ میں جگہ بنی ہوئی ہے۔ جو جنت میں جاتے ہیں وہ دوزخیوں کی جگہ لے لیتے ہیں اور جو دوزخ میں جاتے ہیں وہ جنتیوں کے حصّہ کی جگہ بھی لے لیتے ہیں اس سے بھی یہی مراد ہے کہ جنتی سب راحت کو لے لیتا ہے اور سزا یافتہ سب عذاب کو۔ یہ محاورہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی نعمت سے فائدہ نہ اُٹھا سکے تو وہ دوسرے کو کہتا ہے کہ تو نے بھی میرا حصّہ لے لیا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ دوزخ کے متعلق فرماتا ہے وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا پھر فرماتا ہے ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا (مریم ع ۵) ہر ایک شخص دوزخ میں وارد ہوگا پھر ہم متقیوں کو اس کے عذاب سے بچا لینگے۔ وارد بھی ہونگے اور بچیں گے بھی۔ اسکے یہی معنی ہیں کہ جنتی اپنے حواس کی درستی کیوجہ سے ہر اک چیز کو اپنے لئے راحت بنا لیگا۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک شخص کو کہیگا تو دوزخ میں چھلانگ مار۔ جب وہ اسمیں کودیگا تو وہ اسے بالکل آرام دہ معلوم ہوگی۔ پس اگلے جہان کا ثواب اور عذاب ان کیفیات کا نام ہے جسے وہ روحانی جسم محسوس کریگا جو اگلی دُنیا میں ملے گا۔ اور یہ کیفیات نتیجہ ہونگی حواس سبعہ کے صحیح یا غلط استعمال کا۔

ہاں ایک امر ہے اور وہ یہ کہ دوزخی لوگ اپنی جگہوں میں محصور ہونگے مگر جنتی آزاد ہونگے جس طرح بیمار بستر پر لٹایا جاتا ہے اور تندرست آزاد پھرتا ہے۔ کیونکہ دوزخ ایک قید خانہ ہے اور جنت ایک سیر گاہ۔ پس دوزخ ایک محدود مقام کا نام ہے اور جنت غیر محدود ہے۔ دوزخی اپنے علاقہ سے نہیں نکل سکتا کیونکہ وہ ایک بیمار کی طرح بستر پر لٹایا ہوا ہے لیکن جنتی جہاں چاہے جائے اس کے لئے ہر مقام جنت ہے۔ اگر وہ اس مقام میں بھی داخل ہو جو دوزخیوں کیلئے آگ کا کام دیتا ہے تو اسے وہ بھی گلزار ہی معلوم دیگا۔ مگر چونکہ دوزخی تکلیف میں ہونگے اور تکلیف کو دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے اس لئے انکو ایک لطیف پردہ کے ذریعہ سے جنتیوں کی آنکھ سے پوشیدہ رکھا جائیگا۔ سوائے اس کے کہ وہ خود خواہش کر کے دیکھنا چاہیں تا کہ طبیعت پر تکلیف کی حالت دیکھ کر ملال نہ آئے۔ اور جنتی ایک دوسرے کے مدارج سے بھی غافل رہینگے بلکہ ہر ایک اپنی ہی حالت سے واقف ہوگا۔ ہاں جب خدا تعالےٰ چاہیگا کہ کسی کو ترقی دے تو وہ اسے اوپر کے شخص کے درجہ کی حالت سے آگاہ کریگا۔ اور جب اسکے دل میں تمنا پیدا ہوگی تو اس کو وہ درجہ مل جائے گا۔

کیا عذاب اور ثواب دائمی ہونگے؟

ایک سوال عالم آخرت کے متعلق یہ ہے کہ کیا عذاب اور ثواب دائمی ہیں؟ اسلام اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ جزائے نیک تو دائمی ہوگی مگر عذاب دوزخ دائمی نہیں ہوگا۔ کیونکہ قرآن کریم فرماتا ہے کہ سب انسان اس لئے پیدا کئے گئے ہیں تا خدا تعالیٰ کی صفات کا کامل مظہر بنیں۔ پس اگر کچھ لوگ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں پڑے جلتے رہیں تو وہ کامل مظہر کب اور کس طرح بنیں گے؟ قرآن کریم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جنت کی نعمتیں نہ کٹنے والی اور نہ ختم ہونے والی ہونگی مگر دوزخ کی سزاؤں کا یہ حال نہ ہوگا۔ بلکہ خدا تعالےٰ کے ارادہ کے ماتحت اور اسکے فضل سے وہ آخر مٹا دی جائینگی۔ کیونکہ قرآن فرماتا ہے کہ خدا کی رحمت اسکے غضب پر غالب ہے پس ایک عرصہ تک جب خدا کے غضب کو بدکار بھگت لینگے جو اسقدر لمبا عرصہ ہوگا کہ اسے انسانی

کمزوری کے لحاظ سے اَبد کہہ سکتے ہیں تب خدا کی رحمت جوش میں آجائیگی۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ویأتِي علىٰ جهنّم زمان ليس فيها احد و نسيم الصّبا تحرّك ابوابها (تفسیر معالم التنزیل سورۂ ہود۔ رکوع ۹) ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ جہنم خالی ہو جائے گی اور اس کے دروازوں کو ہَوا ہلائے گی یعنی کوئی شخص عذاب میں مبتلا نہیں رہے گا۔

اصل میں یہ خیال کہ دوزخی ہمیشہ عذاب میں رہیں گے اس حکمت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہُوا ہو کہ خدا عذاب کیوں دے گا؟ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں اسلام کا دعویٰ ہو کہ انسان اپنی بد اعمالی سے خود عذاب پیدا کرتا ہے ورنہ خدا تعالےٰ رحم کرنیوالا ہو وہ سزا دینا نہیں چاہتا۔ مگر چونکہ انسان اپنی روحانی قوتوں کو خراب کرلیتا ہے وہ ان انعامات کے محسوس کرنے کے قابل نہیں ہوگا جو اگلے جہان میں ملیں گے۔ پس وہ عذاب چکھے گا مگر خدا تعالےٰ کے رحم نے ایک یہ قانون بھی مقرر کیا ہُوا ہے کہ بیماری میں ہی علاج نکل آتا ہو۔ پس جس طرح جسمانی بیماریوں کے علاج ہو جاتے ہیں اُن عذابوں سے جو انسان اگلے جہان میں محسوس کریگا بدکاروں کی اصلاح ہو جائیگی اور وہ نعمائے جنت کو محسوس کرنیکے قابل ہو جائینگے۔ تب انکو جنت میں داخل کردیا جائیگا اور خدا کی رحمت مکمل ہوگی اور انسان کی پیدائش کی غرض پوری ہوگی۔ اور انسان وہیں جا پہنچے گا جہاں کے لئے وہ پیدا کیا گیا تھا۔

کیا جنّت میں عمل ہوگا یا عمل ختم ہو جائیگا؟

ایک اَور اہم سوال ہے جس کا جواب دیئے بغیر مابعد الموت حالت کا بیان نامکمل رہ جاتا ہو اور وہ یہ ہے کہ اس ابدی زندگی میں انسان کیا کرتا ہو؟ کیا اسکے اعمال ختم ہو جاتے ہیں؟ اور وہ اب ایک بوڑھے آدمی کیطرح کھانے پینے میں ہی مصروف رہتا ہو یا کچھ کرتا بھی ہے؟

اسلام اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ عمل ہی انسان کی زندگی ہے۔ عمل سے انسان کو الگ کر دینا گویا اسکی زندگی کو باطل کر دینا ہے۔ اور زندگی بلا عمل درحقیقت موت سے بدتر ہے۔ اگر

بے عمل کی زندگی بھی کوئی اچھی چیز ہوتی تو اس دنیا میں بھی آرام طلب لوگ سب سے بہتر سمجھے جاتے۔ مگر جس شخص نے کام کی لذت دیکھی ہو وہ جانتا ہے کہ اصل لذت اور سرور کام کرنے اور ترقی کرنے میں ہو۔ خالی بیٹھے رہنا ایک مختل الحواس انسان کے لئے گو اچھا ہو مگر صحیح الدماغ آدمی کبھی اس کو اچھا نہیں سمجھ سکتا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (تحریم۔ ع ۲) مومنوں کا نور بعد الموت ان کے آگے آگے چلیگا۔ اور دائیں بھی چلیگا اور کہتے جائیں گے کہ خدایا ہمارے نور کو مکمل کر۔ اور ہماری موجودہ کمزوریوں کو دُور کر۔ تو ہر اک چیز پر قادر ہے یعنی برابر مومن آگے کو ترقی کرتا چلا جائیگا۔ اور نئے نئے مدارج اسکو نظر آئینگے جن کے حصول کے لئے وہ کوشش اور خواہش کریگا۔ اسی طرح قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ (الحجر۔ ع ۴) مومنوں کو وہاں تھکان نہیں ہوگی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کام تو ہوگا مگر اسکے نتیجہ میں تھکان اور ملال پیدا نہیں ہوگا۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ فرماتا ہے يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ج فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ لا وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (الفجر۔ ع ۲) اے نفس! جو میری ذات کے متعلق مطمئن ہوگیا اور جس کے دل میں میری نسبت کوئی شک نہیں رہا۔ اب تو اپنے رب کیطرف لوٹ۔ اس طرح کہ تُو اپنے رب سے خوش ہے اور تیرا رب تجھ سے خوش ہو۔ پس اب تُو میرے غلاموں میں داخل ہو جا۔ اور میرا غلام بنکر اُس مقام میں داخل ہو جا۔ جو میرے سائے کے نیچے آیا ہُوا ہے۔ یعنی خدا تعالےٰ کی صفات کاملہ کا اس مقام پر کامل پرتو پڑتا ہو۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ گو بندہ اس دنیا میں بھی کام کرتا ہو مگر اصل کام کا زمانہ بعد الموت کا ہے مومن کامل غلام اسی وقت بنتا ہو۔ کیونکہ اسی وقت اس کو اللہ تعالےٰ کی صفات کو اپنے اندر جذب کرنے کا پورا موقعہ ملتا ہو۔ پس وہاں کام زیادہ ہوگا نہ کہ بند ہو جائے گا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ يُلْهَمُوْنَ التسبيح و التّحميد (مشکوٰۃ باب صفۃ الجنۃ صفحہ ۴۹۶) جنت میں مومنوں کو نئی نئی تسبیحیں اور تکبیریں الہام کی جائینگی اس سے یہ مراد نہیں ہوسکتی کہ نئے الفاظ میں خدا کی تسبیح اور تکبیر سکھائی جائے گی۔ کیونکہ یہ کام

تو انسان خود بھی کرتا رہتا ہے۔ بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ خدا تعالیٰ کی پاکیزگی اور اس کی بڑائی پر دلالت کرنیوالی نئی صفات اسکو الہام سے بتائی جائینگی تا کہ وہ کوشش کرکے ان صفات کا بھی مظہر بنے۔

شاید کسی کو یہ خیال گزرے کہ نئی صفات کونسی ہونگی؟ کیا اب وہ صفات معلوم نہیں؟ سو اسکا جواب یہ ہے کہ انسان اسی قدر علم حاصل کر سکتا ہے جسقدر کہ اس کے حواس اسکو سکھا سکتے ہیں اس لئے ہمارے موجودہ علم ہمارے حواس تک محدود ہیں۔ پس ان علوم کی نسبت یہی کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ حواس کو مدنظر رکھ کر یہ علوم کامل ہیں۔ مگر جب نئے حواس انسان حاصل کریگا تو نئی صفات کے سمجھنے کی بھی اسکو توفیق ملیگی۔ اور خدا تعالیٰ چونکہ غیر محدود ہے انسان اس حصول علم اور معرفت میں ترقی کرتا رہیگا۔ اور نئی نئی صفات اسپر ظاہر ہونگی اور وہ انکو اپنے نفس میں پیدا کرنیکے لئے کوشش کریگا۔ پس ہر نیا علم ایک نیا دور عمل جاری کرے گا اور اسی طرح ہوتا چلا جائیگا۔ اور روز بروز انسان کا یہ عرفان کہ خدا تعالیٰ غیر محدود ہے زیادہ ہوتا چلا جائے گا۔

خلاصہ یہ کہ جنت بھی دار العمل ہے جس طرح یہ دنیا دار العمل ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر صرف فرق یہ ہے کہ اس دنیا میں تو انسان کو نیچے گر جانیکا اور فیل ہو جانیکا خطرہ رہتا ہے وہاں انسان اس خطرہ سے محفوظ ہو جائیگا۔ گویا یہ دنیا روحانی علوم میں ایک مدرسہ کی نسبت رکھتی ہے جسمیں فیل اور پاس دونوں ہی صورتیں ہیں۔ لیکن وہ جہان ایسا ہے جیسے کوئی شخص سب امتحان پاس کر کے تحقیقاتِ علمی میں لگ جاتا ہے محنت تو یہ شخص بھی کرتا ہے بلکہ بعض دفعہ طالب علم سے زیادہ لیکن اسمیں اور طالب علم میں یہ فرق ہے کہ اُسے فیل ہونیکا دھڑکا تھا لیکن اسے وہ دھڑکا نہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلام کے نزدیک جنت کی اصل خوشی اور اصل نعمت ترقی روحانی ہی ہے نہ کہ وہ سفلی لذات جو اس کی طرف منسوب کیجاتی ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ سب سے بڑی نعمت جنت میں خدا کی رضا ہوگی۔ اور سب سے بڑی خوشی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں رویتِ الٰہی کی ہوگی۔

حاصل کلام یہ کہ ایک مسلمان کی جنت صحیح علم کے حصول اور پھر اس کے مطابق صحیح عمل کرنے اور ان دونو کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کا قرب اور اتصال حاصل کرنیکا نام ہے اور اس سے بڑا اور کوئی مقصد پیش نہیں کیا جا سکتا۔

اب مَیں ان تمام سوالوں کے متعلق احمدیت کی تعلیم بیان کر چکا ہوں جن کے متعلق صحیح تعلیم بیان کرنا مذاہب کا کام ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ جو لوگ غور اور فکر سے میری باتوں کی طرف متوجہ ہونگے وہ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس سے بہتر اور کوئی تعلیم نہیں ہو سکتی اور خصوصاً اس کی یہ خوبی کہ یہ خدا تک عملاً انسان کو پہنچا دیتی ہے سب باتوں اور بحثوں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ انسان دنیا میں کیوں پیدا کیا گیا؟ اسی لئے کہ وہ خدا سے ملے۔ پس وہی مذہب ہمارے کام کا ہے جو خدا سے ہمیں ملاتا ہے۔ نہ کہ وہ جو صرف باتوں سے ہمیں خوش کرنا چاہتا ہے۔

مسیح موعودؑ کی تعلیم کا اثر

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تعلیم کے بیان کر چکنے کے بعد مَیں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ اس تعلیم کا اثر آپؑ کی جماعت پر کیا ہوا ہے؟

یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام خیالاتِ موجودہ کا آئینہ نہ تھے بلکہ زمانہ کی رَو اور اس کے میلان کے بالکل خلاف تعلیم لیکر آئے تھے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس زمانہ میں خیالات کی رَو دو جہات کیطرف مائل ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اور بندہ کے درمیان کوئی گہرا تعلق نہیں ہونا چاہیئے بلکہ انسان کو آزادی ملنی چاہیئے۔ چنانچہ تمام جدید مذاہب اور قدیم مذاہب اپنے آپکو اس رَو کے مطابق بنا رہے ہیں اور عبادات کی حقیقت کو بدل کر یا ان میں کمی کر کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

دوسری رَو اس زمانہ میں یہ چل رہی ہے کہ لوگ فیصلہ کر بیٹھے ہیں کہ تمدنی بنیاد جو پچھلے کئی سو سال میں دنیا میں قائم ہوئی ہے اسمیں کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ نہ اس لئے کہ وہ تمدن اعلیٰ اور اکمل ہے بلکہ اس لئے کہ لوگ اس کے عادی ہو چکے ہیں اور اب وہ اسکو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ نئے اور پرانے سب مذاہب اپنی تعلیمات کو اس تمدن کے مطابق کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ وہ اسکا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ چنانچہ سُود۔ پردہ۔ کثرت ازدواج ایسے تمام امور کے متعلق تمام مذاہب اپنی پوزیشن کو صاف کرنیکی

فکر میں ہیں۔ اور اپنی تعلیم کو رائج الوقت تمدنی خیالات کے مطابق بنا رہے ہیں۔ مگر برخلاف تمام لوگوں کے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی تعلیم کی بنیاد خالص مذہب پر رکھی ہے۔ اور رائج الوقت خیالات پر انکی بنیاد نہیں رکھی پس آپؑ حقیقی معنوں میں **مصلح** تھے نہ کہ زمانہ کے منہ میں نَے کی مانند۔ کہ جو کچھ وہ بجانا چاہتا تھا آپؑ نے اسکو بلند آواز سے کہدیا۔ آپؑ نے زمانہ کی دونوں موجوں کا مقابلہ کیا۔ مذہبی آزادی کا بھی اور تمدنی غلامی کا بھی۔ آپؑ نے نہ تو عبادات میں کمی کی نہ انکو اڑایا۔ بلکہ آپؑ نے اسلام کے قدیم حکم کی طرف دنیا کو توجہ دلائی اور عبادات کی حقیقت کو لوگوں پر ظاہر کیا۔ اور انکے دلوں میں عبادت کا سچا جوش پیدا کر کے خدا تعالےٰ سے ان کے تعلق کو مضبوط کیا۔ نہ صرف فرض نمازوں کیطرف لوگوں کو توجہ دلائی بلکہ نوافل پر کاربند ہونے کی بھی رغبت دلائی۔ کیونکہ عبادت چٹی نہیں بلکہ ترقیاتِ روحانی کا ذریعہ ہیں۔ روزے جو اس زمانہ میں دوسرے مذاہب سے تو بالکل مفقود ہو گئے تھے مسلمانوں میں سے بھی تعلیم یافتہ لوگوں میں ان کا بالکل رواج نہ رہا تھا۔ آپؑ نے انکی ضرورت کو بھی روحانی اور جسمانی دلائل سے ثابت کیا۔ اور ان کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی۔ اسی طرح ذکر حج اور قربانی کی حقیقت کو روشن کر کے ان پر کاربند ہونے کی تعلیم دی۔

تمدنی غلامی سے بھی آپؑ نے لوگوں کو چھڑایا اور اس بھیڑ چال کی غلطی ان پر ظاہر کی جس میں وہ مبتلا رہتے تھے۔ اور اسلامی تمدنی تعلیم کی خوبی کو ظاہر کیا۔ سود کی برائی کو ظاہر کیا۔ پردہ کی خوبیوں کو واضح کیا۔ کثرت ازدواج کی ضرورت کو ثابت کیا۔ طلاق کی اہمیت کو بیان کیا۔ غرض وہ مسائل جن کے متعلق لوگ زمانہ کی رَو کو دیکھ کر بول نہیں سکتے تھے ان کے متعلق علی الاعلان اسلامی تعلیم کو پیش کیا اور زمانہ کے خیالات کی پرواہ نہیں کی۔

مَیں اسجگہ اُن پرانے وساوس اور شبہات کا جو غیر تعلیم یافتہ لوگوں میں رائج تھے اور جن کا آپؑ نے مقابلہ کیا اس جگہ ذکر نہیں کرتا۔ کیونکہ کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ خود ان کی اصلاح کر رہا تھا۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اس تعلیم کا جو آپؑ نے زمانہ کی رَو کے خلاف دی یہ اثر ہوا کہ لاکھوں آدمی جو زمانہ کی رَو میں بہے جاتے تھے انکو ہوش آگئی اور وہ کھڑے ہو گئے۔ اور انہوں نے سوچا اور اسلامی تعلیم کو سب تعلیموں سے افضل پایا۔ وہ لوگ جو پہلے دہریت اور

مادہ پرستی کا شکار تھے جو خدا تعالےٰ کی عبادت تو کیا کرنی تھی اس کے وجود کے ہی منکر ہو رہے تھے انکو آپؑ نے تہجد گزار اور ذاکر بنا دیا۔ انکے دماغ مغربی تعلیم سے روشن ہیں اور ان کے فکر جدید افکار پر محتوی مگر ان کے دل محبتِ الٰہی سے لبریز ہیں اور ان کے ماتھے خدا تعالیٰ کے حضور میں جھکے رہتے ہیں رات اور دن وہ اللہ تعالےٰ کی یاد میں بسر کرتے ہیں اور باوجود اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے وہ دین کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔

تمدن کی غلامی سے بھی آپؑ نے بہت سے لوگوں کو چھڑا کر عقل کے حریت خیز میدان میں لا کھڑا کیا ہے۔ باوجود زمانہ کی مخالفت کے آپؑ کی جماعت تمدنی اصلاح میں مشغول ہے اور اس کی عمارت کو طلب فرحت اور عیاشی کی بنیادوں سے ہٹا کر اصلاح اور عفت اور اخلاق پر کھڑا کر رہی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے مذہبی دیوانگی پیدا نہیں کی اور نہ مذہب کو اپنی ذات کی محبت کے گرد لپیٹ کر لوگوں کی توجہ کو ایک ہی نقطہ پر جمع کر دیا ہے جیساکہ ان لوگوں کا قاعدہ ہے جو باقی نیک خصلتوں کو نظر انداز کر کے صرف قربانی اور ایثار کا مادہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ آپؑ نے ہر اک چیز کو اس کے مرتبہ کے مطابق پیش کیا ہے اور انسانی عقل کو ہر ممکن طریق سے زندہ رکھنے کی بلکہ ترقی دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر باوجود اس کے آپؑ کی جماعت میں یہ مادہ نظر آتا ہے کہ وہ اپنی جان اور اپنا مال خدا تعالےٰ کے راستہ میں قربان کرنے کیلئے تیار رہتے ہیں۔ انکی مثال صحابہؓ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہے جن کی نسبت قرآن کریم فرماتا ہے فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ (احزاب ع۳) ان میں سے بعض نے اپنے ارادہ کو پورا کر دیا اور خدا کی راہ میں جان دیدی ہے۔ اور بعض اسوقت کے منتظر ہیں چنانچہ افغانستان میں دو موقعے احمدیوں کو جان قربان کرنے کے ملے ہیں جنمیں انہوں نے نہایت ثبات سے جانیں دی ہیں۔ دو موقعوں سے میری مراد یہ ہے۔ کہ جن دو موقعوں پر انکو کہا گیا ہے کہ تم توبہ کر لو۔ مگر انہوں نے توبہ نہیں کی ورنہ احمدیت کیوجہ سے مارے تو وہاں کئی آدمی گئے ہیں جنکی تعداد دس سے کم نہ ہوگی۔

اُن آدمیوں میں سے زیادہ اہم شہادت سید عبداللطیف صاحب کی ہے۔ آپؓ

افغانستان کے بہت بڑے عالم تھے اور آپکو ایسا درجہ حاصل تھا کہ امیر حبیب اللہ خان صاحب کی تاجپوشی کی رسم آپؓ ہی نے ادا کی تھی۔ آپؓ کو جب سلسلہ احمدیہ کی خبر ملی تو آپؓ نے کتب سلسلہ منگوا کر پڑھیں اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔ اس کے بعد ملاقات کا شوق پیدا ہوا اور حج کی نیت سے افغانستان سے امیر سے اجازت لی اور راستہ میں قادیان بھی ٹھہرنے کا ارادہ کیا۔ قادیان آکر ان پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ انہوں نے کہا کہ مجھے اب آگے نہیں جانا چاہیئے بلکہ یہاں رہ کر دین کی معلومات بڑھانی چاہئیں۔ چنانچہ وہ یہیں ٹھہر گئے۔ اور کئی مہینے ٹھہر کر واپس وطن گئے۔ اور جاتی دفعہ کہہ گئے کہ میرا ملک مجھے بلاتا ہے تا اپنے خون سے اسکی اصلاح کا راستہ کھولوں۔ اور میں اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی دیکھتا ہوں۔ ملک میں جاتے ہی امیر نے طلب کیا۔ اور ان سے پوچھا کہ کیا وہ احمدی ہو گئے ہیں؟ انہوں نے اقرار کیا۔ اس پر بہت بڑی بحث کے بعد علماء کے فتویٰ کے ماتحت ان کے قتل کا فیصلہ کیا گیا۔ بار بار امیر نے بلا کر انکو توبہ کی تحریک کی مگر انہوں نے انکار کیا۔ اور آخر انکو زمین میں گڑھا کھود کر آدھا دفن کیا گیا۔ اور امیر خود مع لشکر میدان میں آیا اور شہر کے لوگ بھی اکٹھے ہوئے اور سنگسار کرنے کی تجویز ہوئی آخری وقت میں امیر پھر ان کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ صاحبزادہ صاحب! اب بھی موقع ہے آپؓ اپنے عقیدہ سے توبہ کریں مگر انہوں نے جواب دیا کہ توبہ کس بات سے؟ میں نے حق کو پالیا ہے اور میں اسکو نہیں چھوڑ سکتا۔ یاد رکھو کہ میرے مرنے کے بعد پہلی جمعرات کو قیامت آجائیگی اور میں جی اٹھونگا۔ جب امیر مایوس ہو گیا تو اس نے واپس آکر سید الشہداءؓ پر پتھر پھینکا اور چاروں طرف سے لوگوں نے پتھر پھینکنے شروع کئے مگر صاحبزادہ صاحبؓ استقلال سے کھڑے رہے یہانتک کہ پتھروں کی ضربوں سے انکا سر پاش پاش ہو گیا اور گردن جھک گئی۔ ظالم برابر پتھر مارتے ..... چلے گئے حتیٰ کہ سر تک پتھروں کا ایک بڑا ڈھیر جمع ہو گیا۔ اور اس صادق مومن کی پاکیزہ روح اپنے پیدا کرنے والے سے جاملی۔ تب لوگ واپس اپنے گھروں کو چلے گئے مگر انکی لاش پر پہرہ مقرر کر دیا گیا تا کوئی شخص انکو دفن نہ کرے۔ مگر خدا کا بدلہ نزدیک تھا۔ وہ قیامت جس کی انہوں نے خبر دی تھی اچانک آگئی۔ اور پہلی جمعرات کو غیر معمولی طور پر خلاف توقع اور خلاف پچھلے تجربہ کے کابل میں سخت ہیضہ پھوٹا۔ اور سخت موت پڑی جس سے

شاہی خاندان میں سے بھی بعض جانوں کا نقصان ہوا۔ ان واقعات کو ایک بے تعلق انگریز انجینئر مسٹر مارٹن دی انجینئر ان چیف افغانستان نے اپنی کتاب "انڈر دی ابسولیوٹ امیر" میں نہایت سادگی سے بیان کیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہے۔ گو بوجہ سلسلہ سے ناواقفیت کے بعض باتیں انہوں نے غلط لکھدی ہیں مگر پھر بھی انکی تحریر نہایت مؤثر ہے خصوصاً اس صورت میں کہ ایک بے تعلق آدمی کی لکھی ہوئی ہے۔

صاحبزادہ عبد اللطیف صاحبؓ سے پہلے ان کے شاگرد مولوی عبد الرحمٰن صاحبؓ کو گلا گھونٹ کر مار دیا گیا تھا انکا جرم بھی یہی تھا کہ وہ سلسلہ احمدیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دو قتلوں کے علاوہ جو حکومت کی طرف سے ہوئے ہیں لوگوں نے کئی احمدی قتل کئے ہیں چنانچہ پچھلے ماہ میں دو احمدیوں کو لوگوں نے مار دیا ہے۔ علاوہ قتل کے دوسری تکالیف تو ہمیشہ ہی احمدیوں کو پہنچائی جاتی ہیں جنہیں وہ نہایت بہادری سے برداشت کرتے ہیں چنانچہ اسی سال کے دوران میں خوست کے علاقہ میں جو بغاوت ہوئی ہے اسمیں جب باغیوں نے ہز میجسٹی دی امیر کی افواج کے خلاف کچھ زور چلتا ہوا نہ دیکھا تو احمدیوں کے دو گاؤں جلا دیئے۔ اور بہانہ یہ کیا کہ یہ لوگ امیر کو ورغلاتے ہیں۔ سال میں دو تین دفعہ ایسا ضرور ہوتا ہے کہ عوام بعض متعصب مقامی افسروں کو ملا کر جس جس احمدی پر زور چلے اسے گرفتار کر لیتے ہیں۔ اور بعض کو منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کر کے شہر میں پھراتے ہیں۔ بعض کو مارتے ہیں بعض کو قید میں ڈالدیتے ہیں اور جرمانہ وصول کر کے چھوڑتے ہیں مگر باوجود اس کے کہ پچیس سال سے احمدی یہ مصائب برداشت کرتے چلے آرہے ہیں خدا تعالےٰ کے فضل سے انکے ایمان متزلزل نہیں ہیں بلکہ وہ ترقی کر رہے ہیں۔

یہ امر جذبہ شکر کے خلاف ہوگا اگر میں اسجگہ یہ اظہار نہ کروں کہ ہز میجسٹی امیر امان اللہ صاحب جب سے سلطنت افغانستان پر متمکن ہوئے ہیں انہوں نے ان مظالم کو بالکل مٹا دیا ہے جو احمدیوں کے خلاف حکومت کی طرف سے ہوتے تھے۔ اور گو بوجہ اس کے کہ ابھی افغانستان انتظام و درستی کے ابتدائی مراحل سے گزر رہا ہے وہ انکے لئے حقیقی امن قائم کرنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے مگر ہم امید کرتے ہیں کہ گورنمنٹ افغانستان اسی انصاف کی

رُوح کے ساتھ کام کرتی رہی تو کچھ عرصہ تک افغانستان میں احمدیوں کے لئے گورنمنٹ کے علاوہ حکام مقامی اور رعایا سے بھی امن ہو جائیگا۔

یہ تو افغانستان کے لوگوں کی قربانی ہے مگر ہندوستان کے احمدیوں کا حال کم نہیں۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت ہے اس لئے لوگ یوں تو مار نہیں سکتے مگر جھوٹ اور فریب سے ہر جگہ احمدیوں کو تکلیف دیجاتی ہے۔ اور وہ سب تکلیفوں کو خوشی سے برداشت کرتے ہیں قتل بیشک ایک بڑا ابتلاء ہے لیکن صبر آزما مصیبت وہ ہے جو آہستہ آہستہ آتی ہے۔ ہندوستان کے احمدیوں کو اس سے حصہ ملا ہے۔ بلکہ نوّے فیصدی احمدی ان حالات میں سے گزرتے ہیں بہت ہیں جن کے جسم ان نشانوں سے پُر ہیں جو انکو احمدیت کے قبول کرکے ماریں کھاکر لگے ہیں۔ بہت سے لوگ گھروں سے نکالے گئے بعض چھوٹے چھوٹے بچوں کو والدین نے نکال دیا مگر ثابت قدم رہے۔ بعض دفعہ ایک گاؤں میں ایک ہی احمدی ہوتا ہے اور سب لوگ اس کو ملکر مارتے ہیں۔ پھر پولیس کی تفتیش پر کوئی اس کی تائید میں گواہی دینے والا نہیں ہوتا۔ کئی جگہوں پر قبرستانوں میں احمدیوں کو مردے دفن نہیں کرنے دیتے۔ بعض جگہ لاشیں لوگوں نے باہر نکال کر پھینک دیں۔ گرمیوں کے دنوں میں کوؤں سے پانی لینے سے روک دیا۔ اور کئی کئی دن اس شدید گرمی میں کہ پارۂ حرارت ایکسو پندرہ تک سایہ میں ہو جاتا ہے بڑوں اور بچوں کو پیاسا رہنا پڑا۔ کئی جگہ انکی دوکانوں سے سودا نہیں لیا جاتا اور انکے کھیت برباد کر دئے جاتے ہیں۔ ان کے لیکچروں اور وعظوں کے موقعوں پر پتھر مارے جاتے ہیں۔ شور کیا جاتا ہے۔ کئی جگہ ان کی بیویوں کو ان سے جبراً چھین کر انکا دوسری جگہ نکاح کر دیا گیا ہے۔ بچوں کو والد سے جدا کر لیا گیا ہے۔ عورتوں کو ان کے خاوندوں نے مار کر گھر سے نکال دیا ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں چونکہ دوسرے لوگوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے ان میں بھی احمدیوں کو دِق کیا جاتا ہے اور ہمیشہ وہ مصائب میں مبتلا رہتے ہیں۔ وکلاء اور ڈاکٹروں کا بھی جہاں بس چلتا ہے بائیکاٹ کیا جاتا ہے۔ عام پیشہ وروں کا تو حال ہی ناقابل بیان ہے۔ انکو تو سخت تکلیف دیجاتی ہے۔ حتیٰ کہ سینکڑوں ہیں جو غیر احمدی ہونیکی حالت میں اچھے آسودہ حال تھے مگر آج وہ نانِ شبینہ کے محتاج ہیں مگر حضرت مسیح موعودؑ نے کچھ ایسی روح اس جماعت میں پھونکدی ہے کہ وہ دلیری سے ان مصائب کو برداشت کرتی ہے

مگر اپنے ایمان کو نہ چھوڑتی ہے نہ چھپاتی ہے بلکہ علی الاعلان اسکو ظاہر کرتی رہتی ہے۔ اور دین کو دنیا پر مقدم کرنے کا اعلیٰ نمونہ دکھاتی رہتی ہے۔

احمدی افراد اپنے لباس و اطوار میں دوسرے لوگوں سے جدا نہیں ہیں مگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تعلیم نے ان پر کچھ ایسا اثر کیا ہے کہ باوجود لباس وغیرہ میں تغیر نہ ہونیکے عام طور پر لوگ ان کو پہچان لیتے ہیں اور اس کی وجہ ان کے وہ اعلیٰ اخلاق ہیں جن کے ذریعہ سے وہ دوسروں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کی زبانوں کا گالیوں اور فحش باتوں سے پاک ہونا ان کا دوسروں کی خاطر تکلیف اٹھانا اور ایثار سے کام لینا انکا دھوکے اور فریب سے بچنا یہ ان کو ہر مجلس میں ممتاز کرکے دکھا دیتا ہے۔ اور وہ آدمی بھی جو احمدی کیرکٹر سے واقف ہو لیکن ایک احمدی کا ذاتی واقف نہو اسے ریل یا جلسہ یا دوسری اجتماع کی جگہوں میں پہچان لیتا ہے۔

جاہل سے جاہل احمدی بھی کہیں نظر آئے تو اس کی عقل تیز اور اس کی بحث کی قابلیت غیر معمولی نظر آئیگی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تعلیم نے اس جماعت کے بنانے میں یہ عظیم الشان معجزہ دکھایا ہے کہ ایکطرف تو احمدی آپکی تعلیم کے ماتحت اس انتہائی بے دینی اور بے پرواہی کو چھوڑکر جو دنیا میں نظر آتی تھی خدا تعالےٰ اور اس کے رسولوں اور اس کے کلام کی محبت میں سرشار نظر آتا ہے۔ وہ اپنے وجود کو اب صرف ایک آئینہ سمجھتا ہے جو خدا تعالےٰ کی صفات کے انعکاس کے لئے بنایا گیا تھا۔ اسکا دن اور اس کی رات خدا تعالیٰ کی یاد اور اس کی عبادت میں صرف ہوتے ہیں۔ وہ اس دنیوی مقابلہ کے زمانہ میں اپنے کاموں کا ہرج کرکے روحانی فیوض کے حصول میں مشغول نظر آتا ہے۔ مگر دوسری طرف اسی تعلیم کے اثر سے وہ دنیا کے سخت ترین معقولی لوگوں میں سے ہے۔ وہ کسی بات کو بلا دلیل ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہر اک بات کو دلیل سے مانتا ہے اور دلیل سے منوانا چاہتا ہے۔ وہ علوم جدیدہ کا دشمن نہیں بلکہ ان کا مؤید ہے۔ اور انکو دین کا مخالف نہیں بلکہ دین کا خادم سمجھتا ہے۔ غرض وہ ہر بات میں اپنی حریت کو قایم رکھتا ہے۔ وہ نہ اپنے باپ دادوں کی سُنی سُنائی بات کو مانتا ہے اور نہ ہر مدعیِ علم کے دعوے کو تسلیم کرلیتا ہے اور ہر جدید بات پر فدا ہو جاتا ہے بلکہ ہر بات کو علم اور عقل سے موازنہ کرکے دیکھتا ہے۔ اور ہر اک حقیقت کو اسی مقام پر رکھتا ہے جو اسے خدا تعالےٰ نے بخشا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک عجیب اثر اپنی جماعت میں یہ پیدا کر دیا ہے کہ آپ کی جماعت کے لوگ علم حاصل کرنے میں دوسرے لوگوں سے غیر معمولی طور پر بڑھ گئے ہیں۔ ہندوستان کی دوسری آبادی کی نسبت اس جماعت کے لوگ تعلیمی نسبت میں بہت زیادہ ہیں حالانکہ بوجہ غربت مدارس کا کوئی الگ انتظام نہیں ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے بڑھاپے میں تعلیم حاصل کی ہے۔ عورتوں میں تعلیم کا اسقدر چرچا ہے کہ قادیان کے بہت سے گھر مدرسے معلوم ہوتے ہیں۔ ستر ستر برس کی عورتیں قرآن کریم کو ترجمہ کے ساتھ پڑھ رہی ہیں۔ ہر عمر کے لوگوں کا ایک جمگھٹا مردوں میں سے بھی اور عورتوں میں سے بھی قادیان میں لگا رہتا ہے جو مختلف صوبوں سے اور ملکوں سے قادیان میں تعلیم دین حاصل کرنے [illegible]۔ غرض دنیا میں اگر کہیں مغرب و مشرق جمع نظر آتے ہیں تو وہ قادیان ہی ہے۔ کیونکہ دوسری جگہوں [illegible] اگر مغربی تعلیم ہے تو دین جو مشرق سے پیدا ہوا ہے ندارد ہے۔ اور اگر دین ہے تو علوم جدیدہ سے بے پرواہی ہے جنکا سرچشمہ آجکل مغرب ہے لیکن احمدی جماعت اور خصوصاً قادیان میں جو مرکز سلسلہ ہے یہ دونوں چیزیں اکٹھی نظر آتی ہیں۔ یہاں باوجود مسٹر کپلنگ کے مخالف دعویٰ کے مغرب و مشرق اکٹھے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف تو علوم جدیدہ کی تحصیل اور ان میں ترقی کرنیکا جوش ہے اور دوسری طرف مذہب کے اخلاص اور اس کی تعلیمات پر یقین اس درجہ پر پہنچا ہوا ہے کہ اس کے لئے جان اور مال اور وطن کی قربانی ایک حقیر شے نظر آتی ہے۔ اور مذہب کے چھوٹے سے چھوٹے حکم کو اس کی اصل شکل اور صورت میں احتیاط سے پورا کیا جاتا ہے۔

احمدیوں میں عورتوں کے حقوق کی ادائیگی اور انکو جائز قیود سے آزاد کرنیکا بھی خاص خیال پایا جاتا ہے۔ مگر باوجود اس کے وہ مذہب کے خلاف کوئی بات نہیں کرتے۔ ان میں مذہبی رواداری تمام اقوام سے زیادہ ہے۔ وہ ان جھگڑوں کو جو بعض مذہبی رسوم کی ادائیگی کے متعلق مختلف اقوام ہند میں ہوتے رہتے ہیں بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں اور لوگوں کو سمجھاتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی مساجد میں سخت ترین دشمنان اسلام کو بولنے کا موقع دیدیتے ہیں۔ اور ان کی باتیں سنتے اور اپنی سناتے ہیں۔

ایک عظیم الشان تبدیلی جو احمدی جماعت میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پیدا کر دی

ہے۔ وہ دین کو دنیا پر مقدم رکھنے کا احساس ہے۔ ہر اک احمدی اپنے مال کو خدا تعالیٰ کی امانت خیال کرتا ہے۔ جو لوگ سلسلہ کی تربیت کے نیچے آچکے ہیں وہ ماہوار سولھواں حصہ دینی کاموں کے لئے بطور چندہ دیتے ہیں۔ اس چندہ کے علاوہ خاص چندوں میں بھی ان کو حصہ لینا پڑتا ہے۔ جن کو اگر جمع کر دیا جائے تو ہر اک احمدی جو سلسلہ تربیت کے نیچے آچکا ہے اپنے اپنے اخلاص کے مطابق اپنی آمد کے تیسرے حصہ سے دسویں حصہ تک چندہ میں دیتا ہے۔ اور یہ ان کی قربانی لوگوں کی نظروں میں ایسی عجیب ہے کہ بعض لوگ تو یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ جماعت بڑی امیر ہے۔ اور بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس جماعت کو گورنمنٹ مدد دیتی ہے۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ گورنمنٹ نہ مدد دیتی ہے نہ دیسکتی ہے۔ اور ہماری جماعت نہایت ہی غریب ہے۔ اور شاید اس سے غریب اور کوئی جماعت ہندوستان میں نہیں۔ مگر ہم میں سے ہر اک اپنی ضرورتوں کو قربان کر کے دنیا کی دینی۔ اخلاقی اور علمی ضرورتوں کی اصلاح کے لئے اسقدر چندہ دیتا ہے کہ دوسری اقوام میں اس سے دس گنی آمدنی والے لوگ بھی اسقدر روپیہ بنی نوع انسان کی ہمدردی کے لئے خرچ نہیں کرتے۔ اور اس قربانی میں ان کی عورتیں مردوں سے کم نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے ایثار سے ثابت کر دیا ہے کہ دنیا کے پردے پر ایسی عورتیں بھی ہیں۔ جو زیور اور کپڑے کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے جیتی ہیں۔ چنانچہ پچھلے سال میں نے جرمن میں مسجد بنانے کی تحریک کی۔ اور صرف عورتوں سے چندہ طلب کیا۔ اور میں نے دیکھا کہ بیسیوں عورتوں نے اپنے زیور اور اپنے اعلیٰ کپڑے تک فروخت کر کے اس کام کیلئے دیدئے۔ اور جسقدر رقم ان سے طلب کی گئی تھی۔ اس سے دُگنے سے بھی زیادہ چندہ جمع کر دیا۔

غرض سلسلۂ احمدیہ کا اثر افراد سلسلہ پر ایسا گہرا اور ایسا نمایاں ہے کہ اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ چنانچہ سلسلہ کے اشد ترین دشمن بھی اس کا اقرار کرتے ہیں۔ مگر وہ اس تغیر کو اس پردہ کے نیچے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ دکھانے کے لئے اور منافقت سے ہے۔ مگر کیسی مبارک یہ منافقت ہے جس نے بیماروں کو

چنگا کر دیا ہے۔ اور مردے زندہ کر دیئے ہیں۔ کاش! یہ منافقت دنیا کے ہر گوشہ میں نظر آتی۔

سلسلہ احمدیہ کا جو اثر اس کے افراد پر ہے اس کو اجمالی طور پر بیان کرنے کے بعد میں اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ اور تمام بھائیوں اور بہنوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں کہ :۔

اے بھائیو اور بہنو! خدا نے ہمیں اس لئے پیدا کیا ہے تا ہم اس کے جلال کے مظہر ہوں۔ اور تا اس کی صفات کو اپنے اندر جذب کریں۔ جبتک ہم اس مقصد کو پورا نہ کریں ہم ہرگز کامیاب نہیں کہلا سکتے۔ ہماری دنیاوی ترقیات کیا ہیں؟ ایک مشغلہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں۔ یہ تمام ترقیات ہمارے کس کام کی اگر ہم خدا کو اپنے پر ناراض کر لیتے ہیں؟ اور ابدی ترقیات کے راستے اپنے اوپر بند کر لیتے ہیں۔ اگر ہم دنیا کے سب سے بڑے مُوجد بھی ہیں لیکن اُس علم کی طرف توجہ نہیں کرتے جس کے ذریعہ سے ہم ابدی زندگی میں نور حاصل کر سکیں۔ تو ہماری مثال اس طالب علم کی ہے جو سارا دن کھیلتا رہتا ہے اور اس پر خوش ہو جاتا ہے کہ اس نے مقابلہ میں اپنے حریف کو پچھاڑ لیا۔ لیکن وہ اس مقابلہ کی فکر نہیں کرتا جو اس کی ساری زندگی کو سدھارنے والا ہے۔ زندگی وہی ہے جو نہ ختم ہونے والی ہو۔ اور راحت وہی ہے جو نہ مٹنے والی ہو۔ اور علم وہی ہے جو ہمیشہ بڑھتا رہے۔ پس ابدی زندگی اور دائمی راحت اور حقیقی علم کی طرف توجہ کرو تا دو نوجہان کا آرام پاؤ۔ اور اسی طرح خدا تعالےٰ کو خوش کرو جس طرح کہ دنیا کے لوگوں کو خوش کرنا چاہتے ہو۔

اے بھائیو اور بہنو! خدا تعالےٰ نے تمہاری پریشان حالت کو دیکھ کر آپ تمہارے لئے رحمت کا دروازہ کھولا ہے اور خود تم کو بلانے کے لئے آیا ہے۔ پس اُس کے اِس احسان اور اس کی محبت کی قدر کرو۔ اور اس کی نعمتوں کو ردّ نہ کرو۔ اور اس کے احسانوں کو حقیر سمجھ کر اُن سے منہ نہ پھیرو کہ وہ خالق ہے، اور مالک ہے۔ اور اس کے آگے کسی تکبّر کرنے والے کا تکبّر نہیں چلتا۔ بڑھو اور اس کے فضل کے دروازے میں داخل

ہو جاؤ۔ تا اس کی رحمت تم کو اپنی آغوش میں لے لے۔ اور اس کے فضل کی چادر تم کو اپنے اندر لپیٹ لے۔

اے انگلستان کے رہنے والو! خدا نے تم کو دُنیا میں عزّت دی ہے مگر اس عزّت کے ساتھ تمہاری ذمہ واری بھی بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ ہر اک جو زیادہ احسان کے نیچے ہوتا ہے زیادہ ذمہ وار ہوتا ہے۔ خدا نے تم کو سینکڑوں سالوں سے سمندروں کی حکمرانی عطا کی ہوئی ہے۔ تمہارا ملک سمندروں کی ملکہ کہلاتا ہے۔ مگر کیا تم نے کبھی اس بادشاہ کی طرف بھی توجہ کی جو سب عزّتوں کا سرچشمہ ہے۔ اور جس کی عنایت کی ایک نگاہ نے تم کو اس مرتبہ تک پہنچایا ہے۔ کیا تم نے کبھی معرفت کے سمندر کی بھی جستجو کی؟ جو ہر اُس شخص کے دل میں لہریں مارتا ہے جو اس کی تلاش کرے۔ آہ! تم شمال کی طرف گئے اور جنوب کی طرف گئے۔ اور تم نے زمین پر ایک ایک چُلّو پانی کو چھان مارا۔ اور سب گہرائیوں کو دریافت کیا۔ مگر افسوس! کہ ابھی تک معرفت کے سمندر کی تہ معلوم کرنے کے لئے تم نے کبھی غوطہ نہیں مارا۔ نہ اسکی دریافت کے لئے وفد بھیجے۔

تم نے جزیروں کی تلاش میں اور خشکیوں کی جستجو میں زمین کا چپّہ چپّہ دیکھ مارا اور تمہارے بیڑوں نے ہر اک طرف کا رُخ کیا مگر تم کبھی اس یار کی جستجو میں نہ نکلے جو ان سب زمینوں کا پیدا کرنے والا اور سب جزیروں کا بنانیوالا ہے۔ کیا یہ بھی دانش ہے کہ درخت سے گرے ہُوئے بور کو تو جمع کیا جائے لیکن پھل کو چھوڑ دیا جائے؟

اے بھائیو! مَیں تم کو بشارت دیتا ہوں کہ خدا کی رحمت آج اسی طرح جوش میں آئی ہوئی ہے جس طرح آج سے سینکڑوں سال پہلے وہ جوش میں آئی تھی جس طرح وہ محمد صلعم کے وقت میں جوش میں آئی تھی۔ مسیح ناصری علیہ السّلام کیوقت میں جوش میں آئی تھی۔ داؤدؑ کے وقت میں جوش میں آئی تھی۔ موسیٰؑ کیوقت میں جوش میں آئی تھی۔ اسحٰقؑ کے وقت میں جوش میں آئی تھی۔ ابراہیمؑ کے وقت میں جوش

میں آئی تھی۔ نوح ؑ کے وقت میں جوش میں آئی تھی۔ اور اس کی معرفت کا سورج اسی طرح آج بھی چڑھا ہے جس طرح کہ پہلے نبیوں کے زمانہ میں چڑھا کرتا تھا۔

پس باہر نکلو اور کمروں کی بند ہوا کی بجائے عالمِ روحانی کی وسیع فضاء میں خدا کی رحمت کی ٹھنڈی اور معطر ہوا سونگھو۔ اور اس کی معرفت کے سُورج کی خوشگوار روشنی اور چمک سے اپنی آنکھوں کو منور کرو۔ کہ یہ دن روز روز نہیں چڑھا کرتے۔

مَیں تمہیں ہی نہیں بلکہ سب ان قوموں کو جو انگریزی حکومت کے جھنڈے کے نیچے آرام کی زندگی بسر کرتی ہیں کہتا ہوں۔ کہ دیکھو خدا نے اپنی برکت کا ہاتھ تمہارے سروں پر رکھا ہے۔ تم ادب کے گھٹنے اس کے سامنے جھکا دو۔

مَیں ویلز کے لوگوں سے کہتا ہوں۔ کہ اے ویلز! تو اپنی محنت اور جانفشانی پہ نگاہ کر اور دیکھ۔ کہ تیری محنت میں سے کسقدر حصّہ خدا کے لئے ہے؟ اور

اے سکاٹ لینڈ! تُو اپنی آزاد زندگی پر فخر کرتا ہے۔ کیا تو نے خدا کی باتوں کے سمجھنے اور قبول کرنے میں بھی ویسی ہی آزادی دکھائی ہے جیسی کہ دوسرے امور میں؟ اور اے آئرلینڈ کے لوگو! تمہاری حُبّ الوطنی اور جوش ضرب المثل ہیں مگر کیا تم نے اس محبّت کا حصّہ کچھ خدا کے لئے بھی نکالا؟ کیا اس کے پانیکے لئے بھی تم نے ویسا ہی جوش دکھایا جیسا کہ اپنے ملک کی حکومت کے لئے؟

اے نوآبادیوں کے لوگو! کہ تم نوآبادیوں کے بسانے میں ایک خاص ملکہ رکھتے ہو اور نئی زمینوں کو شوق سے بساتے ہو۔ مگر آبتک تم اُس عرفان کے جزیرے کو جو علم کے سمندر سے نکلا ہے بسانے سے کیوں غافل ہو؟

مَیں پھر کہتا ہوں۔ دیکھو! خدا نے برکت کا ہاتھ تمہارے سروں پر رکھا ہے۔ اپنے ادب کے گھٹنے اس کے سامنے جھکا دو۔ کہ وہ بادشاہوں کا بادشاہ۔ اور شہنشاہوں کا شہنشاہ ہے۔ اپنے سروں کو اس کے سامنے کرو۔ تا وہ اسی طرح ان کو دین کی برکتوں سے ممسوح کرے جس طرح کہ اُس نے انہیں دنیا کی برکتوں سے ممسوح کیا۔

خدا تعالےٰ کی نعمتیں محدود نہیں ہوتیں۔ وہ ہر اک ملک اور ہر ایک قوم کا خدا ہے۔ اور اس کا سچا پرستار بھی تنگیوں اور حد بندیوں کے چکر میں بندھنا پسند نہیں کرتا۔ وہ بے شک اپنی قوم اور اپنے ملک کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کی نظر قوم اور ملک سے بالا جاتی ہے۔ وہ ان حد بندیوں سے بہت اوپر رہتا ہے۔ وہ تمام بنی نوع انسان کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ اور سب انسانوں میں ایک برادرانہ تعلق کا نشان پاتا ہے جو رب العالمین خدا کی مخلوق ہونے کے سبب سے ان میں پایا جاتا ہے۔ اس کے لئے کالے اور گورے، مغربی اور مشرقی، اپنے اور غیر اس کی نظر میں بحیثیت انسان ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ ہر اک کی خیر خواہی اس کے دل میں راسخ اور ہر اک کی محبت اس کے قلب میں موجزن ہوتی ہے۔ وہ درحقیقت رب العالمین خدا کا سچا مظہر ہوتا ہے۔

پس میں اپنے خطاب کو کسی خاص قوم تک محدود نہیں رکھتا نہ کسی خاص ملک تک بلکہ میں سب دنیا کے لوگوں کو اس خدا کے پیغام کی طرف بلاتا ہوں جس نے اپنی تقسیم میں کسی قوم سے بخل نہیں کیا۔ جس نے اپنی رحمت کے دروازے ہر اک ملک کے لوگوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رکھے ہیں۔ اور کہتا ہوں کہ اے امریکہ اور یورپ کے لوگو! اے آسٹریلیا اور افریقہ کے لوگو! اے ایشیاء کے باشندو!!! خواب غفلت کو ترک کرو اور آنکھیں کھولو۔ خدا کی محبت کا سورج **قادیان** کی گمنام سرزمین سے چڑھا ہے تا ہر اک کو اس ازلی بادشاہ کے پیار کی یاد دلائے جو اسے اپنے بندوں سے ہے۔ تا شکوک و شبہات کی تاریکیاں مٹ جاویں۔ تا غفلت اور بے پرواہی کی سردیاں دور ہو جائیں۔ تا فسق اور فجور اور ظلم اور خونریزی اور فساد اور ہر قسم کی بدیوں کے راہزن جو انسان کے متاعِ ایمان اور دولتِ امن کو ہر وقت لوٹنے کی فکر میں رہتے تھے بھاگ جائیں۔ اور تاریک غاروں میں جا چھپیں جو ان کی اصلی جگہ ہے تا پاک دل۔ اور پاک نفس بندے جو دنیا میں بمنزلہ فرشتوں کے ہیں اس کی روشنی کی مدد سے اس سانپ کا سر کچلیں جس نے حوّا اور آدمؑ کی ایڑی کو ڈسا تھا۔ اور شیطان کی زہریلی

کچلیوں کو توڑیں۔ اور اس کے شر سے دنیا کو ہمیشہ کے لئے بچالیں۔

ہاں ہاں اے مشرق و مغرب کی سرزمینوں کے بسنے والو! سب خوش ہو جاؤ اور افسردگی کو دلوں سے نکال دو۔ کہ آخر وہ دولہا جس کی تم کو انتظار تھی آگیا۔ آج تمہارے لیے غم اور فکر جائز نہیں۔ آج تمہارے لئے حسرت و اندوہ کا موقع نہیں بلکہ خرمی و شادمانی کا زمانہ ہے۔ مایوسی کا وقت نہیں بلکہ امیدوں اور آرزوؤں کی گھڑیاں ہیں۔ پس تقدیس کے سنگھار سے اپنے آپکو زینت دو۔ اور پاکیزگی کے زیوروں سے اپنے آپ کو سجاؤ۔ کہ تمہاری دیرینہ آرزوئیں بر آئیں اور تمہاری صدیوں کی خواہشیں پوری ہوئیں۔ تمہارا رب خود چل کر تمہارے گھروں میں آگیا اور تمہارا مالک آپ تمہاری رضامندی کا طالب ہوا۔

آؤ آؤ! کہ ہم سب اپنے بچوں والے تنازعات کو بھول کر اس کے فرستادہ کے ہاتھ پر جمع ہو جاویں۔ اور اس کی حمد کے ترانے گائیں اور اس کی ثنا کے قصیدے پڑھیں۔

اور اس کے دامن کو ایسی مضبوطی سے پکڑلیں کہ پھر وہ یار یگانہ
کبھی ہم سے جدا نہ ہو

آمین

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ